آئینہ نما
مرتب
قرۃ العین

آئینہ نما

(۳)

مرتب

قرۃ العین

نام کتاب : آئینہ نُما (۳)

ناشر : قرۃ العین

پتہ : باغات برزلہ، نزدیک بون اینڈ جوئینٹ

ہسپتال برزلہ سرینگر کشمیرفون :2433795

سرورق : T.F.C سینٹر

کمپیوٹر کمپوزنگ : T . F . C سینٹر مدینہ چوک

گاؤ کدل سرینگر 2473818

سال اشاعت : 2003ء

قیمت : عام ایڈیشن =/250 روپے

لائبریری ایڈیشن =/350 روپے

ترتیب

اداریے

کھلے خطوط

اپنی بات

''آئینہ نما'' کا تیسرا شمارہ پیش کرتے ہوئے مجھے انتہائی مسرت ہو رہی ہے۔ تیسرے شمارے کا منظر عام پر آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ مجھے شمیم احمد شمیم کے پرستاروں اور مداحوں کی نیک خواہشات کے ساتھ ساتھ ان کا بھرپور تعاون بھی حاصل رہا۔ میرے لئے یہ بات بڑی حوصلہ افزا ہے کہ دوسرے شمارے کے شائع ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد اگلی اشاعت کے بارے میں استفسار کیا جانے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ اگلے انتخاب کے بارے میں فرمائشوں اور مشوروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلی اشاعت کے بعد اکثر قارئین نے قلمی خاکوں کو چھاپنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور اب کی دفعہ اکثر لوگوں نے چراغ بیگ کے کھلے خطوط کے متعلق اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ کھلے خطوط منتخب کرتے وقت میں نے ہفتہ وار آئینہ کے ان تاریخی اور بصیرت افروز اداریوں کو بھی شامل کیا جو آج بھی کشمیر کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی پس منظر میں اہم سیاسی اور تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ آج سے ۳۵ برس قبل لکھے گئے یہ اداریے آج بھی کشمیر اور ملک کی صورت حال کے عین مطابق ہیں، کشمیر کی سیاسی غیر یقینی صورتحال ہو یا دفعہ ۳۷۰ کی برقراری یا تنسیخ کا معاملہ ہو، سیکولرازم

کی علمبرداری اور فرقہ پرستوں کی ریشہ دوانیاں ہوں، فرقہ وارانہ فسادات اور مرکز کی ذمہ داریاں ہوں، اخلاقیات کا زوال ہو یا سماجی بدعتوں کا دور دورہ ہو یا فرقہ وارانہ فسادات اور مرکز کی ذمہ داریاں، غرض ہر مسئلے پر بھرپور، مدلل، جامع اور متاثر کن و معقول ہونے کی بناء پر ان کی تاریخی اہمیت آج بھی مسلم ہے۔

ریاست کی مخصوص صورت حال، ہندوپاک تعلقات، آمدورفت، دونوں ممالک کے درمیان انتہاپسندوں کی طرف سے تعلقات کی بحالی کی مخالفت، سرحدوں پر کشیدگی جیسے مسائل آج بھی برقرار ہیں۔ اور ان مسائل کے حل میں پیچیدگیوں اور الجھنوں کا وہی عالم ہے جو آج سے تیس برس قبل تھا۔ مسئلہ کشمیر کے حل کے توسط سے ریاست کی تقسیم ایک بار پھر موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔ آج سے ۳۵ برس قبل ڈاکٹر کرن سنگھ نے ریاست کی تقسیم کی حمایت میں ایک مضمون لکھ کر ایک کنٹروسی (Controversy) کو جنم دے کر گیا سی اتھل پتھل پیدا کی۔ اس موضوع پر مرحوم کی تحریریں آج بھی غور طلب ہیں اور کشمیر کی سیاست اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے زبردست اہمیت کی حامل بھی۔ گاؤکشی پہلے بھی سیاستدانوں کے لئے انتخابی جنگ کا ہتھیار تھی اور آج بھی ضرورت پڑنے پر سیاسی جماعتیں گائے کے احترام اور تقدس کو لے کر ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی دوڑ میں مصروف ہیں۔

چراغ بیگ کے کھلے خط ریاست کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور روزمرہ زندگی پر طنز سے بھرپور ہیں۔ تیسرے صفحے کی طرح جہاں

سیاستدان اور اعلیٰ سرکاری افسر کھلے خطوط سے بھی زبردست خائف رہتے تھے کہ جانے کس کا پوسٹ مارٹم ہو اور قلعی کھل جائے، وہیں عوام الناس کو ان کا شدت اور بے صبری سے انتظار رہتا تھا کہ ان میں ان کے جذبات اور احساسات کی بھرپور ترجمانی ہوا کرتی تھی۔

ہفتہ وار آئینہ دس سال تک جاری رہا۔ ہر کالم اپنی جگہ منفرد اور اہم تھا۔ آئینہ نما کا پہلا شمارہ کالم ''تیسرا صفحہ'' پر مبنی تھا لیکن میرا اندازہ ہے کہ ابھی تیسرے صفحے پر شائع مضامین کا احاطہ کرنے کے لیے کئی شماروں کی گنجائش موجود ہے اور اس کے علاوہ ادبی مضامین اور پارلیمنٹ اور اسمبلی میں ان کی تقریروں اور کاروائیوں کی تفصیل بھی ہے۔ انشاء اللہ انہیں بھی کتابی شکل دی جائے گی۔

دوسرے شمارے میں شامل قلمی خاکوں (آئینہ کا دوسرا شمارہ قلمی خاکوں پر مشتمل ہے) کے ضمن میں خلیق انجم رقمطراز ہیں: ''پچھلے تیس بتیس سال میں اُردو میں خاکہ نگاری کے فن، اس کے آغاز و ارتقاء پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن کسی ادیب یا نقاد نے خاکہ نگار کی حیثیت سے شمیم احمد شمیم کا ذکر نہیں کیا جسکی وجہ یہ ہے کہ شمیم صاحب کے لکھے تمام خاکے ہفت روزہ آئینہ میں دبے پڑے تھے''۔ مجھے اس حقیقت کا احساس جگدیش چندر ودھان کا منٹونامہ پڑھ کر ہوا۔ منٹونامہ سعادت حسن منٹو کی شخصیت پر ایک مکمل کتاب ہے۔ اس میں 'مرقعہ نگاری'' کے عنوان کے تحت مرقع نگاری کی تاریخ کے ساتھ انگریزی اور اردو ادب کے مشہور مرقع نگاروں کا ذکر ہے جس میں شمیم احمد شمیم کا کہیں ذکر نہیں۔ مرقع نگاری کے

لئے کن لوازم کا ہونا ضروری ہے، اس بارے میں مصنف کے مضمون سے ایک اقتباس پیش خدمت ہے: ''اچھے مرقع نگار کے لئے لوازم از بس ضروری ہیں۔ اول یہ کہ وہ اعلیٰ پایہ کا انشا پرواز ہو، اسے زبان و بیان پر قدرت حاصل ہو اور اپنے مافی الضمیر کو صفحۂ قرطاس پر اتارنے کی ادبی صلاحیت بدرجہ اتم رکھتا ہو۔ وہ نگاہ دور رس اور دور بین کا حامل ہو۔ حُسن شناس ہو۔ بصارت ہی نہیں بصیرت بھی رکھتا ہو۔ اوروں کے قلب و ذہن میں غوطہ زن ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو اور واقعات، سانحات، تجربات اور مشاہدات سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی ذہنی استعداد کا مالک ہو۔ علاوہ ازیں وہ اپنے کرداروں کی شخصیت کے پیچ و خم، معمولات حیات اور طوائف و عواقب سے گہری واقفیت رکھتا ہو اور انہیں اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح پہچانتا ہو۔ منٹو کے مرقعوں کی ایک اور بہت نمایاں خوبی ان کی بے خوف اور بے باکانہ تحریر ہے۔ وہ شخصیتوں کے نہیں حقیقتوں اور سچائیوں کے پرستار ہیں۔ تصنع اور ریاکاری کو ان کے یہاں دخل نہیں۔ جو چیز ان کے ذہن میں ابھرتی ہے وہ لامحالہ ان کی نوکِ قلم پر آجاتی ہے۔'' غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مندرجہ بالا تمام لوازمات مرحوم کی مرقع نگاری میں بدرجہ اتم موجود ہیں اور آئینہ نما (۲) اس کا ثبوت ہے۔ بہر حال دیر سے ہی صحیح ان کی تحریروں کو کتابی شکل دے کر مجھے کم از کم یہ اطمینان ہے کہ جب آئندہ مرقع نگاری کی تاریخ مرتب ہوگی تو مرحوم شمیم احمد شمیم کو نظرانداز کرنا آسان نہ ہوگا۔

مجھے اس کتاب کی ترتیب و تشکیل میں حسب معمول مختلف

حلقوں سے مدد ملی۔ میں جناب پروفیسر زماں آزردہ (کشمیر یونیورسٹی) جناب بشیر احمد ڈار (بورڈ آف سکول ایجوکیشن) اور ڈاکٹر وحید (صورہ میڈیکل انسٹچوٹ) کی مشکور ہوں کہ میں نے جب بھی ان سے وقت مانگا انہوں نے مصروفیات سے وقت نکال کر میری مدد بھی کی اور حوصلہ افزائی بھی۔ گزشتہ اشاعتوں میں کافی احتیاط کے باوجود کتابت کی کچھ خامیاں رہ گئی تھیں جنکی نشاندہی اشاعت کے فوراً بعد ہوئی۔ ظفر اقبال (صحافی) اس بات پر بہت برہم تھے کہ کتابت کی پُروف ریڈنگ میں کوتاہی برتی گئی ہے۔ اب کی دفعہ میں نے ان سے ہی مدد مانگی اور مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے فوراً حامی بھرلی اور اول سے آخر تک میری مدد کی۔ میں اس کرم فرمائی کے لئے ان کی مشکور ہوں۔

میں تیسرے شمارے کے متعلق اہل رائے کی منتظر ہوں۔

فقط

قرۃ العین

۸؍ستمبر ۱۹۶۴ء

ہوشیار

موئے مبارک کی ایجی ٹیشن کے دنوں میں جب عوام کے ضبط و نظم کا پیمانہ چھلک گیا تھا تو مولانا محمد سعید مسعودی نے جوش میں آئی ہوئی قوم کو عقل کا چراغ جلائے رکھنے کے لئے ایک جادو اثر لفظ کا تحفہ دیدیا تھا۔ ہوشیار! جب بھی کسی جگہ حالات میں ذرا تلخی کا شائبہ پیدا ہو جاتا، ''ہوشیار'' کی آواز گونج اُٹھتی۔ موئے مبارک کے دوران کسی قسم کے فرقہ وارانہ یا اسی نوعیت کی کسی دوسری ناچاقی کے بپانہ ہونے میں اس چھوٹے سے لفظ کا بھی اپنا حصہ ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہی لوگ جو اس نعرے کی بجلی چمکا کر دوسروں کو راستہ دکھاتے تھے، اب پانچ چھ مہینے گذر جانے کے بعد یہ لفظ خود ہی بھول گئے ہیں.... شہر کے مختلف حصوں میں گتھم گھتا ہونے والوں کی خدمت میں سیاسی جماعتوں کے قائدین کی خدمت میں، حکومت کے اکابرین کی خدمت میں، اور صحافت کے عمائدین کی خدمت میں ہم آج اسی لفظ کی گونج پیدا کرنا چاہتے ہیں...ہوشیار! ہوشیار! ہوشیار!

ہماری تحریک آزادی کے بچپن میں جب ذہنوں پر غلامی کے جھولے اور آنکھوں پر جہالت کے پردے لٹک رہے تھے، تو شہر میں شیر، بکرا لڑائی کی باتیں سننے میں آتی تھیں۔ میری نسل کے لوگ جن کا شعور آزادی ہند کے

ساتھ ساتھ جوان ہوا، جب اس معرکہ آرائی کے قصے سنتے تھے تو ہمیں یقین نہیں آتا تھا کہ ایسی مہمل بات ممکن ہوسکتی ہے۔ ہمیں اُن لوگوں کی جہالت پر رحم آتا تھا، جو تیسری دہائی میں شیر اور بکرے کے نام پر لڑا کرتے تھے۔ ہمیں پورا یقین تھا کہ اب اس قسم کی واہیات لڑائیوں کا زمانہ گذر گیا ہے۔ لیکن ۶۴ء میں یہی ناشُدنی حقیقت بن کر سامنے آرہی ہے اور میں حیران ہوں کہ گزشتہ تیس برس کے عرصے میں چل پھر کے کیا ہم ۳۴ء کے دورِ جہالت میں پھر واپس پہونچ گئے ہیں؟

موجودہ واقعات کتنے ہی رنج دہ کیوں نہ ہوں، ان کا تجزیہ کر کے ہی ہم اُس ناخوشگوار صورتِ حال کا خاتمہ کر سکتے ہیں، جس نے شہر کے ہزاروں گھروں میں کہرام مچا رکھا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ابھی سیاسی نارواداری کے جراثیم ہمارے ذہنوں سے ختم نہیں ہوسکے ہیں۔ دورِ جاہلیت کا کٹرپن اور عدم تحمل اب بھی ہماری سیاسیات کا عنوان ہے۔ فسطائی رُجحانات اب بھی ہمارے لیڈروں اور سیاسی جماعتوں کے رگ وپئے میں سرائیت کئے ہوئے ہیں۔ جب تک ظلم اور تشدد کی عملداری رہی، ہم انصاف قانون اور جمہوریت کی دہائیاں دیتے رہے۔ لیکن جوں ہی شہری آزادی کی فضا بحال ہوئی، ہم نے قومِ کی قوتوں کا رُخ تعمیری سمتوں کی طرف پھیرنے کی بجائے شخصی اور جماعتی مفادات کے لئے تشدد کو گلے لگایا۔ انصاف اور جمہوریت سے منہ موڑا۔ برداشت اور ضبط سے رشتہ توڑا اور ہر ایک کی کوشش رہی کہ صرف اُسی کے لئے شہری آزادیاں وقف ہوں۔ لیکن فریقِ مخالف اس سے محروم ہو جائے۔ ہم اپنے حقوق کو گلے لگاتے ہوئے اتنے حریص بن گئے کہ اپنے مخالفین کے حقِ اختلاف کو نظر انداز کر دیا۔

کشمیر نے ہندوستان اور پاکستان کو مفاہمت کے رشتے میں لانے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کا فرمان ہے کہ کشمیری اپنے بے مثل روادارنہ کردار کے بل بوتے پر اس رول کے واحد حقدار ہیں۔ لیکن موجودہ صورتِ حال ہماری اس قابل رشک حیثیت کو جس طرح گہن لگا رہی ہے وہ ایک رنج دہ المیہ ہے۔

حکومت دونوں اطراف سے شدید حملوں کا شکار بنی ہوئی ہے۔ اس میں کچھ حصہ سیاسی جماعتوں کی نعرہ بازی کا ہو سکتا ہے۔ لیکن حکومت کی اس سنگین صورتحال میں جو ذمہ داریاں ہیں، اگر وہ اُن سے عہدہ براء ہونے میں ناکام رہی تو یہ اس کے دامنِ عدل پر بڑا بدنما داغ ہوگا۔ نا اہلی اور کمزوری کو شرافت اور انصاف پسندی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ موجودہ صورتِ حال ہر طرح سے قابلِ مذمت ہے۔ مگر اس نازک موقع پر کشمیریوں نے ایک اور بار فرقہ وارانہ رواداری کا جو عظیم مظاہرہ کیا ہے۔ وہ ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ مسلمان نے مسلمان کو مارا۔ لیکن جب غیر مسلم بیچ میں آیا تو چلتے ہاتھ رُک گئے۔ اس روایت کی حفاظت کی ضرورت ہے۔ ہوشیار! ہوشیار! ہوشیار!

❀❀❀

۷/اکتوبر۱۹۶۴ء

یہ اضطراب کیوں؟

راجدھانی کے کچھ فرقہ پرست اور زرخرید اخبارات پچھلے کئی ماہ سے چیخ رہے ہیں کہ کشمیر میں ہندوستان کے حامیوں پر ظلم وستم ڈھائے جارہے ہیں۔ پُر امن شہریوں کو ستایا جارہا ہے اور پاکستان نواز جماعتوں اور سیاسی لیڈروں کو کھلی ڈھیل دی گئی ہے۔ ان میں سے اکثر اخبارات کے مدیرانِ محترم اس صورتحال کا بہ نفسِ نفیس مطالعہ کرنے کے لئے سرینگر بھی تشریف لائے۔ ان کی نیت صاف ہوتی تو وہ اپنے قارئین کو صحیح صورتحال سے آگاہ کرتے۔ لیکن وہ سرینگر کے لئے روانہ ہونے سے قبل ہی اپنے دورے کے نتائج مرتب کر چکے تھے۔ اس لئے ان کے اخبارات میں وہی باتیں دہرائی گئیں جو پچھلے کئی ماہ سے ان کے پہلے صفحات کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ سرینگر پہنچ کر ان مدیران محترم کو ایک مایوسی ضرور ہوئی کہ اب کی بار ان کی خاطر تواضع اور عیاشی کے لئے حکومت نے وہ سہولیات بہم نہیں پہنچائیں جو بخشی غلام محمد کے دورِ حکومت میں انہیں میسر ہوا کرتی تھیں۔ جن سنگھی اخبارات کا تو اپنا ایک مشن ہے، وہ کشمیر میں ہر اُس سرکار کی مخالفت کریں گے جس کا سربراہ کوئی مسلمان ہو۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ ہر مسلمان کو غدار اور دغاباز ثابت کیا جائے۔ ان کا بس چلتا تو یہ کشمیر کو پاکستان کے حوالے کر کے پھر ہندوستانی مسلمانوں سے اپنا حساب چُکاتے۔ یہی وجہ
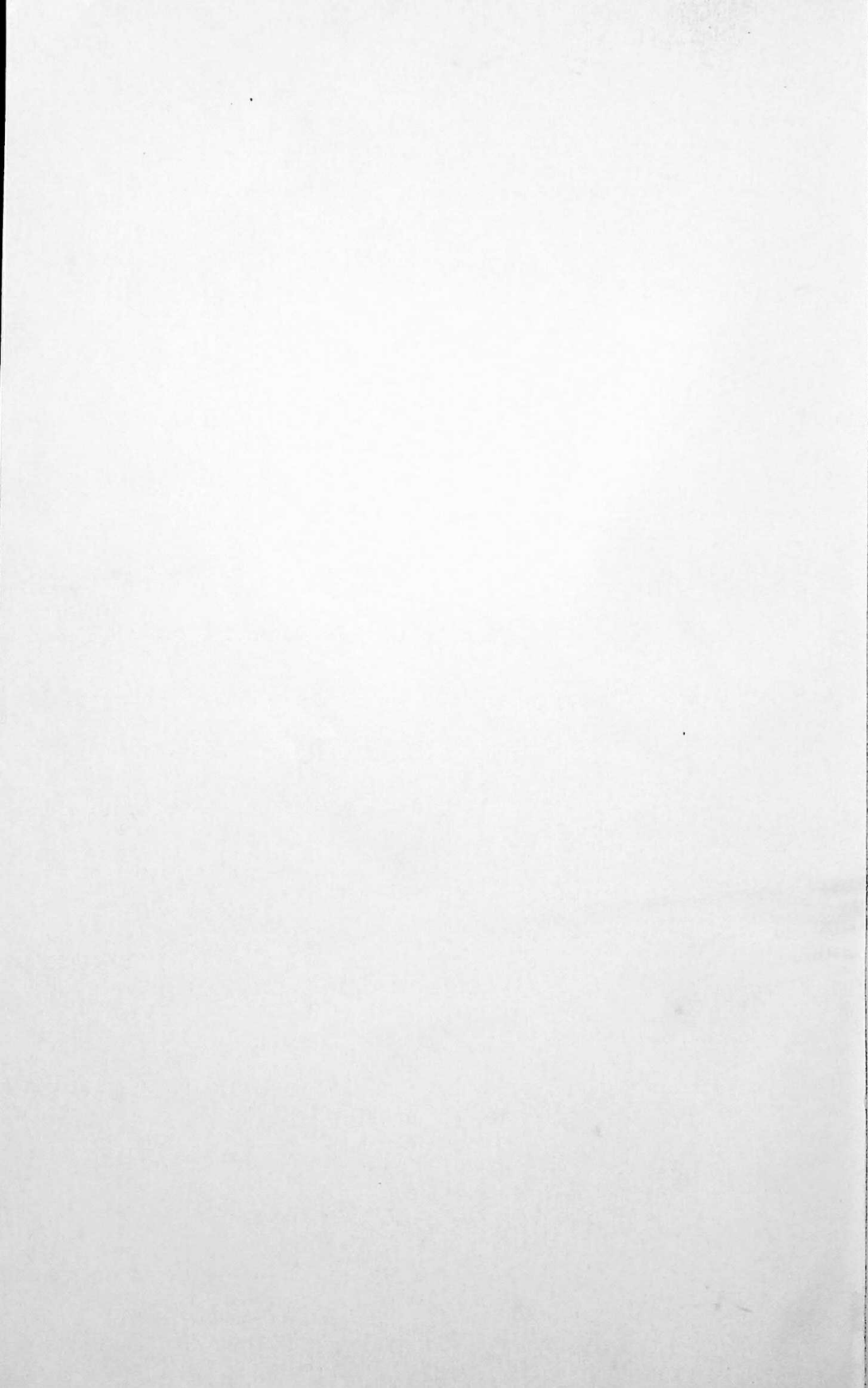
ہے کہ جن سنگھی اخبارات پچھلے سترہ برس سے یہی واویلا کرتے آئے ہیں کہ کشمیر کی صورتحال تب تک بہتر نہیں ہوسکتی جب تک وہاں کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل نہ کیا جائے اور اس اعتبار سے جن سنگھ پورے ملک میں واحد پاکستان نواز جماعت ہے۔ جن سنگھیوں کی اس آواز میں پچھلے کئی ماہ سے بعض ترقی پسند اور آزاد خیال اخبار بھی اپنی آواز ملا رہے ہیں۔ ان میں سے اکثریت اُن ''مظلوموں'' کی ہے جو روٹ پرمٹ اور وظیفوں کو ہند کشمیر الحاق کے استحکام کی ضمانت سمجھتے تھے۔ ان کے پرمٹ اور وظیفے منسوخ ہونے کی وجہ سے انہیں کشمیر میں صرف اندھیرا ہی اندھیرا سجھائی دیتا ہے۔ ان کے لئے اگر آج بھی زرِ خالص کی چاندنی کا اہتمام کیا جائے تو کشمیر ایک بار پھر جنت بے نظیر ہو جائے لیکن ابھی چونکہ صادق سرکار نے الحاق کی ضمانت کے لئے ان کی اعانت حاصل کرنے کا فیصلہ نہیں کیا ہے، اس لئے انہیں کشمیر میں ہندوستان کا جھنڈا سرنگوں نظر آتا ہے اور ہر ہندوستان نواز شہری ٹپتا ہوا نظر آتا ہے۔

پورے سترہ سال بعد کشمیر میں شہری آزادیاں بحال کر کے یہاں کے عوام کو باعزت شہریوں کے حقوق دئے گئے ہیں۔ انہیں آزادئ تحریر و تقریر کے بنیادی حق کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔ ان کے ذہنوں اور زبانوں کے تالے کھول کر انہیں یہ احساس دلانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ وہ ہندوستان کے قیدی نہیں بلکہ باعزت شہری ہیں۔ ہندوستان کے فرقہ پرستوں اور زرخریدوں کو نئی سرکار کی یہ ادا بڑی ناگوار گزری ہے۔ اس لئے ایک ہنگامہ بپا ہے کہ کشمیر میں یہ سب کچھ کیا ہورہا ہے۔ کشمیر میں وہی کچھ ہورہا ہے جو دلی، مدراس، بنگال، اڑیسہ، آسام اور مدھیہ پردیش میں ہورہا ہے بلکہ اس سے کم ہورہا ہے۔ سرینگر اپنی تمام تر ہنگامہ آرائیوں کے باوجود ہندوستان کا سب

سے پُرامن شہر ہے۔ کلکتہ میں بس کے کرایہ میں اضافہ کے خلاف احتجاج ہوتا ہے تو درجنوں آدمی مارے جاتے ہیں۔ اڑیسہ میں ریڈیو سیٹ خریدنے پر تکرار ہوتی ہے تو بسیں جلائی جاتی ہیں اور گولیاں چلتی ہیں۔ دلی میں وزیر اعظم کی کوٹھی سے چند گز کے فاصلے پر سالسٹر جنرل کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ کشمیر میں یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ مختلف سیاسی جماعتوں میں تصادم کہاں نہیں ہوتا۔ جلسے جلوس اور اس نوع کے ہنگامے ہندوستان کے کس شہر میں نہیں ہوتے۔ لیکن مدیرانِ کرام کی نظر عنایت صرف کشمیر ہی پر کیوں ہے؟ کشمیر میں جب کوئی غنڈہ عوام کے ہاتھوں پٹتا ہے تو وہ ہندوستان کا سمبل کیوں قرار دیا جاتا ہے؟ جب کوئی بدقماش سیاست دان اپنے گناہوں کی پاداش میں گرفتار ہوتا ہے تو الحاق کی جڑیں کیوں ہلنے لگتی ہیں، اگر یہ پرمٹ وار اور وظیفہ خوار اخبار والے واقعی کشمیر کو ہندوستان کا ایک جُز سمجھتے ہیں۔ تو یہ بے چینی اور اضطراب کیوں؟ سترہ سال کے دور استبداد کے خوفناک نتائج سے بھی ان کی آنکھیں نہیں کھُلیں گی کیا؟ زبانوں پر تالے ڈالنا اور سیاسی مخالفوں کو جیلوں میں بند کر کے قبرستان کی سی خاموشی مسلط کرنا بہت آسان ہے۔ لیکن پچھلے سترہ سال کا تجربہ گواہ ہے کہ اس سے مسائل سلجھتے نہیں بلکہ اور زیادہ اُلجھتے ہیں۔

۳۰/ اکتوبر ۶۴ء

نیا مشن

پنڈت پریم ناتھ بزاز ہماری ریاست کے بہت پُرانے سیاسی رہنما ہیں۔ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۳۱ء سے پہلے ہوا ہے۔ ۱۹۳۸ء میں مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کے سلسلے میں انہوں نے اہم رول ادا کیا۔ بعد میں نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں سے اختلافات کی بناء پر وہ اس جماعت سے الگ ہو گئے۔ نیشنل کانفرنس سے علیٰحدگی کے بعد اگرچہ عملی سیاست میں وہ کوئی موثر رول ادا نہیں کر سکے، لیکن بحیثیت صحافی کے انہوں نے صحافت کے بنجر میدان میں نئے نئے گُل بُوٹے کھلائے۔ ۱۹۴۷ء میں قبائلی حملے کے فوراً بعد ریاست کی عوامی حکومت نے انہیں گرفتار کر کے تین سال جیل میں رکھا۔ ان پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ وہ ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ جیل سے رہائی کے بعد شری بزاز نے دہلی کو اپنا مسکن بنایا، اور وہیں سے اپنے نظریات کی تبلیغ شروع کر دی، وہ پورے پندرہ برس بڑی شدت کے ساتھ اس عقیدے پر قائم رہے کہ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت کے پیشِ نظر اسے پاکستان کے ساتھ مِل جانا چاہئے اور اس کے لئے انہیں قید بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ بزاز صاحب سترہ سال کی جلاوطنی کے بعد ان دنوں کشمیر تشریف لائے ہیں۔ یہاں آنے

سے قبل وہ مسئلہ کشمیر کے متعلق.... مضامین کے کئی سلسلے شایع کر چکے ہیں ان مضامین کی روشنی میں ان کے نئے مشن کا تجزیہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

بزاز صاحب نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ گذشتہ سترہ برس کے واقعات نے انہیں اپنے عقائد اور نظریات پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ صرف مسلم اکثریت کی بنیاد پر کشمیر کا پاکستان کے ساتھ شامل ہو جانا ضروری نہیں بلکہ بعض مخصوص حالات کی بنا پر کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ شامل رہنا، کشمیر اور کشمیریوں کے حق میں زیادہ مناسب رہے گا۔ لیکن بزاز صاحب نے اس کے لئے ایک کڑی شرط لگائی ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ ہندوستان کے ساتھ وابستگی کا فیصلہ یہاں کے لوگوں کی مرضی اور منشاء سے ہونا چاہئے۔

بزاز صاحب پر آپ اور جو چاہے الزام لگائیں، لیکن ان پر فرقہ پرستی کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی ساری زندگی فرقہ پرستی اور تنگ نظری کے خلاف جہاد کرتے ہوئے گزری ہے اور اس کے لئے انہیں بھاری قیمت دینا پڑی ہے۔ ان کی بات کو ایک فرقہ پرست ہندو کی خود غرضی سے تعبیر کر کے ٹالا نہیں جا سکتا۔ کشمیر میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے مختلف مکاتیب فکر کے نمایندوں سے تبادلۂ خیال کیا۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ جب تک ریاست میں جمہوری اقدار اور اداروں کو مضبوط نہ بنایا جائے، الحاق کے متعلق کوئی بھی فیصلہ یہاں کے عوام کے لئے فائدہ مند نہیں ہو سکتا۔ بزاز صاحب نے کہا کہ جو لوگ دل سے اس بات کے خواہش مند ہیں کہ کشمیر ہندوستان کا ایک حصہ بنا چاہئے، انہیں یہاں کے لوگوں بالخصوص مسلمانوں کو اس فیصلے کی معقولیت کا قائل کرنا چاہئیے۔ اسی طرح پاکستان سے الحاق چاہنے والے

سیاسی لیڈروں اور جماعتوں کو مذہبی تعصب اور تنگ نظری کا شکار ہو کر لوگوں کی غلط رہنمائی نہیں کرنی چاہیئے۔ کشمیری پنڈتوں کو انہوں نے مشورہ دیا ہے کہ انہیں اپنے ذاتی مفاد کی بھول بھلیوں سے نکل کر کشمیری مسلمانوں کے کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کرنا چاہیئے۔

بزاز صاحب کی آواز اس اعتبار سے ایک نئی آواز ہے کہ وہ کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے حق میں ہوتے ہوئے بھی اپنی اس خواہش کو رائے عامہ کا تابع بناتے ہیں۔ وہ لوگ جو ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کو حتمی اور ناقابلِ تنسیخ سمجھتے ہیں، ان کا اس آواز پر چیں بہ جبیں ہونا سمجھ میں آسکتا ہے۔ لیکن کچھ ایسے حلقوں سے بھی بزاز صاحب کے مشن کو ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا گیا ہے، جو رات دن حق خودارادیت اور رائے شماری کی گردان کرتے رہتے ہیں۔ بزاز صاحب نے چونکہ کسی قسم کی مصلحت پسندی کا سہارا لئے بغیر الحاق کے متعلق اپنی پسند (ہندوستان) کا اظہار کیا ہے، اس لئے وہ لوگ جو اپنے فیصلے کو سات پردوں میں چھپا کر رائے عامہ کا نعرہ بلند کرنے کے قائل ہیں، بزاز صاحب کی اس صاف گوئی سے نالاں نظر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے بزاز صاحب کا مشن بہت کٹھن اور دشوار ہے۔ پچھلے سترہ برسوں میں یہاں کے حکمرانوں نے ہندوستان کی صورت اتنی مسخ کر دی ہے اور ہندوستانی جمہوریت کو اتنا بدنام کر دیا ہے کہ عام لوگوں پر ہندوستان سے وابستگی کی معقولیت واضح کر دینا تقریباً ناممکن ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس تعلق کو قائم رکھنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ ہے یہاں کی رائے عامہ کو مطمئن کرنا۔

ریاست کے ترقی پسند حلقے بزاز صاحب کے اس نئے مشن میں ان کی

کامیابی کے خواہاں ہیں اور جو لوگ دیانتداری سے اس بات کے قائل ہیں کہ ہندوستان کے ساتھ رہ کر ہی کشمیر ترقی وفلاح کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے، انہیں فوجی قوت اور حکومت پر اعتماد کئے بغیر یہاں کے عوام کا اعتماد حاصل کرنا چاہئے۔

۲۱ر نومبر ۱۹۶۴ء

نامناسب نظر بندی!

وزیر اعظم صادق صاحب کے اس غیر مبہم اعلان کے بعد کہ بخشی غلام محمد کے خلاف الزامات کی تحقیقات اگلے ماہ مکمل ہو جائیگی، یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ مرکزی لیڈروں نے آخر صادق صاحب کے نقطۂ نظر کی صحت کو تسلیم کرلیا ہے اور بخشی صاحب کے خلاف کمیشن مقرر کرنے کے بارے میں جو تامل برتا جارہا تھا اس کو ترک کردیا گیا ہے۔ اب یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ بخشی صاحب بہت جلد کمیشن کے آگے کھڑا کردئے جائیں گے اور انہیں اپنے اچھے بُرے اعمال کا حساب پیش کرنا پڑے گا۔

اس کمیشن کی تقرری واقعی صادق وزارت کا ایک نہایت ہی اہم کارنامہ ہوگا۔ خاص کر ان حالات میں جب کہ مرکزی لیڈرشپ کا ایک حصہ آخر تک بخشی صاحب کی کرتوت کو بے نقاب کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ ریاست کی سیاسی زندگی میں یہ کمیشن اپنی نوعیت کا پہلا اور بڑا ہی تاریخی واقعہ ہے۔ اس سے ریاست کی سیاسی زندگی کو دیانتداری کی لائنوں پر پھر واپس لے آنے کے لئے فضا سازگار ہوگی اور اربابِ اقتدار کے سامنے ایک ایسی روایت ہوگی، جو انہیں پھونک پھونک کر قدم اٹھانے اور خزانۂ عامرہ کو مقدس جاننے کے لئے

ترغیب دیتی رہے گی۔ صادق صاحب مدت سے ریاست کی سیاسی زندگی کو پاکیزہ بنانے کے لئے جو اعلانات کرتے آئے ہیں، اس کمیشن کا تقرر اُن کے ایفا کا پہلا بڑا اقدام ہوگا۔

لیکن حکومت کو غلط قسم کے اندیشوں کا شکار ہو کے اپنی اس کامرانی کا تاثر زائل نہیں کر دینا چاہئے۔ بخشی صاحب کی نظر بندی کو دو مہینے گذر چکے ہیں۔ انہیں جن حالات میں گرفتار کرلیا گیا تھا، وہ حالات ختم ہو چکے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان کی نظر بندی کی جوازیت بھی۔ ہمارے خیال میں ان کی نظر بندی سے انہیں نقصان کی بجائے فائدہ پہنچایا جارہا ہے۔ صادق صاحب نے خود ایک مرتبہ کہا تھا کہ ہمارے سماج میں کسی شخص کے خلاف اگر سختی سے جائز کاروائی بھی کی جائے، تو وہ عوام کی ہمدردیاں حاصل کر لیتا ہے۔ بخشی صاحب کی نظر بندی اُن کو عوام ترسی کا سایہ عطا کر رہی ہے۔ حکومت کے اپنے اعلان کے مطابق بخشی صاحب کوئی سیاسی قیدی نہیں ہیں اور نہ انہوں نے کسی اعتقاد کی خاطر علم اٹھایا ہے۔ وہ بدعنوانیوں اور کنبہ پروری کے الزامات میں ماخوذ ہیں لہٰذا ان کی نظر بندی سے انہیں خواہ مخواہ کی سیاسی حیثیت دیدینا غیر دانش مندانہ اقدام ہے۔ باہر آ کر اُن کی سیاسی ریشہ دوانیوں کا اب بہت کم امکان رہ گیا ہے۔ جہاں تک تحقیقات پر اثر انداز ہونے کا تعلق ہے، یہ اعتراض بھی زیادہ وزنی نہیں ہے۔ اول تو تحقیقات کا اہم ترین حصہ تکمیل پذیر ہو چکا ہے۔ دوسرے بخشی صاحب کو ان رعایات سے محروم کرنا غلط ہوگا جو پرتاپ سنگھ کیرون کو دی گئیں۔ جب کہ بخشی صاحب کے خلاف داس کمیشن ٹائپ کی ہی ایجنسی مقرر کی جارہی ہے۔ کیرون داس کمیشن کی تحقیقات کے سارے عرصے میں وزارت کی گدی پر براجماں تھے۔ بخشی صاحب کے ساتھ

جتنے بھی اختلافات کئے جائیں، لیکن انہیں ایک عام شہری کی سی سہولیات حاصل ہونی چاہیں، اور انہیں کسی قسم کے امتیاز کی شکایت نہیں ملنی چاہئے۔ بخشی صاحب کی نظر بندی کی حق بجانب مدت گذر چکی ہے۔ اب شاید حکومت ان کو غیر ضروری طور نظر بند رکھ کر اپنی اس غلطی کا کفارہ ادا کرنا چاہتی ہے جو اس سے بخشی غلام محمد کے خلاف کاروائی کرنے میں دیر کرنے کی صورت میں سرزد ہوئی۔ لیکن ایک غلطی کو دوسری غلطی سے ٹھیک نہیں کیا جا سکتا۔ بخشی صاحب کو غیر ضروری طور پر نظر بند رکھ کر ایک تو حکومت انہیں ان کے شہری حقوق سے محروم کر کے انہیں خواہ مخواہ کی شہادت کا جامہ پہنا رہی ہے، دوسرے خاموش زبان سے ان کی خفیہ طاقت سے خائف ہونے کا اعتراف کر رہی ہے حالانکہ بخشی صاحب کسی معیر العقل طاقت کے مالک نہیں ہیں اور رہا ہونے کے بعد اُن کا سب سے بڑا مسلہ اپنا دفاع ہوگا کشمیر میں صورت حال جس طرح سے نارمل ہوگئی ہے وہ صادق صاحب کی شہری آزادی کی پالیسی کو ایک بہت بڑا خراج تحسین ہے اور ان لوگوں کے منہ پر طمانچہ جو گذشتہ گیارہ سال یہاں سختی اور جبر کی پالیسیوں کے علمبردار رہے لیکن بخشی صاحب کی نظر بندی اس انتہائی نارمل صورت میں ایک ''غیر معمولیت'' کا عنصر داخل کر رہی ہے بخشی صاحب نے اپنے دور حکومت میں سیاسی مخالفین کو قید کر کے اور انہیں جائز آزادی دینے پر پابندی لگا کر سیاسی کوتاہ بینی کا ثبوت دیا۔ اُن کی پالیسیوں کا عبرت ناک حشر اُن کے لئے کافی بڑی سزا ہے۔ صادق صاحب نے آزادی، جمہوریت کی جو نئی فضا تعمیر کی ہے بخشی صاحب جیسے جمہوریت دشمن کو بھی اُسکا فائدہ ملنا چاہئے۔ یہ صادق صاحب کی پالیسیوں کے کھرے ہونے کی ایک بڑی دلیل ہے۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ بخشی صاحب کو جتنی

جلدی ہو سکے رہا کر دے۔ تا کہ اس مسلئے کو بعض حلقے جس طریقے سے اُچھال رہے ہیں ان کا منہ بند ہو جائے۔

۲۱ر دسمبر ۱۹۶۴ء

تفریح کا مسئلہ

ہمارے یہاں سیاسی، معاشی اور انتظامی مسائل کو حل کرنے کی طرف کوئی سنجیدہ کوشش تو بہت ہی شاذ و نادر ہوتی ہے لیکن ان مسائل پر شور و غوغا اور ہنگامہ آرائی بے شک بہت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن انسانی زندگی کیا صرف انہی تین چیزوں کے گرد گھومتی ہے؟ انسان ایک مجلسی حیوان ہے اور اس کی نفسیات ایک بے حد پیچیدہ میزان ہے۔ لہٰذا کسی معاشرے کی پوری صحت اور توازن کے لئے صرف سیاست، معاش اور انتظام کی تکون کا چکر کاٹنا ہی لازمی نہیں، بلکہ اس کی نفسیات کی گرہوں کی عقدہ کشائی اور اسکے لاشعور کی تاروں کا الجھاؤ نکالنا بھی ایک بڑا اہم تقاضہ ہے۔

سرینگر کی مجلسی زندگی بڑی عجیب ہے۔ شہر کے سماجی fabric میں رجعت اور جدت، قدامت اور نئے پن، توہم پرستی اور عقلیت کے دھاگے ایک بڑی ہی بے ترتیب صورت میں بکھرے پڑے ہیں۔ ابھی ترازو کا پلڑا قدامت کی طرف ہی جھکا ہوا ہے اور زندگی کے آگے بڑھتے ہوئے دھارے پر ابھی زوال پذیر رجعت کی طاقتوں کی زبردست گرفت ہے۔ لیکن نیا پن اور عقلیت بڑے غیر محسوس انداز میں قرونِ وسطیٰ کی اس ذہنیت کی دیواروں میں

شگاف ڈال رہے ہیں۔ کشمیر کو تب تک سیاسی اور معاشی طور پر موجودہ دنیا کے ارتعاشات سے پوری طور ہم آہنگ نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ ہم سماج کے بطن میں ہونے والی اس زبردست کش مکش میں عقل اور جدت کی قوتوں کو کمک پہنچانے کی کوشش نہ کریں، پُرانی قدروں کی شکست وریخت اور نئی قدروں کی تعمیر کی رفتار کو تیز نہ کریں۔ لیکن اس کے لئے راست طریقے اُتنے موثر ثابت نہیں ہوسکتے، جتنے بالواسطہ طریقے۔ قوم کی نفسیات پر بڑی آہستگی سے نئے زمانے کے عکس ثبت کرنے کی کوشش ..... اس پسِ منظر میں دیکھئے تو ہمارے شہر پر قدامت اور رجعت کا بلاشرکت غیرے قبضہ ایک ہول پیدا کرتا ہے۔ نئی روشنی کے سرچشمے اندھیرے کی اس شدت میں اپنی ہستی ہی گم کرتے نظر آتے ہیں۔ کچھ کالج، کچھ سکول اور بس.... اور ان کالجوں، سکولوں میں بھی تو ہم پرستوں کا زور مکڑی کے جالوں کی طرح ہر سمت بکھرا ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس رفتار سے ہم کب modernization کی منزل کو پاسکتے ہیں۔

سینما، ٹیلی ویژن، کلب، سپورٹس، بیلے اور موجودہ تہذیب کے دوسرے ایسے ہی سفیروں کے مناسب استعمال پر دورائیں ہوسکتی ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کرنیں قوم کے لاشعور کے اندھیروں میں گھس کر وہاں تو ہم پرستوں کے ایوان مسمار کر کے نئی تہذیب کی بنیادیں اُستوار کرتی ہیں اور افسوسناک بات یہ ہے کہ ہمارا شہر اب ان چیزوں کی قلت کے لحاظ سے قبائیلی سماج کی طرف واپس دوڑ رہا ہے۔ شہر میں آج سے ایک سال قبل تین سینما تھے۔ اب صرف ایک ہے۔ جہاں دنیا بھر کی گھٹیا اور اناپ شناپ فلمیں دکھا کر شہریوں پر بجلی گرائی جارہی ہے۔ کسی نئے سینما کی تعمیر کے خلاف ہر طرف قدامت مورچے باندھ

کرصف بند ہورہی ہے۔(بخشی برادرس کارپوریشن کے شیراز سینما کی وکالت مقصود نہیں جو غصب شدہ زمین پر مالِ حرام کی کمائی سے تعمیر کیا گیا ہے) ٹیلی ویژن کا سوال ہی نہیں، ہمارا ریڈیو تک اچھی تفریح کے بدلے نری پروپیگنڈے بازی کو ہی کافی سمجھتا ہے، جس کو سُنتے سُنتے اب شہریوں کو اُبکائیاں آنے لگی ہیں۔شہر میں سپورٹس کا کوئی انتظام نہیں۔ بیلے یا تھیٹر کی تو بات ہی نہیں۔ اکادمی نے چند ہزار روپے ہوا میں بکھیر کر اور فائلوں میں رسیدیں پیوست کر کے اپنے فرائض سے چھٹکارا حاصل کرلیا۔غرض ہمارے شہر پر سرما کی ان راتوں میں چھ بجے صرف رات کا اندھیرا ہی مُسلط نہیں ہوتا بلکہ جہالت،قدامت اور بے خبری کی ظلمت بھی طاری ہو جاتی ہے۔

تفریح کا یہ مسئلہ ترقی کا ایک لازمہ ہی نہیں بلکہ ایک سماجی ضرورت بھی ہے۔جس طرح افراد گھروں کی یک رنگی سے گھبرا کر کوئی تفریح چاہتے ہیں اور تفریح پاکر اپنے ذہنی تناؤ میں کمی محسوس کرتے ہیں اور اگر تفریح نہ ملی تو ہنگامہ آرائی سے یہی مقصد حاصل کرتے ہیں، گھر میں لڑائی بھڑائی کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح قومیں بھی حیات کے معمول سے تنگ آکر تفریح چاہتی ہیں۔اپنے ذہنی تناؤ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہیں۔اور جب یہ نہ ملے تو ہاتھ پاؤں مارتی ہیں، ہنگامہ آرائی کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہےاوران تمام چیزوں پر ہماری حکومت،سیاسی تنظیموں،ثقافتی اداروں اور تمدنی کارکنوں کوغور کرنا ہے۔ زندگی کے دوسرے اہم مسائل میں یہ مسلۂ ہمارادامن پکڑ کر ہم سے عمل کا طالب ہےاور کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ ان چھوٹے مسائل کے حل کرنے سے بڑے بڑے الجھاؤں کی گرہیں بھی کھل جاتی ہیں۔

۱۱؍فروری ۱۹۶۵ء

غیر دانشمندانہ تعجیل

پچھلے سال آئینی لحاظ سے کشمیر اور ہند کو ایک دوسرے کے قریب تر لانے کے لئے جتنے اقدامات کئے گئے، شاید پہلے اتنے ہی وقت میں کبھی نہیں کئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ریاست کی حکمران جماعت کانگریس میں مدغم ہو گئی۔ یہ سب کچھ ریاست کو قومی زندگی کے دھارے میں شامل کرنے کے لئے کیا گیا اور ڈاکٹر کرن سنگھ کے الفاظ میں اس کا مقصد مرکز کے ہاتھ مضبوط کرنے کے بدلے ریاستی عوام کو فائدہ پہنچانا تھا۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض ناعاقبت اندیش حلقوں کو ان اقدامات کو عمل میں آزمانے اور انہیں ریاستی عوام کے ذہن کے لئے مانوس بنانے کی اتنی زیادہ فکر نہیں ہے۔ بلکہ وہ رسمی اور کاغذی کاروائیوں پر زیادہ زور دے رہے ہیں۔ چاہے عملی حیثیت سے ان کے نتائج تباہ کن ہی کیوں نہ ہوں اور باقی ملک سے ریاستی عوام کا جذباتی رشتہ جُڑنے کی بجائے ٹوٹ ہی کیوں نہ جائے۔ یہ رُجحان نہایت خطرناک ہے اور ادغام کے خوشنما نعرے لگانے والے یہ ناعاقبت اندیش لوگ اس موقعہ پر ملک کے مفاد کو جس قدر نقصان پہونچا سکتے ہیں اتنا بدترین دشمن بھی نہیں پہنچا سکتے۔ آخر کشمیر کے الگ

جھنڈے کی حیثیت اب بالکل علاقائی رہ گئی ہے۔ ۳۷۰ کسی طور بھی مرکز اور ریاست کے تعلقات میں حائل نہیں ہے، پھر جموں کے جن سنگھیوں کو ایک ودھان، ایک نشان، ایک پردھان کے قیام کی اتنی جلدی کیوں ہے؟

اوغام کا یہ عمل بڑی ہمواری سے جارہا ہے۔ غیر مناسب تعجیل سے اس سارے عمل کو ریاستی عوام کے لئے مشکوک بنایا جاسکتا ہے۔ ادغام کی بڑی بڑی خوراکیں پلا کر اُن کے ہاضمے کو بگاڑا جاسکتا ہے اور اس وقت ریاست میں سیاسی سطح پر جو قوتیں نبرد آزما ہیں، اس صورت حال میں ان سے صرف علیٰحدگی پسند قوتوں کو اس طرح سے فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے۔

جذباتی نعرے دینے سے کوئی مقصد حل نہیں ہوسکتا۔ ریاست کو باقی ملک کے قریب تر لانے کے سلسلے یں مقامی کیفیت وکوائف اور جذبات کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھنا ضروری ہے۔ کاغذ پر بعض آئینی دفعات کو قینچی سے کاٹ دینا بذات خود کوئی مقصد نہیں ہے۔ یہ تو ایک لمحے میں طے پاسکتا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ریاست کی ساری آبادی کو جذباتی اور ذہنی طور پر باقی ملک کے قریب لانے کے لئے بڑی احتیاط اور بڑے ریاض سے کام کیا جائے۔ ریاست میں ہندوستان سے الحاق کے مخالف اس وقت مرکز کے ارادوں کے بارے میں جو ڈراوٗنی تصویر عوام کے سامنے پیش کررہے ہیں، اُس سے خوف کی نفسیات پیدا ہوگئی ہے اور ہر ایک قدم کو شبہات کی عینک چڑھا کر دیکھا جاتا ہے۔ اس مرحلے پر عوام کو اشتعال دینے، ان کے شبہات کو تقویت دینے اور ان کے جذبات کو نظر انداز کرنا ملکی مفاد کے نہیں، علیٰحدگی پسند عناصر کے ہاتھ مضبوط کرنے کے برابر ہوگا۔ اس مرحلے پر ہند نواز سیاسی جماعتوں کا فرض یہ ہے کہ وہ بڑی آہستگی، بڑے وقار اور بڑے سکون کے ساتھ ان شبہات کو غلط

ثابت کریں۔ جن سنگھ کے لیڈر اس صورت حال میں کانگریس کے ہاتھ مضبوط کر سکتے تھے لیکن اُن پر تنگ نظرانہ سیاست کی جو پٹی چڑھ گئی ہے اس نے انہیں عقل، بصیرت اور مصلحت سے کوسوں دور پھینک دیا ہے۔ اسی لئے وہ وادی کی آبادی کو اپنے مشتعل لہجے سے خوف زدہ کر کے نادانستہ طور ہندوستان کے دشمنوں کا پارٹ ادا کر رہے ہیں لیکن اُمید کی جانی چاہیئے کہ کانگریس کی مقامی اور مرکزی لیڈرشپ صورتحال کو رسمی اور کاغذی پیمانوں سے ناپنے کی بجائے حقائق پسندی کے معیاروں پر پرکھے گی، اور ہر قدم احتیاط کے بعد اٹھائیگی۔ غیر دانشمندانہ تعجیل کو دیکھ کر تو بعض اوقات یہ تاثر ہوتا ہے کہ الحاق کی حقیقت کے بارے میں ان عناصر کے دلوں میں چور ہے۔ اسی لئے یہ تعجیل اعتماد کی نہیں بلکہ کمزوری اور بے اعتمادی کا سا تاثر پیش کرتی ہے۔

۲۱؍مارچ ۱۹۶۵ء

ہوش کی باتیں!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے معتقدین کے پُرعقیدت مجموعوں سے باہر جا کر اور زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے دور ہو کر قاہرہ اور لندن کی فضاؤں نے شیخ محمد عبداللہ کے ذہن میں حقیقت پسندی کی وہ چنگاری پھر روشن کر دی ہے، جو جیل خانے سے باہر آتے وقت اُن کے اپروچ میں نظر آئی تھی، مگر جو بعد کے ہنگامی واقعات اور پے در پے ناکامیوں کی وجہ سے بُجھ گئی تھی۔ شیخ صاحب جب قاہرہ سے لندن پہنچے تو ہوائی اڈے پر اُنہوں نے اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے اور باتوں کے علاوہ یہ فقرہ بھی کہا۔

''کشمیر کے عوام کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کشمیر کے مسئلے کا حل ایسا ہونا چاہیے جس سے برصغیر ہندوپاک کے مسائل کی گھتیاں سُلجھ جائیں، بجائے اس کے کہ وہ اور زیادہ اُلجھ جائیں''

شیخ صاحب کے اس بیان میں ہوش مندانہ غور و فکر کا جو رُجحان ملتا ہے، اُن کے ہر بہی خواہ کی طرح برصغیر ہندوپاک کے ہر ذی ہوش شہری نے اس کا خیر مقدم کیا ہوگا۔ کشمیر کے مسئلے کو ہندوپاکستان کی موجودہ سیاسیات اور اس کی پیچیدگیوں سے الگ کر کے اس پر سوچنا انتہائی ناعاقبت اندیشانہ طرزِ فکر اور بے پناہ خود غرضانہ رویہ ہے۔ ہم لاکھ کہیں کہ کشمیر کو ہندوپاکستان کے مسائل کی

قربان گاہ پر بھینٹ نہیں چڑھایا جا سکتا، مگر یہ حقیقت باقی رہتی ہے کہ کشمیر کی موجودہ حیثیت میں کسی قسم کی غلط کارانہ تبدیلی سے ہندوستان اور پاکستان میں فساد اور تناتنی کی ایک ایسی لہر پھوٹ سکتی ہے، جس کے عواقب انتہائی لرزہ خیز اور بدصورت ہو سکتے ہیں۔ کشمیر میں ہونیوالے معمولی واقعات سے کس طرح ہندوپاک کے دور دراز علاقوں میں رہنے والے بے گناہ اور معصوم انسانوں کا دامن بندھ گیا ہے اُس کی نظیر پچھلے سال نظر آئی، جب کشمیر میں موئے مبارک کی چوری کا سانحہ پیش آیا۔ یہاں وشوانا تھن کی گولیوں کے علاوہ حالات پُر امن رہے اور کسی قسم کا کوئی فرقہ وارانہ واقعہ پیش نہیں آیا۔ لیکن اس حادثے کی آڑ میں مشرقی بنگال میں سینکڑوں بے گناہ غیر مسلموں کو موت کی نیند سلایا گیا اور اُس کے بعد مغربی بنگال اور اڑیسہ میں بے شمار معصوم مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا گیا۔ لہذا یہ کہنا بالکل مہمل ہے کہ کشمیر کے مسئلے کا ہندوپاکستان کے دوسرے مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔ بہر کیف خوشی ہے کہ جواہر لال نہرو کی موت کے بعد پہلی مرتبہ شیخ صاحب کی زبان سے پھر اس حقیقت کا اعتراف سُننے کو ملا ہے۔

شیخ صاحب مسئلہ کشمیر کے ایک اہم کردار ہیں اور اگر وہ یہ ہوشمندانہ رویہ اپناتے رہیں تو اس سے ہندوپاکستان کے مسائل کی گھتیوں کے سلجھ جانے میں بڑی مدد مل سکتی ہے، جو آخر میں مسئلہ کشمیر کے آبرومندانہ حل کے لئے حالات سازگار بنا سکتے ہیں، لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ شیخ صاحب نے اپنے مقصد سے لگن میں جو استقلال دکھایا ہے، اُس قسم کا استقلال وہ ایک متوازن سیاسی اپروچ کے ساتھ نہیں دِکھا سکے ہیں۔ کشمیر میں رہ کر یہاں کی آب وہوا کی طرح وہ گھڑی میں تولہ اور گھڑی میں ماشہ ہوتے رہتے ہیں۔ جواہر لال نہرو کی موت ہندوستان کے لئے واقعی ایک ایسا سانحہ تھی جس کا صدمہ کئی سال کے بعد ہی سنبھالا جا سکے

گا۔ ان حالات میں اگر نئی دہلی کی لیڈر شپ اپنے مسائل میں گم ہو کر شیخ صاحب کو وہ التفات نہیں دے سکی، جس کی اُنہیں توقع تھی تو اُنہیں مشتعل ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن بدنصیبی کی بات یہ ہے کہ کئی ہفتے پہلے یہ بات کہنے والے شیخ صاحب ''کشمیر کا مسئلہ ثانوی اہمیت کا حامل ہے، اصل مسئلہ ہندو پاکستان کے درمیان دوستی کا ہے'' بعد میں فرمانے لگے ''کشمیر ہندو پاکستان کا گروی نہیں ہے اور نہ ہم اُن کے مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہمارا اپنا مسئلہ حل ہو یہی ہمارا مطالبہ ہے۔'' ظاہر ہے کہ اس سے کشمیر اور ہندوستان میں ہی ردعمل نہیں ہوا بلکہ شیخ صاحب خود بھی اپنے دوستوں اور ہمدردوں کی حمائت سے محروم ہونے لگے اور ریاست میں تناتنی کی وہ فضا قائم ہوگئی جس کا ایک سرا ترکِ موالات اور دوسرا سرا محاذ کے لیڈروں کی اجتماعی گرفتاریاں ہیں۔ یہ مسئلہ اب یہیں تک محدود نہیں بلکہ ہندو پاکستان میں اندر اندر سے ہی اشتعال اور غصے کے میلانات بھی پرورش پا رہے ہیں، جو خود شیخ صاحب کے مقاصد کے لئے انتہائی ضرر رساں ثابت ہو سکتے ہیں۔ اُمید ہے کہ اب تلخ تجربات کے بعد صحیح نتیجے پر پہنچنے کے بعد شیخ صاحب کے اپروچ کا تلون باقی نہیں رہے گا اور وہ زیادہ استقلال، تحمل اور بُردباری سے اِس سیاسی سبق کو عمل میں Follow up کرنے کی کوشش کریں گے۔ لندن سے لوٹ کے جب وہ کشمیر آئیں گے تو اُمید ہے کہ زندہ باد کے فلک شگاف نعرے اُن کے ذہنی توازن کا میزان درہم برہم نہ کریں گے اور وہ مستقل مزاجی سے غصے اور جھلاہٹ سے بچنے کی کوشش کریں گے۔ اُنہیں یہ بات یاد رکھنا ہوگی کہ اگر اُنہیں مشتعل کرنے کی کوشش بھی کی گئی تو اُن کا کام اشتعال سے بچنا ہے۔ دوسری صورت میں وہ اپنے مقصد کو زک پہنچانے کے علاوہ اپنی سیاسی بلوغت کو بھی اشتباہ میں ڈال دیں گے۔

۶ر مئی ۱۹۶۵ء

وہ کانگریس کہاں ہے؟

اس ہفتے آپ کا نمایندہ کانگریس کی کھوج میں سرگرداں رہا۔ اس سلسلے میں اس نے شہر کے علاوہ مفصلات کا بھی دورہ کیا۔ ہفتے بھر کی تحقیق و تفتیش کے بعد وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اُسے وادی کے طول و عرض میں کانگریس کا کہیں اتا پتا نہ ملا۔ کانگریس کے دفتروں کے بورڈ متعدد مقامات پر آویزاں نظر آئے۔ بعض جگہوں پر مخلص اور سرگرم کانگریسی کارکنوں سے بھی ملاقات ہوئی لیکن وہ تحریک، وہ تنظیم اور وہ پروگرام جو کانگریس کے نام سے وابستہ ہے، کہیں نظر نہیں آتا۔ سرینگر جو کانگریس کا مرکزی دفتر ہے، اس لحاظ سے میری تحقیق و تفتیش کا سب سے مایوس کن مرحلہ تھا۔ یہاں کانگریس کے بڑے بڑے کارکن اکثر شہر کی شاہراہوں پر نظر تو آجاتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ ایک زندہ جاوید تنظیم کے رکن نہیں ہیں، بیرون ریاست سے آئے ہوئے سیاح ہیں جو کچھ دنوں کے لئے یہاں ہوا خوری کے لئے آئے ہیں۔ بعض ممتاز ممبر زیادہ تر سیکریٹریٹ میں وزیروں کے دفتروں کے چکر لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے شہر میں کانگریس کی کوئی سرگرمی نظر نہیں آئی۔ مفصلات میں جہاں کارکنوں کو اس قسم کے مواقع کم ہی میسر

آتے ہیں۔ کانگریس کی سرگرمیاں دفتروں پر بورڈ آویزان کرنے کے ساتھ ہی ختم ہوگئی ہیں۔

۲۶ر جنوری کو ریاست بھر میں کانگریس کی رسم افتتاح بڑی دھوم دھام سے انجام دی گئی چند ہفتوں کے اندر ہی سید میر قاسم ...... نے اعلان کر دیا کہ ممبر شپ کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کر گئی۔ ایک اعلان کے مطابق اب کانگریس کی ممبر شپ دو لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کانگریس کسی پروگرام کا نام ہے یا ممبروں کے ایک بھاری اجتماع کا؟

کانگریس ایک سیاسی پروگرام، اقتصادی نظام اور ذہنی رجحان کا نام ہے۔ یہ پروگرام، یہ نظام اور یہ رجحان عام کرنے میں ہمارے ہاں کے کانگریسی لیڈروں نے ابھی تک کیا کِیا ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا، اگر ریاست میں کانگریس کا مقصد شیخ محمد عبداللہ اور محاذ رائے شماری کے خلاف بیانات شائع کرنا ہے تو اس معاملے میں بھی کانگریس نے محاذ رائے شماری اور ایکشن کمیٹی سے مات کھائی ہے کیونکہ پبلسٹی کے اعتبار سے محاذ اور ایکشن کمیٹی کا کام کانگریس کے مقابلے میں زیادہ منظم اور مسلسل رہا ہے ویسے بھی مخالف تحریکوں کا مقابلہ کرنا کانگریس کے مقاصد میں سے ایک مقصد ہے، خود کانگریس کا مثبت پروگرام کیا ہے؟ یہ ریاست میں کسی کو معلوم نہیں اور عوام پر یہ مقصد واضح کرنے کے لئے کانگریس لیڈر شپ نے ابھی ایک بھی قدم نہیں اٹھایا ہے اور آج کل یہ تنظیم جس جمود اور بے حسی کا شکار ہے اس کے پیش نظر اس بات کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ کانگریس رہنما اس سلسلے میں کوئی ٹھوس قدم اٹھانے والے ہیں۔ ترک موالات کی ناکامی کے بعد کانگریس رہنماؤں کو کانگریس کے پروگرام اور اس کے بنیادی مقاصد کو عوام تک

پہنچانے کا ایک اچھا خاصا موقع مل گیا تھا لیکن افسوس ہے کہ اس موقع کو گنوا دیا گیا۔

میں نے پچھلے ایک مہینے میں سرینگر میں کانگریس کا ایک بھی جلسہ منعقد ہوتے نہیں دیکھا۔ کانگریس کی تمام تر سرگرمیوں کی رپورٹ صدر دفتر سے شائع ہونے والے Hand Out تک محدود ہے جس میں کانگریسی کارکنوں کی تقریروں کی رپورٹ درج ہوتی ہے۔ اب جبکہ محاذ رائے شماری، پولٹیکل کانفرنس، ایکشن کمیٹی اور اس نوعیت کی سبھی جماعتوں کی سرگرمیاں ماند پڑ گئی ہیں، وادی کی سیاسی زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ کانگریسی رہنما ان سازگار حالات میں عوام سے رابطہ پیدا کر کے اس تنظیم کو فعال اور متحرک بنانے کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ کانگریسی قیادت کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ انہیں ہمیشہ کے لئے موجودہ سازگار ماحول بہم نہ ہو سکے گا۔ محاذ رائے شماری سے مستعفی ہو کر کانگریس میں شامل ہونے والوں کی فہرستیں شائع کرانا یہ ثابت کرتا ہے کہ کانگریس نے اپنی تنظیم کے دروازے موقع پرست اور بے ایمان کارکنوں پر کھول دئے ہیں اور یہ کانگریس کی زندگی سے زیادہ اس کی موت کا نقطہ آغاز ثابت ہو سکتا ہے۔

۱۷/جون ۱۹۶۵ء

حقائق سے فرار

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اختلافات کی بڑھتی ہوئی خلیج کو دور کرنے کے لئے کچھ عرصے سے ہندوستان کے کچھ مخلص اور مقتدر رہنما اپنی کوششیں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ عرصہ پہلے ہندو پاکستان مصالحتی گروپ کا قیام بھی عمل میں آیا تھا لیکن گذشتہ کئی مہینے کے واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ توازن اور تدبر کی یہ آواز صدا بصحرا ثابت ہو گئی ہے اور باوجود اس کے کہ ہندوستان میں اسے جے پرکاش نرائن اور راجگو پال آچاریہ جیسے مقتدر رہنماؤں کی حمایت حاصل ہے، اسے مجموعی طور پر ملک میں سنجیدگی سے قبول نہیں کیا گیا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ ہندوستان میں اس گروپ کی سرگرمیاں حقائق کی چٹانوں سے ٹکرا کر سرد پڑ گئی ہیں کشمیر میں دونوں ملکوں کے درمیان صلح و آشتی کی فضا قائم کرنے کے لئے کچھ سیاسی کارکنوں نے پچھلے دنوں اپنے آپ کو مصالحتی گروپ کی شکل دی ہے۔

ہندو پاک آشتی کا خیال کشمیر میں پیدا نہیں ہوا بلکہ یہ ہندوستان کے بعض مقتدر رہنماؤں مثلاً پرکاش نرائن وغیرہ کے فکر کا ثمرہ ہے۔ بجائے خود ان دو ممالک کے درمیان بہتر تعلقات کی خواہش برصغیر کے کس معقول آدمی کو نہیں ہو گی لیکن سوال یہ ہے کہ کیا صرف نعرے دینے سے حقائق کی خلیج کو پاٹا جا

سکتا ہے؟ پھر جے پرکاش نارائن کی قامت کے لیڈروں کی زبانی یہ مسلک اس قدر مضحکہ خیز معلوم نہیں ہوتا، جتنا کشمیر کے بعض سیاسی مجبوروں کی زبانی، کیونکہ کشمیر ہندوپاک تعلقات کا سب سے نازک مقام ہے اور یہاں پر دونوں ملکوں کا تضاد اپنی شدید ترین صورت میں نمایاں ہے۔ ایک طرف ہند کا موقف یہ ہے کہ کشمیر کے الحاق کا مسئلہ طے ہو چکا ہے اور اس پر عوام نے مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ دوسری طرف پاکستان گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا ہے کہ کشمیر کے الحاق کا مسئلہ ابھی تصفیہ طلب ہے اور اس کا فیصلہ وہاں کے عوام کی رائے شماری سے ہونا چاہیے۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے متوازی ہی نہیں بلکہ متضاد بھی ہیں اور جب کوئی کشمیری ہند پاک تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے ان دو میں سے کسی ایک موقف کی طرف تھوڑا سا جھکاؤ بھی ظاہر کرتا ہے۔ تو اُس کا سارا کردار فریق مخالف کی نگاہوں میں مشکوک ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے نہ صرف آشتی کے مفہوم کو آگے بڑھانے میں کوئی مدد نہیں ملتی بلکہ اس سے غلط فہمیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں اور صورت حال کی پیچیدگیاں کچھ اور بڑھ جاتی ہیں۔ جو اصحاب آشتی کا پرچم اٹھا کر سامنے آ گئے ہیں، اُن کے اپنے ذہنوں میں اس کے طریق کار کا کوئی واضح تصور نہیں ہے اور وہ اندھیرے میں ٹٹولنے کے سواء کچھ اور کام نہیں کر سکتے۔ حتمی تجزیے میں اس انجمن کا کام فقط دُعاِ خیر اور وعظ و نصیحت تک محدود دکھائی دیتا ہے اور بد قسمتی سے سیاست کے نقار خانے میں ان قلندرانہ اداؤں کی کوئی قیمت اور اہمیت نہیں ہے۔ انجمن کے بانیوں کی نیت پر شبہ کرنا مقصود نہیں ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُنہیں موجودہ صورت حال میں اپنے وجود کا ثبوت دینے کے لئے اور کوئی راہ سُجھائی نہیں دیتی اور وہ اس مبہم تصور کے سہارے کم سے کم اپنے

آپ کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہم بیکار نہیں بیٹھے ہیں۔ اس قسم کی خیال پرستی نہ صرف حقائق سے فرار کے مترادف ہے بلکہ اسے خود فریبی بھی سمجھ لینا چاہیے۔ اس سے تو بہتر یہ تھا کہ یہ رہنما یہاں عوامی شعور کی سطح بلند کرنے اور عوام کی قوتوں کو صحیح سیاسی رُجحانات کی جانب مائل کرنے کے لئے اپنا وقت صرف کرتے۔ موجودہ صورت میں وہ نہ صرف اپنے آپ کو مثبت سیاسی جدوجہد سے الگ کررہے ہیں بلکہ وہ اُس مقصد کو نقصان پہنچانے کے سامان بھی پیدا کررہے ہیں جس کے حصول کی اُنہیں اس قدر فکر ہے۔ سیاست میں ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جب بعض نازک مقامات کو چھیڑنا خود اپنے ہاتھ جلانے کے برابر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور غور طلب نکتہ جو بنیادی اہمیت کا حامل ہے، یہ ہے کہ اس اتنے بڑے عمل کو صرف ہندوستان میں رہنے والے چند خیر پسندوں کی خواہش سے ہی منطقی انجام تک نہیں پہنچایا جا سکتا۔ جہاں ہندوستان میں اس غیر مقبول کاز کی حمائت میں جے پرکاش، نارائن، راج گوپال آچاریہ، ونوبا بھادے اور اسی قسم کی پُر وقار آوازیں بلند ہو رہی ہیں، وہاں پاکستان میں اس قسم کی کوئی آواز سننے کے لئے کان ترستے رہے ہیں۔ یہ عمل یک طرفہ نہیں بلکہ باہمی ہے۔ ہندو پاک دوستی کا نعرہ دینے والے عناصر کو اس اہم پہلو کو بھی زیرِ نظر رکھنا چاہیے۔

۱۷/جون ۱۹۶۵ء

طریق کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

کشمیر ایڈمنسٹریٹیو سروس

سیاسی مصلحتوں اور فرضی اندیشوں کی افسوسناک داستان

ریاست کے انتظامیہ کو نااہل، بدنام اور غیر صحت مند عناصر سے پاک و صاف کرنے کا وعدہ کر کے خواجہ غلام محمد صادق نے ریاستی عوام کے دلوں میں اپنی حکومت کے لئے بے پناہ عزت، احترام اور نیک خواہشات پیدا کر دی تھیں۔ صادق صاحب ایک مسیحا کے روپ میں ظاہر ہوئے تھے، جو دِق زدہ انتظامیہ کو دیانت، اصول پرستی، انصاف اور اہلیت کے انجکشن دے دے کر ایک صحت مند انتظامیہ قائم کرنے کا عزم کئے ہوئے تھے۔ ان سے شدید سیاسی اختلافات رکھنے والے لوگ بھی ان کے خلوص کا احترام کرتے ہوئے ان سے اُمیدیں لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے سب سے بڑے سیاسی حریف شیخ محمد عبداللہ تک نے جموں جیل میں خواجہ احمد عباس سے کہا تھا کہ صادق کے آجانے سے کم از کم حکومت (ایڈمنسٹریشن) بہتر ہو جائے گی......لیکن پچھلے ایک سال کے واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ عظیم مقاصد کے حصول کے لئے

صرف خلوص اور نیک خواہشات ہی کافی نہیں، اخلاقی جرأت اور بے پناہ قوت فیصلہ کی ضرورت بھی ہے اور مجھے افسوس ہے کہ انتظامیہ کی تطہیر کے لئے جس جرأت اور Initiative کی اشد ضرورت ہے، صادق صاحب اور ان کی حکومت نے اس کا مظاہرہ نہیں کیا اور اس کی تازہ ترین مثال کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروس کی تنظیم ہے۔

کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروس کی تنظیم کا مقصد بہت اعلیٰ اور ارفع ہے۔ اس کا مقصد ریاست میں آئی اے ایس کے وزن پر ایک معیاری سروس قائم کرنا تھا جس میں قابلیت، دیانت اور اہلیت کے سوا اور کوئی معیار زیرِ غور نہ لایا جائے۔ اس سکیم کی رُو سے ایسے افسروں کا ایک Cader منتخب کرنا تھا، جو مختلف مقاصد اور نوعیت کے فرائض انجام دینے کی اہلیت رکھتے ہوں اور جنہیں انتظامیہ کے کلیدی منصبوں پر فائز کیا جا سکتا ہو۔ آج سے ایک سال قبل جب اس سکیم پر غور کا آغاز ہوا تھا، تو وزیر اعظم (اس وقت صادق صاحب وزیر اعظم تھے) نے اعلیٰ افسروں کی ایک میٹنگ میں کہا تھا کہ اس سروس میں صرف ایسے افسر منتخب ہونے چاہیں، جو قابلیت، دیانت اور اہلیت کے اعتبار سے اچھی شہرت رکھتے ہوں اور جن کی کارکردگی ہر لحاظ سے قابل تعریف ہو۔ ''انہوں نے کہا تھا کہ ''اگر اس سروس میں وہ لوگ بھی لئے گئے، جن کے ''کارہائے نمایاں'' سے ایڈمنسٹریشن بدنام ہوا ہے تو پھر اس سروس کی تنظیم سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا......لیکن صرف ایک سال کے بعد صادق صاحب نے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے ایڈمنسٹریٹو سروس کے لئے افسروں کی ایک ایسی فہرست پر اپنے دستخط ثبت کئے، جس میں ریاستی انتظامیہ کے بدنام ترین افسر سرفہرست ہیں۔ یہی نہیں یہ سکیم تنظیم، ترتیب اور انتخاب کے اعتبار سے ناانصافی، بے اعتدالی

اور بے راہ روی کی ایک ایسی مثال ہے کہ ریاستی انتظامیہ کی تاریخ میں اتنی بڑی دھاندلی آج تک روا نہیں رکھی گئی ہے۔ میں نے کئی بار بغور اس سکیم کا مطالعہ کیا، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ محکموں اور افسروں کے انتخاب میں کون سا اصول زیرِ نظر رکھا گیا ہے اور آخر اس سکیم کے مصنفوں کے ذہن میں وہ کون سے مقاصد تھے، جن کی تکمیل کے لئے اُنہوں نے اس سروس کو منظّم کیا ہے؟
اس سلسلے میں تحقیق و تفتیش کرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ آغا ناصر علی فینانشل کمشنر کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی، جسے محکموں اور افسروں کے انتخاب کا کام سونپا گیا تھا۔ کمیٹی نے مختلف محکموں کے افسروں کا سابقہ ریکارڈ کا بغور مطالعہ کر کے سو یا اس سے زائد افسروں کو ایڈمنسٹریٹو سروس کے لئے منتخب کر دیا اور ساتھ ہی ستر یا اسی ایسے افسروں کی فہرست بھی تیار کر دی جن کے متعلق حکومت کو یہ مشورہ دیا گیا کہ ان کو کسی بھی مرحلے پر ایڈمنسٹریٹو سروس میں منتخب نہیں کیا جانا چاہیے۔ ان افسروں کے سابقہ ریکارڈ، ان کی شہرت اور ان کی قابلِ اعتراض کارکردگی کے پیشِ نظر کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ ایڈمنسٹریٹو سروس کو ان افسروں کے سائے سے بھی محفوظ رکھنا چاہیے۔ کمیٹی کی پیش کردہ فہرستوں پر مہینوں بحث ہوتی رہی۔ ہر وزیر کو یہ معلوم ہوا کہ اس کا کوئی نہ کوئی چہیتا ''ناقابلِ غور'' فہرست میں آ گیا ہے۔ سیاسی لیڈروں کو یہ احساس ہو گیا کہ سیاسی مصلحتوں اور تقاضوں کے پیشِ نظر فلاں افسر کو ضرور ایڈمنسٹریٹو سروس کے سینئر سکیل میں لیا جانا چاہیے۔ صوبائی نمائندگی کے علمبرداروں نے اپنے اپنے مطالبات پیش کر دئے۔ فرقہ وارانہ تناسب کے محافظوں نے اپنی شکایات کا دفتر کھول دیا۔ بعض ناصحوں نے یہ مشورہ دیا کہ اس نازک دور میں ستر اسی با اثر افسروں کو ناراض کرنا مناسب نہ ہوگا۔ کچھ جدلیات پسندوں'' نے

دعویٰ کیا کہ اس سے سروسز میں بے اطمینانی اور بے چینی پیدا ہو جائیگی اور اس طرح ایک عمدہ، معیاری اور مثالی سروس سیاسی مصلحتوں، فرضی اندیشوں اور بے ہنگم سمجھوتے بازی کا شکار ہو کر رہ گئی اور حکومت نے نہ صرف تمام ''سرکردہ'' افسروں کو ایڈمنسٹریٹر سروس کے لئے منتخب کر لیا بلکہ ذاتی پسند و ناپسند کی دھاچوکڑی میں وہ بہت سے افسر بھی آ گئے جن کا نام کسی بھی فہرست میں نہیں تھا اور جن کے انتخاب میں کسی معیار یا اصول کو مدنظر نہیں رکھا گیا۔ نئی سکیم کی رُو سے ریاست کے سب تحصلیدار ایڈمنسٹریٹو سروس میں لئے گئے ہیں۔ اس کی کیا منطق ہے؟ میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ تحصیلداروں کا طبقہ ویسے بھی بہت اچھی شہرت کا مالک نہیں لیکن چونکہ آغا ناصر علی کمیٹی کے چیرمین تھے اور کسی طرح ان کے ذہن میں یہ بات آ گئی کہ ہر تحصیلدار کا، کے اے ایس میں ہونا ضروری ہے، اس لئے ریاست میں جہاں کہیں کوئی تحصیلدار نظر آیا، وہ کشمیر کی ''معیاری'' اور مثالی سروس کے لئے منتخب ہو گیا۔ چاہے وہ کتنا ہی بڑا چور کیوں نہ ہو۔ بلاک ڈیولپمنٹ افسروں کے لئے کمیٹی نے ایک اور معیار مقرر کر لیا۔ سینکڑوں بی ڈی اوز میں سے صرف سات یا آٹھ بی ڈی او ایڈمنسٹریٹو سروس کے لئے منتخب ہوئے اور ان کا انتخاب کن اصولوں پر ہوا ہے، یہ ابھی تک معمہ ہے اور شائد ہمیشہ معمہ رہے۔ ان میں سے اکثر وہ بی ڈی او ہیں جنہیں جونیئر ہونے کے باوجود خواجہ شمس الدین نے اپنے دور میں نامعلوم وجوہات کی بنا پر سینئر گریڈ دے دیا تھا۔ ابھی اس بے انصافی کا زخم مُندمل نہ ہونے پایا تھا کہ کے۔اے۔ایس کے مصنفوں نے ایک اور وار کر دیا، جس کے تحت عبدالحمید خان جیسا نا اہل اور جونیئر افسر تو نئی سکیم کی رُو سے ایک ہزار روپے کے گریڈ میں آ گیا اور اس سے بدرجہا بہتر اور سینئر افسر منہ

تکتے ہی رہ گئے۔ اگر بی ڈی اوز کے انتخاب میں کارکردگی سے زیادہ تعلیمی قابلیت کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے تو پریم ناتھ مٹو اور دینو بھائی پنت کے پاس کونسی ڈگریاں ہیں؟ اور زاپوری اور غلام نبی بابا کی ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگریاں کسی کو کیوں نظر نہیں آئیں؟ یا پھر تحصیلداروں کی طرح تمام بلاک ڈیولپمنٹ افسروں کو ایڈمنسٹریٹو سروس میں کیوں نہیں لیا گیا۔؟ تحصیلداروں میں کون سے سرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں؟ محکمہ مال اور محکمہ دیہات سُدھار کا ذکر تو میں نے مثال کے طور پر کیا ہے۔ دراصل یہ پوری سکیم بے ضابطگیوں اور بے اصولی کا ایک ایسا ''شاہکار'' ہے جس سے حکومت پر عوام نے رہے سہے اعتماد کو بھی کھو دیا ہے اور اس سکیم کے مصنفوں کے ذہنی اور اخلاقی دیوالیہ پن کو بے نقاب کر دیا ہے۔

۲۲/اگست ۱۹۶۵ء

جنگ کے دروازے پر

ابھی کچھ ہفتے پہلے ہم ویت نام میں ہونیوالی تباہ کُن جنگ کی خبریں پڑھ پڑھ کر ویت نام میں رہنے والے لوگوں کی حالت کے متعلق سوچا کرتے تھے کہ وہ کس مستقل عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ آج ہم خود ایک ایسی ہی جنگ کی دہلیز پر کھڑے ہیں اور اگر موجودہ تناؤ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تو ایک صبح ہمیں یہ سُن کر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ ہندوستان اور پاکستان میں با قاعدہ جنگ چھڑ گئی ہے۔ دونوں ملکوں کی فوجیں پچھلے کئی سالوں سے آنے والے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلح ہو رہی ہیں۔ دونوں ملکوں میں انتہا پسندوں کا ایک با اثر اور بارسوخ طبقہ موجود ہے، جو معمولی سے معمولی مسئلے کو حل کرنے کے لئے بھی تلوار کا سہارا لینے پر یقین رکھتا ہے۔ ان حالات میں ایک با قاعدہ اور بھرپور جنگ چھڑ جانے کے تمام امکانات موجود ہیں۔ کشمیر کے متعلق پاکستان نے بات چیت اور صلح و آشتی کا رویہ ترک کر کے جو روش اختیار کی ہے، اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ پاکستان کو اب پُر امن ذرائع اور باہمی مصالحت کے وسائل پر اعتقاد نہیں رہا ہے اور وہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر مسائل کو حل کرنے پر بضد ہے۔ رَن کچھ میں پاکستان کی حالیہ

کارروائیوں اور کشمیر میں حملہ آوروں کی تازہ ترین شرانگیزیاں اس بات کا ثبوت ہیں کہ پاکستان میں فوجی مہم پسندوں نے وہاں کے ذی ہوش اور با شعور عناصر کو مکمل طور پر مغلوب کر دیا ہے اور خود کشمیر میں اس مسئلے کو رائے عامہ یا استصواب رائے کے ذریعے حل کرنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں، انہیں بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس پس منظر میں آنے والے واقعات کا اندازہ کرنے کے لئے علم نجوم کا جاننا ضروری نہیں اور یہ بات بڑی افسوسناک ہے کہ تباہی اور بربادی کی یہ آگ جو برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لئے بیتاب نظر آتی ہے، ہمارے سامنے سلگ رہی ہے اور ہم اس کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ یہ وقت کشمیر کے متعلق پاکستان یا ہندوستان کے موقف کی سلامتی یا صحت پر بحث کرنے کا نہیں، کچھ ٹھوس حقیقتوں کا جائیزہ لے کر ارباب پاکستان کو ان کی مہم پسندی کے نتائج سے آگاہ کرنے کا ہے اور اسی لئے ہم اخلاقی مباحث میں اُلجھے بغیر یہ کہنا چاہیں گے کہ پاکستانی حکمرانوں نے غالباً ہندوستان کے موجودہ مزاج، اس کی نفسیات اور موڈ کا ٹھیک سے اندازہ نہیں کیا ہے۔ قطع نظر اِس کے کہ ہندوستان کے لئے کشمیر سیاسی اور فوجی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے، پچھلے کئی برسوں سے کشمیر ہندوستانی عوام کے لئے ایک نفسیاتی اور جذباتی مسئلے کی حیثیت بھی اختیار کر گیا ہے اور ہندوستان کی کوئی حکومت کشمیر سے دستبردار ہو کر اپنے وجود کو زندہ نہیں رکھ سکتی۔ کشمیر ایک سیاسی مسئلے کی بجائے ملک کی عزت وتوقیر اور وقار کا مسئلہ بن گیا ہے اور ان حالات میں یہ توقع رکھنا کہ ہندوستان فوجی دباؤ یا دھمکیوں کے زیر اثر کشمیر سے دستبردار ہو جائے گا، اندازے کی ہی نہیں تجربے کی بھی بہت بڑی غلطی ہے۔ اگر پاکستان میں رہنے والے دس کروڑ لوگوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے پاکستان کے

حکمران جنگ کا بگل بجا دینے پر مجبور ہو سکتے ہیں، تو ہندوستان کے چالیس کروڑ لوگ اپنی حکومت کو کیا کچھ کرانے کے لئے مجبور نہیں کر سکتے۔ پاکستان کی تازہ ترین کارروائیوں نے ہندوستان کو ایک ایسی پوزیشن پہ کھڑا کر دیا ہے کہ ہندوستان کے لئے مدافعتی جنگ کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں اور ارباب نظر بخوبی جانتے ہیں کہ مدافعتی جنگ اور جارحانہ جنگ کے فاصلے مٹتے دیر نہیں لگتی۔ اس جنگ کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کے بارے میں صرف ایک بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ دونوں ملکوں کے لئے بالعموم اور کشمیر کے لئے بالخصوص انتہائی تباہ کُن ہوگی۔ ہندوستان بڑی مضبوطی اور طاقت سے کشمیر کا دفاع کرنے کے لئے مجبور ہے اور ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ کشمیر میں ہندوستان اپنے وقار کے لڑائی کے لئے بڑی سے بڑی قیمت دینے کے لئے بھی تیار ہے۔ اس طرح کشمیر ایک نہایت ہی خونریز اور خون آشام جنگ کی آماجگاہ بن جائے گا اور پھر یہ جنگ یہیں تک محدود نہ رہے گی بلکہ اس کے شعلے دور دور تک پھیل جائیں گے اور کشمیر کو حاصل کرنے کا سہانا خواب ایک ایسا Nightmare بن جائیگا کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

ان حالات میں پاکستان کے ارباب اقتدار کو اپنی تازہ روش پر ایک بار پھر غور کرنا چاہیے۔ اگر انہیں واقعی کشمیر اور یہاں کے عوام سے ہمدردی ہے تو انہیں کشمیر کو ایک خوفناک جنگ کی آگ میں جھونک دینے سے پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ ہم نے سالہا سال کی جدوجہد اور کشمکش کے بعد تحریر و تقریر کی آزادی حاصل کی ہے۔ پاکستانی حملہ آوروں کی تازہ ترین شر انگیزیوں سے اسے جو خطرہ لاحق ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ اگر ملک میں ایک باقاعدہ جنگ کی فضا قائم ہوگئی، تو ملک کی سلامتی اور سالمیت کے نام پر ہم سے وہ

سب کچھ چھن جائیگا جو ہم نے حاصل کیا ہے اور جس کو حاصل کرنے کے لئے ہم جدو جہد کرر ہے ہیں۔

ریاست کی وہ سیاسی جماعتیں جو کشمیر کے مسئلے کو جمہوری طریقوں سے حل کرنے کی خواہش مند ہیں یقیناً پاکستان کی تازہ جارحانہ کاروائیوں کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتیں۔لیکن ان کی خاموشی کے یہ بھی معنیٰ ہو سکتے ہیں کہ انہیں بھی اب اپنے موقف کی سلامتی پر اعتقاد نہیں رہا ہے اور وہ جمہوریت کی بجائے طاقت سے اس مسئلے کو حل کرنے کے طریق کار کو قابل اعتراض نہیں سمجھتیں، میرا خیال ہے کہ کانگریس سے زیادہ محاذ رائے شماری کو پاکستان کی شرانگیزیوں کی مذمت کرنی چاہیے کیونکہ پاکستان کی موجودہ روش ان کے موقف اور سیاسی لائحہ عمل کی عین ضد ہے۔آج سے اٹھارہ سال پہلے بھی پاکستان نے یہاں کے لوگوں کی رائے کو ثانوی حیثیت دے کر کشمیر کو بزورِ بازو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، اس وقت شیخ صاحب نے اس منصوبے کو ناکام بنانے میں اہم رول ادا کیا تھا۔آج جو لوگ اپنے آپ کو شیخ صاحب کا جانشین سمجھتے ہیں، انہیں پاکستان کو بتا دینا چاہیے کہ طاقت کے بل بوتے پر کشمیری عوام کو مفتوح بنانے کا منصوبہ پہلے کی طرح ناکام بنا دیا جائے گا۔

۳۰ / اگست ۱۹۶۵ء

غیر متزلزل اعتقاد!

کشمیری مسلمانوں نے ایک بار پھر دُنیا پر یہ بات واضح کردی ہے کہ وہ مذہب سے بے پناہ عقیدت اور دالہانہ شیفتگی کے باوجود مذہب کے نام پر بھڑکائے نہیں جاسکتے۔ ہندوستان کی مرکزی سرکار یا ریاستی سرکار سے انہیں کتنے ہی گلے اور شکوے کیوں نہ ہوں، جب ریاست کی سالمیت اور سلامتی کو خطرہ لاحق ہو، تو وہ چھوٹی چھوٹی وفاداریوں پر غالب آکر اس بڑی وفاداری کا ثبوت دیتے ہیں جو اپنے ملک اور اپنی آزادی کی سلامتی کے تئیں ان کا شعار رہا ہے۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں بھی پاکستان نے مذہب کے نام پر یہاں کے مسلمانوں کو ترغیب و تحریص کا شکار بنانا چاہا، لیکن چونکہ ہماری قومی روایات مذہبی رواداری اور بھائی چارے کی بنیادوں پر استوار ہیں، اس لئے کشمیریوں نے بڑی جرأت اور استقلال سے پاکستان کے پھیلائے ہوئے دام میں گرفتار ہونے سے انکار کردیا۔ پچھلے اٹھارہ برسوں میں ہندوستان کی مرکزی سرکار کا رویہ کشمیر کے سلسلے میں وہ نہیں رہا ہے جو رہنا چاہیے تھا۔ کشمیر کو چند افراد کی جاگیر سمجھ کر انہیں یہاں کے سیاہ وسفید کا مالک بنادیا گیا تھا۔ رشوت ستانی، کنبہ پروری اور اقربا نوازی کے علاوہ سیاسی مخالفین کی دار و گیر کا سلسلہ بھی اعلیٰ سطح پر

جاری رہا۔ کشمیری عوام کے جائیز حقوق اور مطالبات کی طرف مناسب توجہ نہیں دی گئی۔ اقتصادی محاذ پر حکومت کی کارروائیاں ایک محدود طبقے کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئیں۔ ملک کے بعض حصوں میں فرقہ پرستوں کی سرگرمیوں نے سیکولرازم پر کشمیری مسلمانوں کے اعتماد کو کمزور کر دیا۔ ہندوستانی لیڈروں کے تجاہل عارفانہ نے کشمیر میں ہونے والی ہر نامناسب کاروائی کو ہندوستانی قیادت سے منسوب کر لیا اور کانگریس رہنماؤں نے ریاست میں کسی ترقی پسند تحریک کو پروان چڑھانے کی بجائے چند افراد کو خوش رکھنے کے آسان طریقے کو آزمایا۔ اس پس منظر میں پاکستانی حملہ آروں کی یلغار اور پاکستانی نشرگاہوں سے مذہب کے نام پر جذبات بھڑکائے جانے کی کوششوں کو ذہن میں رکھا جائے، تو کشمیری عوام کی سیاسی پختگی اور ان کی قوت فیصلہ کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ کشمیری عوام فطرتاً مذہب سے گہری وابستگی رکھتے ہیں لیکن پاکستان کی تازہ ترین شرانگیزیوں کے مقابلے میں اُنہوں نے جس ضبط، تحمل اور توازن کا ثبوت دیا ہے، وہ ہندوستان کی ان تمام فرقہ پرست جماعتوں کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے، جو دہلی میں بیٹھ کر ہر کشمیری مسلمان پر پاکستانی ہونے کا فتویٰ جاری کرتے رہتے ہیں۔ کشمیری مسلمانوں نے اپنے کردار سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستانی رہنماؤں کی ناقابل معافی فروگذاشتوں کے باوجود سیکولرازم پر ان کا اعتماد قائم ہے اور وہ ہندوستان میں فرقہ پرستی کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں ان قوتوں کا ساتھ دیں گے، جو ہندوستان کو صحیح معنوں میں جمہوریت اور سیکولرازم کا آئینہ خانہ بنانا چاہتے ہیں۔ کشمیری مسلمانوں کا یہ جرأت مندانہ رویہ ہندوستان کی ان فرقہ پرست قوتوں کے لئے ایک چیلنج ہے، جو صرف اپنے آپ کو ہندوستانی تہذیب کا وارث اور محافظ

سمجھ کر ملک کی اقلیتوں کو دوسرے درجے کا شہری سمجھتی ہیں۔ ہم نے اس نازک مرحلے پر جب کہ کشمیر سے پاکستان کے حق میں اُٹھنے والی ایک نحیف سی آواز بھی پاکستان کے لئے سرمایہ حیات ثابت ہوسکتی تھی، اپنے نظریات اور اپنی روایات کی صحت اور عظمت کا ثبوت دے کر پاکستان کی جارحیت کا بھرپور مقابلہ کیا۔ ہندوستانی قیادت کو کشمیری مسلمانوں کے اس بلیغ اشارے کو سمجھ کر ملک میں ایسے حالات پیدا کرنے کے لئے کوشاں رہنا چاہیے، جن میں ہندوستانی مسلمان امن، چین اور اعتماد سے رہ سکیں۔

کشمیر نے ہندوستان کی زمین اور اس کی سرحدوں کے ساتھ الحاق نہیں کیا ہے۔ کشمیر کا الحاق ہندوستان کے اس آئیڈیل اور اس نظام زندگی سے ہوا ہے، جسے ہندوستانی آئین میں جمہوریت اور سیکولرازم کا نام دیا گیا ہے۔ جب تک ہندوستان اس شاہراہ پر گامزن ہے، ہزاروں پاکستان، ہندوستان اور کشمیر کے اس رشتے کو کمزور نہیں کر سکتے۔ لیکن جس دن ہندوستان کے سیکولرازم سے اہل کشمیر کا اعتماد اُٹھ جائے گا، اس دن کے بعد سے دُنیا کی کوئی طاقت اس رشتے کو بحال نہیں رکھ سکتی۔

ہندوستان اور کشمیر کے تعلق کو ابدی قرار دینے والوں کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے۔ کشمیری عوام کا تازہ ترین فیصلہ یہ ہے کہ کچھ غیر معمولی ناکامیوں کے بعد بھی ہندوستان میں سیکولرازم کا مستقبل بہت روشن ہے۔ ہندوستانی عوام کو اس فیصلے کی تصدیق کرنا چاہیے...... ارباب پاکستان کو کشمیری عوام کے اس فیصلے کی معنویت اور اس میں پوشیدہ گہری رموز کو سمجھ لینا چاہیے۔ آج اگر کشمیر کے مسلمان اپنے مذہب اور اپنے تمدن کی بنیاد پر پاکستان کے فریب میں آجاتے تو ہندوستان کے ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کے لئے اس

ملک میں رہنے کا کوئی اخلاقی جواز باقی نہیں رہتا۔ کشمیری مسلمانوں نے اپنی روایات کا ہی احترام نہیں کیا ہے، ہندوستانی مسلمانوں کو ملک میں باوقار اور با عزت زندگی بسر کرنے کا حق بھی عطا کیا ہے۔ اس فیصلے کے بڑے دوررس نتائج برآمد ہوئے ہیں اور ہوں گے۔

۳۰/اکتوبر ۱۹۶۵ء

نیا دور......نئی منزلیں

میں حال ہی میں ملک کے بعض اہم حصوں کا دورہ کر کے لوٹا ہوں، ایک ماہ کے اس سفر کے دوران مجھے ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں کے لیڈروں، اخبار نویسوں، ممبرانِ پارلیمنٹ، دانشوروں اور ادیبوں سے تبادلۂ خیال کرنے کے علاوہ بعض اہم مقامات پر عوامی جلسوں میں تقریریں کرنے کا موقع بھی ملا۔ تجربات اور تاثرات کے اعتبار سے میرا یہ دورہ....توقعات سے زیادہ کامیاب رہا ہے۔ ایک ایسے مرحلے پر جبکہ کشمیر کے سوال پر پورے ملک میں ایک ہیجان برپا ہو گیا ہے اور کشمیر کے تحفظ کا مسلہ بھارت کی عزت وتوقیر کی کسوٹی بن گیا ہے، اس دورے نے مجھے ایک نئی بصیرت اور آگہی عطا کی ہے۔ اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے اس جذبے، جوش اور لگن کا صحیح اندازہ نہیں ہو پاتا، جس نے ملک میں ایک نئی فضا اور ذہنوں میں ایک نئی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ میرے اس دورے کا مقصد اس نئی فضا اور اس نئے ماحول میں کچھ پُرانی باتیں دہرا کر ایک نیا احساس پیدا کرنا تھا، مجھے اس میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی ہے، خود میرے لئے اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہو گا۔ لیکن بحیثیت مجموعی مجھے اس بات کا اطمینان ہے کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ میرے اس

دورے کا مقصد کشمیر میں رونما ہونے والے واقعات کی روشنی میں ملک کی رائے عامہ کو فرقہ پرست جماعتوں کے خلاف منظّم کرنا تھا، کشمیر اور بھارت کے تعلق کو ایک سیاسی سمجھوتے کی بجائے نظریاتی مواد دینا تھا، ملک کی اقلیتوں کو آئین میں دی گئی ضمانتوں کی تقدیس واحترام پر زور دینا تھا اور پاکستانی حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے ملک میں فرقہ وارانہ اتحاد، آشتی کی جو فضا قائم کی گئی ہے، اسے ایک مستقل شکل دینے کے لئے جدو جہد کرنا تھا۔ یہ مقاصد بہت عظیم ہیں، اوران کے حصول کے لئے جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم کے علاوہ لا محدود ذرائع کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن ہندوستان اور پاکستان کی حالیہ کشمکش نے ایک ایسی صورتحال کو جنم دیا ہے کہ نفسیاتی نکتہ نظر سے اس مرحلے پر اگر یہ باتیں سلیقے سے کہی جائیں تو یقیناً ان کا اثر ہوگا یہی وجہ ہے کہ انتہائی نامساعد حالات میں بھی، میں نے یہاں سے ایک ڈیلی گیشن لے جانے کا فیصلہ کرلیا! کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ قرار دینے کا فریضہ مجھ سے زیادہ بلند قامت لوگ کئی سال سے انجام دیتے آئے ہیں۔ الحاق کو حتمی اور آخری قرار دینے کی آوازیں بھی اتنی بار بلند ہوئی ہیں کہ ان آوازوں کے ساتھ اپنی آواز ملا کر میں کوئی نیا ئسُر پیدا نہیں کرسکتا۔ اس لئے اٹوٹ انگ اور حتمی الحاق کا نعرہ بلند کرنے کے لئے ہزاروں میل دور کا سفر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ (اگرچہ اس سفر میں ہم نے کئی بار یہ نعرے بھی بلند کئے) ہمارا مقصد بھارت کے لوگوں کو یہ بتانا تھا کہ کشمیر میں جو کچھ ہوا ہے، اس کی معنویت، اہمیت اور افادیت کیا ہے اور ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ ہماری بات کو بڑی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنا گیا ہے۔

۱۵ اگست کو جب پاکستانی درانداز ہزاروں کی تعداد میں ریاست میں

گھس آئے تو پاکستان کی طرف سے بڑے زور وشور سے یہ اعلان کیا گیا کہ ریاستی عوام نے حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کی ہے۔ پاکستان کے منصوبہ سازوں کا اندازہ تھا کہ دراندازوں کے ریاست میں گھس آنے کے ساتھ ہی اہلِ کشمیر ان کا سواگت کر کے اپنے غیض وغضب اور جذبۂ بغاوت کا اظہار کریں گے۔ میں ذاتی طور پر یہ بات جانتا ہوں کہ اہل کشمیر کی ایک بھاری اکثریت موجودہ حکومت اور صورتِ حال سے مطمئن نہیں ہے اور مجھے حیرت نہ ہوتی اگر کچھ لوگ اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے پاکستانی دراندازوں کے ساتھ مل کر حکومت کے لئے مشکلات پیدا کر دیتے۔ لیکن ۱۵ اگست سے ۱۶ ستمبر تک وادی کے کسی مقام پر کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا، جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہو کہ کسی سیاسی جماعت یا گروہ نے ان کی اعانت یا حمائت میں کوئی قدم اُٹھایا ہو، بلکہ مجلس عمل، محاذ رائے شماری اور عوامی ایکشن کمیٹی کی طرف سے علامتی ستیہ گرہ کی تحریک کو بھی نامعلوم وجوہات کی بنا پر ملتوی کر دیا گیا۔ میرے لئے یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ اس لاتعلقی اور عدم تعاون کی صرف دو توجہیں کی جا سکتی تھیں۔ ایک یہ کہ یہاں کے لوگ بزدل اور بے غیرت ہیں، جو دراندازوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہوئے بھی انہیں کسی قسم کا تعاون دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ دوسری یہ کہ ریاستی حکومت اور مرکزی سرکار سے ناراضگی کے باوجود یہاں کے لوگ کسی غیر ملکی طاقت کے ہاتھوں میں کھلونا بننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ میرے ذہن نے اسی توجیہ کو قابل قبول سمجھ کر اسے ایک معنویت دینے کا فیصلہ کر لیا۔

دہلی، لکھنو، کلکتہ، حیدر آباد، پونا، بمبئی، جبل پور، بھوپال، اور گوالیار میں ہم نے بڑے بڑے پبلک جلسوں میں تقریریں کیں۔ ان تقریروں میں ہم

نے لوگوں کو بتایا کہ ۵ اگست سے لے کر اب تک کشمیر میں کیا کچھ ہوا۔ کس طرح محمد دین نام کے ایک گوجر نے دراندازوں کے متعلق پہلی اطلاع بہم پہنچائی۔ کس طرح غلام قادر ان کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا اور کس طرح کشمیر کے عوام نے پُرامن رہ کر پاکستانی منصوبے کو ناکام بنا دیا۔ اور یہ سب کچھ اس لئے نہیں ہوا کہ بھارت میں ہندو راج قائم ہو، یا ملک کے کچھ حصوں میں وقتاً فوقتاً جو فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں، ان میں اضافہ ہوتا رہے۔ بلکہ محمد دین اور غلام قادر نے اس لئے قربانیاں دی ہیں کہ بھارت کے سیکولرازم اور اس ملک کے آئین سے ان کا اعتماد ابھی اٹھا نہیں ہے۔ آپ لوگوں کو اس اعتماد اور اعتقاد کی قدر کرنا ہوگی اور ملک کو صحیح معنوں میں سیکولر ڈیموکریسی کا نمونہ بنانا ہوگا۔ جبل پور کے ایک بہت بڑے اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے میں نے کہا ''کہ کشمیر میں مائیں اپنے بچوں کو جبل پور کا نام لے کر ڈراتی ہیں۔ چند سال پہلے یہاں جو کچھ ہوا، اس نے ہمیں دشمنوں کی نظروں میں ذلیل کر دیا ہے۔ کشمیر کی ہزاروں مائیں اسی اندیشے میں مبتلا ہیں، کہ بھارت میں مسلمانوں کا وجود خطرے میں ہے۔ میری ماں اور محمد دین کی ماں بھی اسی خوف اور وہم کا شکار ہیں۔ آپ لوگوں کو انہیں اپنے کردار سے اس بات کا یقین دلانا ہوگا کہ ان کے اندیشے غلط اور بے بنیاد ہیں''۔ اس تقریر کا اتنا اچھا اثر ہوا کہ جلسہ گاہ میں بہت سی عورتیں آبدیدہ ہو گئیں۔ شام کو ایک مولانا سے ملاقات ہوئی، تو انہوں نے مجھے بتایا کہ آپ نے جس موثر طریقے پر اپنا پیغام سنایا ہے، اس کے لئے جبل پور کے مسلمان آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ غرض ہم جہاں بھی گئے، ہم نے صاف لفظوں میں یہ بات کہہ دی کہ کشمیر کا الحاق سیکولر ہندوستان سے ہوا ہے اور جب تک ہندوستان سیکولرازم

کے اصولوں پر قائم ہے، یہ تعلق ایک اٹل حقیقت بن کر رہے گا۔ لیکن ہندوستان میں فرقہ پرست قوتوں کا عروج اس تعلق کو کمزور بنا دے گا۔ بدقسمتی سے ہماری تقریروں اور بیانات کے صرف انہی حصوں کو ملک کے اخبارات میں شائع کیا گیا، جن میں ہم نے پاکستان کے عزائم اور ارادوں کو بے نقاب کیا اور ہمارے مشن کے اصلی مقصد کو وہ پبلسٹی نہیں ملی جس کا وہ مستحق تھا۔ لیکن سیاسی لیڈروں، اخبار نویسوں اور دانشوروں سے ملاقات کے دوران ہم نے مصلحتوں اور نزاکتوں سے کام لئے بغیر بڑے واضح اور صاف الفاظ میں اپنا نکتۂ نظر پیش کیا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بے پناہ مسرت ہو رہی ہے کہ پورے ملک میں سنجیدہ اور صاحب رائے اہل نظر کا ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو تنگ نظری اور ذہنی تعصب سے بالاتر رہ کر مسائل پر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ طبقہ بکھرا پڑا ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اکثر فرقہ پرستوں اور تنگ نظروں کے شور شرابے میں ان کی آواز دب کر رہ جاتی ہے۔ کشمیر میں رونما ہونے والے حالیہ واقعات نے ان قوتوں کو ابھرنے کا ایک سنہری موقع دیا ہے۔ کشمیر میں جو لوگ ہندوستان کو سیکولرازم اور جمہوریت کا آئینہ خانہ بنانے کے خواہشمند ہیں، ان کو ان قوتوں کے ساتھ رابطہ قائم کر کے ملک کی موجودہ فضا کو برقرار رکھنے میں اپنا حصہ ادا کرنا ہوگا۔ ہندوستان میں سیکولرازم اور فرقہ پرستی کے درمیان پچھلے اٹھارہ سال سے ایک زبردست جنگ جاری ہے۔ حالیہ واقعات نے سیکولرازم کی کامیابی اور فتح مندی کے امکانات روشن کر دئے ہیں۔ فرقہ پرستی پر آخری وار کرنے کے لئے ہم سب کو منظم ہو جانا چاہئے اور یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ کشمیر کا باشعور طبقہ اس جنگ میں ہراول دستے کا کام کرسکتا ہے۔ اپنے حالیہ دورے کی کامیابی سے مجھے اس بات کا یقین ہو گیا

ہے کہ اگر کشمیر کی موجودہ صورتحال کو ہندوستان میں سیکولرازم کی فضا تعمیر کرنے میں صحیح طور پر استعمال کیا جا سکے تو ملک کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوسکتا ہے ہندوستانی مسلمانوں نے جس بے جگری اور بہادری سے پاکستانی حملے کا مقابلہ کیا ہے اس سے ان لوگوں کے منہ بند ہو گئے ہیں، جو صبح سے شام تک ان کی وفاداری پر شک کرنے کے شغل میں مصروف رہا کرتے تھے۔ ملک کی عزت اور سالمیت بچانے کے لئے آج ہندوستان کا مسلمان اپنے ہم وطنوں میں کسی سے بھی پیچھے نہیں ہے۔ حالیہ جنگ کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ جن سنگھ اور اس قبیل کی فرقہ پرست جماعتوں کا بے بنیاد پروپا گنڈا بے اثر اور غلط ثابت ہو گیا ہے۔ ہندوستانی مسلمان نے اپنے خون سے اپنی وفاداری پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ لیکن اس فضا اور اس تاثر کو پائیدار بنانے کے لئے ایک منظّم جدو جہد شروع کی جانی چاہئے۔ کیونکہ اس بات کا اندیشہ موجود ہے کہ ملک کی فرقہ پرست قوتیں اس جنگ میں حاصل شدہ تمام کامیابیوں کو اپنے کھاتے میں لکھوا کر اپنی کھوئی ہوئی ساکھ بحال کرنے کی کوششیں کریں۔ ہمیں بہت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔

انصاف کے تقاضے

ہمارے عدلیہ کے تمام تر نظام کی بنیاد اس حقیقت پر قائم ہے کہ انصاف کا مقصد گناہ گار کو سزا دینے سے زیادہ بے گناہ کو ناکردہ گناہوں کی سزا سے محفوظ رکھنا ہے۔ انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر دس گناہ گار اپنے جرائم کی سزا سے بچ نکلیں تو یہ بہت بڑی انصافی ہوگی، لیکن اگر ایک بے گناہ کو ناکردہ گناہوں کی سزا مل جائے تو یہ ایک ناقابلِ معافی جُرم ہے۔ موجودہ قانونی نظام کے متعلق شکایت یہ ہے کہ یہ اتنا پیچیدہ اور گراں ہے کہ انصاف حاصل کرنا تقریباً مشکل ہو گیا ہے۔ اس ساری پیچیدگی کی تہہ میں بے گناہوں کی حفاظت اور مدافعت کا اصول کارفرما ہے۔ سرینگر اور وادی کے کچھ حصوں میں پچھلے دنوں جو گڑبڑ رہی، بدقسمتی سے اس میں انصاف کے اس بنیادی اصول کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ امن عامہ کو برقرار رکھنے اور ناپسندیدہ عناصر کی شرانگیزیوں کا قلع قمع کرنے کے لئے ہر حکومت کو یہ قانونی اور اخلاقی حق حاصل ہے کہ وہ سخت سے سخت کاروائی کرے اور کسی قیمت پر بھی چند ہُلڑ بازوں اور انتہا پسندوں کو شہریوں کی پُر امن زندگی درہم برہم کرنے کی اجازت نہ دے۔ لیکن بعض اوقات ہلڑ بازوں کا پیچھا کرتے ہوئے کچھ ایسے لوگوں کی مرمت بھی ہوئی جو خود شر پسندوں کی شرانگیزی سے نالاں تھے۔ امن

شکنی کرنے والوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتنی چاہئے۔ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جانا چاہئے، جو قانون میں ان کے لئے مخصوص ہے۔لیکن دو تین سو ہلڑ بازوں سے نپٹنے کے لئے سینکڑوں پُر امن شہریوں کو اذیت پہنچانا انصاف اور قانون کے تقاضوں کے منافی ہے۔اکثر ایسا ہوا ہے کہ اصلی مجرم قانون شکنی کر کے فرار ہو جاتا ہے اور بے گناہ لوگوں کو اس کی....حرکتوں کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔یہ صورت حال اس لحاظ سے پریشان کُن ہے کہ اس....ناانصافی کی یادیں ذہن سے محو کرنے میں بڑا...وقت لگتا ہے۔یہ ہنگامی دور ختم ہو جائے گا اور پاکستان کا خواب دیکھنے والے بیوقوفوں کی بہشت سے نکل کر ایک دن حقیقت کی...وادیوں میں آئیں گے۔لیکن ان تلخ یادوں کو بھلانے کے لئے ہمیں بہت کچھ کرنا ہوگا۔

یہ مضمون پہلے کا ہے، یہ تب کا ہے جب
مرحوم شوپیاں سے اسمبلی کے ممبر تھے

اعترافِ شکست

اس اخبار کے قارئین کو یاد ہوگا کہ فروری ۱۹۶۷ء کے انتخابی معرکے میں کامیابی کے بعد میں نے ''انتخابی جنگ'' کے عنوان سے اپنی اور علاقۂ شوپیان کے عوام کی اس جدوجہد کا مفصل احوال قلمبند کیا تھا کہ جس کے آگے کانگریسی حکمرانوں کی تمام سازشیں، سرکاری افسروں کی ان گنت بے ایمانیاں اور میرے مدِ مقابل خواجہ غلام حسن خان کا ہزاروں روپیہ بے کار ثابت ہوگیا۔ محبت اور عقیدت کے مظاہروں سے مسحور اور فتح و کامرانی کے نشے میں چور مجھے اس بات کا احساس ہی نہیں رہا کہ میں نے اپنے کندھوں پر کتنی عظیم ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھایا ہے۔ دن گزرتے گئے اور حقائق کی تلخیاں میری بصیرت میں اضافہ کرتی گئیں اور اڑھائی سال بعد میں نہایت سنجیدگی سے اس سوال پر غور کر رہا ہوں کہ مجھے مستعفی ہو کر اپنے ضمیر کو مطمئن کرنا چاہیئے یا اپنی بے سود جدوجہد کو جاری رکھ کر ان لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے، جنہوں نے مجھے منتخب کر کے مجھ سے کچھ توقعات وابستہ کی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں مجھے اپنی شکست کا باقاعدہ اعلان کر دینا چاہیئے یا نہیں؟

میں چراغ بیگ سے معذرت کر کے (کہ تیسرا صفحہ ان ہی کی ملکیت

ہے) آج آپ کو اس سوچ میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میرے کرم فرما، دوست احباب اور ''آئینہ'' کے قارئین مجھے اس ذہنی کش مکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے اپنے مفید مشوروں سے نوازیں گے! اسمبلی کی ممبری میرے لئے ذریعہ معاش یا غالبؔ کے الفاظ میں ذریعہ عزت نہ تھی۔ میں اپنے خاندانی پیشہ وکالت سے چھ سات سو روپے کمانے لگا تھا۔ تھوڑی سی محنت اور صبر سے کام لیتا تو ہزار روپے ماہوار کی آمدن ہونے میں کوئی مشکل درپیش نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں اپنے حال سے مطمئن نہ تھا، کیونکہ صرف پیسے کمانا میری زندگی کا منتہائے مقصود نہیں رہا ہے۔ پیسے کما کر میں زیادہ سے زیادہ اپنی اور اپنے بال بچوں کی نجات کا سامان کر سکتا تھا، اپنے گردوپیش کی دنیا کو بدل نہیں سکتا تھا، جبکہ اس کو بدلنے اور اُسے اپنے خوابوں کے مطابق ڈھالنے کی خواہش نے میرے دل میں اسی دن جنم لیا ہے کہ جب میرے شعور نے پہلی بار انگڑائی لی تھی۔ یہ خواہش میرے ساتھ ساتھ جوان ہوتی گئی اور جنوری ۶۷ میں اسی خواہش نے مجھے اسمبلی کا انتخاب لڑنے کے لئے مجبور کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ وکالت کے گوشۂ عافیت کی بجائے سیاست کے خارزار میں زیادہ مفید، فیصلہ کُن اور ہمہ گیر خدمات انجام دی جا سکتی ہیں اور میں زیادہ بہتر طور پر لوگوں کی خدمت کر سکوں گا۔ انتخاب کے لئے میری امیدواری کا اعلان ہوتے ہی بہت سے دوستوں نے طعنہ دیا کہ میں لیلیٰ اقتدار کی ہوس میں صحرائے سیاست کی خاک چھاننے نکلا ہوں۔ بہت سے دشمنوں نے مجھے اپنے راستے کا کانٹا سمجھ کر میری راہ میں کانٹے بچھا دیئے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ دوستوں کے اندیشے غلط ثابت ہو گئے ہیں اور دشمنوں کی سازشیں ناکام۔ اسمبلی ممبر کی حیثیت سے میری اڑھائی سالہ تاریخ اس بات کی

گواہ ہے کہ میں نے ایک بار بھی لیلائے اقتدار کو چھونے کی کوشش نہیں کی اور جس بات پر مجھے سب سے زیادہ فخر اور غرور کا احساس ہے وہ یہ ہے کہ اسے چھونے کی کبھی میرے دل میں خواہش بھی پیدا نہیں ہوئی۔ گزشتہ دواڑھائی سال کے دوران کئی بار ایسے مواقع آئے کہ میں اپنے فرض سے غافل ہو کر اونچے اونچے منصب حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میرے پائے استقلال میں ایک بار بھی لغزش نہیں آئی۔ لیکن اس کے باوجود میں اپنے حال سے مطمئن نہیں ہوں اور میں اسمبلی کی ممبری سے مستعفی ہو کر وکالت کے گوشۂ عافیت میں پناہ لینا چاہتا ہوں۔ مجھے اس بات کا شدید احساس ہے کہ میں ان لوگوں کی کوئی خدمت نہیں کر سکا ہوں کہ جنہوں نے حکومت کے ظلم وستم اور جبر وتشدد کا مقابلہ کر کے مجھے اس امید پر کامیاب بنایا تھا کہ میں ان کے زخموں پر مرہم رکھ سکوں گا۔ ان کے دُکھ درد کا علاج کر سکوں گا اور ان کی تاریک دُنیا میں تھوڑی سی روشنی پہونچا سکوں گا۔ انہوں نے مجھ سے جتنی توقعات وابستہ کی تھیں ان سب کا پورا ہونا تو ناممکن تھا لیکن ان میں سے کچھ پوری ہو جاتیں تو میں اپنے دل کو تسلی دیتا کہ کچھ تو ہو گیا، لیکن مجھے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے ندامت ہو رہی ہے کہ ان اڑھائی سال میں ان بے چاروں کی ایک بھی خواہش پوری نہیں ہوئی ہے۔ یہ نہیں کہ میں نے ان مظلوم اور بے زبان لوگوں کی ترجمانی کا حق ادا نہیں کیا۔ سرینگر اور جموں کے ایوانِ اسمبلی کے درودیوار گواہ ہیں کہ پچھلے بیس برسوں میں پہلی بار علاقہ شوپیان کی بھرپور ترجمانی کا فرض میں نے انجام دیا ہے۔ ایوان اقتدار میں شوپیان کے بھوکے، ننگے اور مفلوک الحال عوام کی آواز پہنچانے کی پاداش میں مجھے کئی بار اسمبلی کی ممبری سے محروم کرنے کی سازشیں کی گئیں۔ میرے اپنے حلقۂ انتخاب میں ایک

نائب وزیر کی موجودگی میں کانگریسی غنڈوں نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا۔ لیکن ہر سزا کے بعد میرا ذوقِ گناہ بڑھتا گیا اور میں نے پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ اپنے رائے دہندگان کی ترجمانی کا حق ادا کیا۔ لیکن وقت آ گیا ہے کہ میں اس حقیقت کا اعتراف کرلوں کہ میں نے صرف اپنا فرض پورا کیا ہے، عوام کے مطالبات اور ان کی توقعات کو پورا نہیں کیا ہے۔ میں نے ابھی تک صرف اپنے ضمیر، اپنے دل اور اپنے دماغ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے، ان لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش نہیں کی ہے کہ جو مجھے اپنا مسیحا سمجھ کر مجھ سے اپنے ہر دکھ درد کا علاج چاہتے ہیں۔ میں ان ہی لوگوں سے مخاطب ہو کر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے مقصد میں ناکام ہو گیا ہوں۔ مجھے زبردست شکست ہوئی ہے، میں آپ لوگوں کے لئے کچھ نہیں کر سکا ہوں اور مجھے اندیشہ ہے کہ میں آئندہ اڑھائی سال کے دوران بھی کچھ نہ کر سکوں گا۔ میں نے آپ لوگوں کی خاطر راتوں کی نیند اور دن کا چین گنوایا، اپنی خودداری اور عزتِ نفس کو پامال کیا، وزیروں اور سرکاری افیسروں کی خوشامدیں کیں، اُن آستانوں پر جبہ سائی کی کہ جن کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی مجھے گوارہ نہ تھا۔ لیکن یہ سب بے سود ثابت ہوا ہے۔ اس حکومت کی آنکھیں اندھی، کان بہرے، اس کا ضمیر مردہ اور اس کی روح بیمار ہے۔ یہ اپنے وجود کی کشمکش میں کچھ اس طرح گرفتار ہے کہ اسے عوام کے مسائل اور ان کے مصائب کا احساس ہی نہیں۔ عوام کے ساتھ اس کا واحد رابطہ سی، آئی، ڈی کے ذریعہ قائم ہے اور جو کچھ سی آئی ڈی کے آفیسر کہتے ہیں، حاکمان وقت کے لئے وہ پتھر کی لکیر ہے۔ میں کئی بار سوچتا ہوں کہ اسمبلی ممبر بننے کی بجائے میں نے سی آئی ڈی میں نوکری کی ہوتی تو لوگوں کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو سکتا تھا۔

ہر روز علاقہ شوپیان کے سینکڑوں لوگ میرے پاس چھوٹے چھوٹے مسائل لے کر آتے ہیں۔ ان میں سے نوے فیصد مسائل حکومت اور اہلکاران حکومت کی ذرا سی توجہ سے حل ہو سکتے تھے، لیکن یہ مسئلے برسوں سے اسی طرح پڑے ہوئے ہیں اور کسی کو ان کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں۔ وزیروں کے پاس فریاد لے کر جاؤ تو وہ وعدہ کر کے ٹال دیتے ہیں۔ افسروں سے کہہ دو تو وہ اپنی بے پناہ مصروفیت کا عذرِ لنگ تراشتے ہیں۔ نہ وزیر کبھی اپنا وعدہ پورا کرتا ہے اور نہ آفیسر کو کبھی فرصت ملتی ہے اور نتیجہ یہ کہ عوامی مسائل کا انبار لگا رہتا ہے اور عوام یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ہمارے ممبر اسمبلی نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے پچھلے ایک سال سے اپنے حلقہ انتخاب کا دورہ نہیں کیا ہے۔ جان بوجھ کر نہیں کیا ہے، اس لئے کہ وہاں لوگ یہ پوچھیں گے کہ اس مسئلے کا کیا ہوا اور اس مسئلے کا کیا ہوگا اور میرے پاس نہ اس کا کوئی جواب ہے اور نہ اس کا..... اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ ممبر اسمبلی اور اخبار نویس ہونے کے ناطے مجھے صادق صاحب تک رسائی حاصل ہوگی اور میں ان تک مصیبت زدوں کی آواز پہنچا سکتا ہوں، جبکہ صادق صاحب اتنی ''اونچی'' سیاست میں مصروف ہیں کہ ان سے مہینے میں اور کبھی کبھی دو مہینوں میں ایک بار ملاقات ہوتی ہے۔ مختصر سی ملاقات کے دران جتنے بھی مسائل پر گفتگو کرنے کا موقعہ ملتا ہے ان میں سے آدھے مسائل تو رخصت ہوتے ہوتے ان کے ذہن سے اتر جاتے ہیں اور باقی مسائل ان کے لئے اتنے معمولی اور غیر اہم ہوتے ہیں کہ وہ ان کو در خود اعتنا نہیں سمجھتے اور پھر صادق صاحب سے ملنا اتنا دشوار ہے کہ اس ایک ملاقات کے لئے بھی ان کے ''دربانوں'' کی خوشامد کرنا پڑتی ہے۔ اس پریشان کن صورت حال کا صرف ایک علاج ممکن تھا اور وہ یہ کہ اس حکومت کو

بدل کر ایک ایسی حکومت قائم کی جائے کہ جو حساس ہو، متحرک ہو اور فعال ہو لیکن مستقبل قریب میں اس نکمی حکومت کا خاتمہ ممکن نہیں۔ اس لئے میں بڑی سنجیدگی سے یہ سوچنے لگا ہوں کہ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے اسمبلی کی ممبری سے استعفیٰ۔ آپ کہیں گے یہ تو فرار اور شکست خوردگی کا راستہ ہے۔ میں آپ سے متفق ہوں، لیکن آپ ہی کہیئے کہ اس بے مقصد اور بے سود جدوجہد کا فائدہ کیا کہ جس میں عوام آپ سے اس لئے بدظن ہیں کہ آپ ان کے لئے کچھ نہیں کرتے اور حکومت اتنی نا اہل اور بے حس کہ آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ شوپیان کے لوگ مجھ سے بدظن ہیں کہ میں نے ان کا کوئی مسئلہ حل نہیں کیا۔ ان میں سے اکثر لوگ مجھے یہ مشورہ دیتے ہیں کہ کانگریس میں شامل ہو کر حکومت کو خوش کرو تو ہمارے سب مسئلے حل ہو جائیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ جو کانگریس میں شامل ہیں، انہوں نے کون سے تیر مارے ہیں؟ زیادہ سے زیادہ اپنی نجات کا سامان کر لیا ہے۔ میں صرف اپنی نجات نہیں چاہتا، تم لوگوں کی نجات بھی چاہتا ہوں اور وہ تب تک ممکن نہیں جب تک یہ ناکارہ انظام بدل نہ جائے ان حالات میں مجھے فرار کا راستہ سب سے زیادہ باعزت اور باوقار راستہ نظر آتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

۳۰ نومبر ۱۹۶۵ء

اعترافِ شکست

پچھلے دنوں پارلیمنٹ میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے نام سے ہندو کا لفظ خارج کرنے کے بل پر جو بحث ہوئی اور اسے جن حالات میں کوئی فیصلہ لئے بغیر مزید غور وفکر کے لئے ملتوی کر دیا گیا، اُس سے بیک وقت کئی باتیں ثابت ہو جاتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ ملک میں آج بھی فرقہ پرستوں اور تنگ نظروں کا سکہ چلتا ہے اور پارلیمنٹ میں کانگریس کی اکثریت کے باوجود وہی ہوتا ہے جو جن سنگھ یا اس قبیل کی دوسری جماعتیں چاہتی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ وزیر تعلیم کریم بھائی چھاگلہ جو مسلم فرقہ پرستی کے خلاف جہاد کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں، ہندو فرقہ پرستی کے سامنے ہتھیار ڈالنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتے۔ تیسری بات یہ کہ ہماری حکومت دنیا بھر کو ناراض کرنے کا حوصلہ تو رکھتی ہے لیکن اپنے ملک میں فرقہ پرستوں کا دل رکھنے کے لئے اپنی بنیادی پالیسیوں سے انحراف کرنے کے لئے بھی تیار ہے۔ پارلیمنٹ میں اس بل پر بحث کے دوران یہ بات ثابت ہوگئی کہ اگر حکومت بنارس یونیورسٹی کے طالب علموں کی ہنگامی آرائیوں سے ہراساں اور خوف زدہ ہو کر بل پر بحث ملتوی نہ کرتی، تو یہ بل خاصی اکثریت سے پاس ہو جاتا اور اس طرح حکومت کو ایک مناسب سمت میں آگے بڑھنے کا بہترین موقع ہاتھ آجاتا۔ لیکن پاکستان کو منہ توڑ شکست دینے والی سرکار نے بڑی بدحواسی کے عالم میں فرقہ پرست طالب

علموں اور سیاسی جماعتوں کے سامنے گھٹنے ٹیک کر اپنے وقار کو خاک میں ملا دیا۔ ابھی چند ماہ پہلے علی گڈھ یونیورسٹی کے سلسلے میں حکومت نے جو سخت رویہ اپنایا تھا، اس کے پیش نظر جائز طور پر یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ حکومت تعلیمی اداروں سے فرقہ پرستی کا خاتمہ کرنے کے لئے جرأت مندانہ اقدامات کرے گی اور یونیورسٹیوں کے نام سے ''ہندو'' اور ''مسلم'' کو خارج کر کے اس عمل کی ابتداء کی جائے گی، لیکن بنارس یونیورسٹی کا نام بدلنے کے سوال پر حکومت نے جس بے کسی اور بے بسی کا مظاہرہ کیا ہے، اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ موجودہ حکومت میں فرقہ پرستوں سے ٹکر لینے کی ہمت نہیں ہے یا کم از کم ہندو فرقہ پرستوں کے مقابلے کی تاب نہیں۔ یہ اگر علی گڑھ یونیورسٹی سے مسلم کا لفظ نکالنے کا سوال ہوتا، تو چھاگلہ صاحب اور ان کی حکومت زمین و آسمان کے قلابے ملا کر یہ ثابت کر دیتے کہ مسلم کا لفظ خارج کرتے ہی سیکولرازم کی بنیادیں مضبوط ہو جائیں گی۔ لیکن جب بنارس یونیورسٹی سے ہندو کا لفظ نکالنے کی تجویز زیر غور آئی تو چھاگلہ صاحب نے اعلان کیا کہ حکومت کی اس سلسلے میں اپنی کوئی پالیسی نہیں ہے اور ممبروں کو اپنی مرضی کے مطابق ووٹ دینے کا حق ہے۔ مسلمان علی گڑھ سے مسلم کا لفظ نکالنے کے خلاف احتجاج کریں تو بات سمجھ میں آسکتی ہے کیونکہ اقلیت ہونے کے ناطے وہ کچھ اصل اور فرضی اندیشیوں کا شکار ہیں لیکن ہندوستان کی اکثریت بھی ایک یونیورسٹی کے ساتھ ہندو کا لفظ وابستہ رکھنے پر بضد ہو یہ بات ذرا مشکل میں سمجھ میں آتی ہے اور پھر اکثریت کی نمائندگی کا حق پارلیمنٹ کے منتخب ممبران کو نہیں بلکہ بنارس یونیورسٹی میں ہلڑ بازی کرنے والے تین چار ہزار طالب علموں کو دیا گیا۔ یہ جمہوریت نہیں، مذاق ہے، یہ سیکولرزم نہیں... سیکولرزم کی توہین ہے۔ اولاً

بنارس یونیورسٹی کا نام بدلنے کے لئے الگ طور سے بل پر بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ تمام فرقہ وارانہ نام رکھنے والے تعلیمی اداروں کے نام بدلنے کے لئے ایک بل پیش کیا جانا چاہیئے تھا، تاکہ کسی کو امتیاز یا تخصیص کی شکایت کا موقع نہ ملے اور پھر جب حکومت نے ایک ابتداء کر ہی لی تھی تو اسے اپنے موقف پر ڈٹ جانا چاہیئے تھا۔ حکومت کی شکست نے فرقہ پرستوں کے حوصلے بلند کر دیئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بل پر غور وخوض ملتوی ہونے کے باوجود بنارس یونیورسٹی کے طالب علم برابر ایجی ٹیشن کر رہے ہیں کہ جب تک بل کو قطعی طور پر ختم نہ کر دیا جائے، وہ خاموش نہ بیٹھیں گے۔

طلباء میں ڈسپلن کی کمی کی شکایات اکثر اعلیٰ ترین سطح پر کی جاتی ہیں۔ بنارس یونیورسٹی میں حالیہ ایجی ٹیشن کے پیش نظر نام بدلنے کے بل کو ملتوی کر کے ہم نے طلباء پر یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ہلڑ بازی اور ہنگامہ آرائی بڑی سودمند چیز ہے۔

۱۵ دسمبر ۱۹۶۵ء

فریبِ تاشقند

۴ جنوری ۱۹۶۶ء کو تاشقند میں وزیر اعظم لال بہادر شاستری اور صدر محمد ایوب خان کے درمیان ہونے والی بات چیت نئے سال کا ایک خوش گوار تحفہ ہے اس بات چیت کے نتائج کیا ہوں گے اور اس سے ہندوستان اور پاکستان کی کشمکش میں کس حد تک کمی ہو سکتی ہے، اس کے بارے میں اس مرحلے پر کچھ کہنا قبل از وقت ہو گا لیکن بات چیت ہونا بجائے خود ایک بہت بڑی بات ہے اور قطع نظر اس کے کہ اس سے کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد ہو گا یا نہیں دونوں لیڈروں کا ایک جگہ مل بیٹھنا موجودہ تعطل اور بحران کو دور کرنے کی طرف ایک اہم قدم ہے اور اس کے لئے سودیت روس کے وزیر اعظم مسٹر کوسی جن مبارک باد کے مستحق ہیں، اگر اس بات چیت کا صرف یہی نتیجہ نکلے کہ ہندوستان اور پاکستان میں، جو حالیہ جنگ کے بعد ایک دوسرے سے ترکِ موالات کے ہوئے ہیں، بول، چال بحال ہو جائے تو یہ برصغیر میں کھچاؤ کم کرنے کی ایک مستحسن کوشش ہو گی۔ جن لوگوں نے اس بات چیت سے بہت زیادہ تعلقات وابستہ کی ہیں، انہیں اپنے آپ کو ابھی سے مایوسی اور نا اُمیدی کے لئے تیار کرنا چاہئے، کیونکہ سودیت روس کی نیک نیتی اور خیر سگالی کے

باوجود بات چیت کی کامیابی کا انحصار وزیراعظم شاستری اور صدر ایوب کے ذہنی رویے پر ہے، اور بدقسمتی سے یہ رویہ مسائل کو حل کرنے کے لئے سازگار نہیں ہے۔ وزیراعظم شاستری نے تاشقند میں صدر ایوب سے ملاقات کی روسی درخواست کو بادلِ ناخواستہ قبول کرلیا ہے۔ ان کے خیال میں پاکستان نیک نیتی اور ایمانداری سے باعزت سمجھوتے کے لئے تیار نہیں ہے کیونکہ جنگ بندی کے بعد بھی وہ مسائل کو فوجی طاقت کے بل بوتے پر حل کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر وزیراعظم نے صدر ایوب سے بات چیت کرنے پر رضامندی ظاہر کی ہے، تو اس کی وجہ بات چیت کی کامیابی کے امکانات نہیں، بلکہ روسی حکومت کا اصرار ہے۔ اس کے ساتھ ہی وزیراعظم نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ بات چیت صرف اس بنیاد پر ہو سکتی ہے، کہ کشمیر ہندوستان کا ناقابلِ تنسیخ حصہ ہے اور اسے کسی سودابازی کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ وزیراعظم نے جس شدت اور وضاحت کے ساتھ اپنے اس موقف کو دہرایا ہے، اس کے پیش نظر تاشقند میں ہونے والی بات چیت کی بظاہر کوئی ضرورت نہیں رہتی، اس کے بعد بھی اگر روسی حکومت اس بات کے لئے کوشاں ہے کہ دونوں لیڈروں میں ملاقات ہو جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ روسی لیڈروں کے نزدیک بھی بات چیت کا مقصد مسائل کو حل کرنے سے زیادہ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنا ہے۔ اسی لئے روسی حکومت کی طرف سے جاری کردہ اعلانیہ میں کہا گیا ہے کہ بات چیت کے دوران وزیراعظم کوسی جن بھی تاشقند میں موجود رہیں گے۔ ہندوستان اور پاکستان کے لیڈروں کے درمیان مفاہمت اور مصالحت کی روسی کوششوں کا برصغیر میں بہت خوش گوار ردِعمل ہوا ہے اور اگر اس بات چیت سے دونوں

ملکوں کے تعلقات بہتر ہو گئے، تو ایشیا بھر میں روس کی عزت اور وقار میں خاطر خواہ اضافہ ہو گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ روس دونوں لیڈروں کے متضاد اور متوازی نظریات کو ہم آہنگ کرنے میں کہاں تک کامیاب ہو سکتا ہے؟ صدر ایوب کے لئے روس کی پیش کش ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی ہے۔ کیونکہ انہوں نے تاشقند کی بات چیت کو پاکستان کے عوام کے سامنے ایک نفسیاتی سہارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ فوجی طاقت سے کشمیر کو حاصل کرنے کے منصوبے کی ناکامی کے بعد پاکستان میں ان کے وقار کو شدید نقصان پہنچا ہے اور ان کے لئے تاشقند کی بات چیت اپنے وقار کو بحال کرنے کا ایک بہترین موقع ہے۔ اس کے مقابلے میں پاکستان سے حالیہ کش مکش کے بعد ہندوستان میں لال بہادر شاستری کا وقار کئی گنا بڑھ گیا ہے۔ ان کی پوزیشن بے حد مستحکم ہو گئی ہے۔ تاشقند میں صدر ایوب سے بات چیت کی روسی درخواست کو قبول کر کے انہوں نے کسی حد تک ملک کے انتہا پسند طبقے کو مایوس کر دیا ہے۔ اس طرح ان کے لئے تاشقند میں پاکستان کو کسی قسم کی رعایت دینے کے لئے ملک کی فضا کسی طور بھی سازگار نہیں ہے۔ ان حالات میں بات چیت کے نتائج کے متعلق کسی خوش فہمی میں مبتلا رہنا خود فریبی کے مترادف ہے۔ لیکن یہ امر باعث اطمینان ہے کہ دونوں ملکوں کے سربراہ حالیہ جنگ کی تباہ کاریوں کے بعد پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے مل رہے ہیں، اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس بے مقصد جنگ کے تباہ کن نتائج کی روشنی میں وہ ایک دوسرے کی مشکلات اور مجبوریوں کو بہتر طور سمجھ سکیں۔ پاکستانی صدر کا بات چیت کی پیش کش کو غیر مشروط طور پر قبول کرنا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اپنی تازہ مہم پسندی کے عبرت ناک انجام کے بعد باہمی مفاہمت اور مصالحت پر ان کا

اعتماد بحال ہو گیا ہے۔ صدر جانسن سے اپنی ملاقات کے بعد صدر ایوب غالباً زیادہ حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کریں گے، کیونکہ وہ جو توقعات لے کر صدر امریکہ کی بارگاہ میں گئے تھے، وہ پوری نہیں ہوئی ہیں۔ ان کی اس ناکامی نے تاشقند کانفرنس کی اہمیت کو اور زیادہ بڑھا دیا ہے۔

۳۱ر جنوری ۱۹۶۶ء

چراغِ تاشقند

اعلانِ تاشقند نے جہاں برصغیر کے کروڑوں عوام کے دلوں میں اُمیدوار ایقان کی شمعیں روشن کی ہیں، وہاں شروفساد کے ان پجاریوں کی آنکھوں کا نور بھی چھین لیا ہے جو دونوں ملکوں کی باہمی نفرت اور بیزاری کو مالِ تجارت بنا کر اپنے لئے رنگ محل تیار کرتے آئے ہیں۔ اس اعلان سے بجا طور انہیں اپنی تجارت کا بھیانک انجام نظر آنے لگا ہے اور اسی لئے وہ معاہدہ تاشقند پر دستخط ہو جانے کے فوراً بعد سے ہی اس کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ تاشقند میں لال بہادر شاستری کی عظیم الشان ڈرامائی موت۔ نے اگرچہ ہندوستان کے رجعت پسندوں کو فوری طور پر معاہدہ کے تئیں اپنی بیزاری کا اظہار کرنے سے محروم کر دیا لیکن جوں جوں وقت گذرتا جا رہا ہے، فرقہ پرستی اور تنگ نظری کی قوتیں اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات کے تحفظ کے لئے تاریخ کے سیل بے پناہ کو روکنے کے لئے متحد ہو رہی ہیں۔ معاہدۂ تاشقند کو شکست اور فتح کے پیمانوں سے ناپا جانے لگا ہے۔ مریض قوم پرستی کی آڑ میں اس تاریخی پسِ منظر کو نظر انداز کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، جو معاہدے کا جزو لاینفک ہے۔ جذباتی نعروں اور کھوکھلی جذبایت کا سہارا لے کر عوام کو گمراہ

کرنے کی منظّم سازشیں کی جارہی ہیں۔ ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے بیسوھویں صدی کی سب سے مقدس دستاویز... اعلان تاشقند......کو موجودہ قیادت کی سب سے بڑی کامیابی قرار دیئے جانے کی بجائے اسے شکست دہزیمت کا پیش نامہ ثابت کرنے پر زور دیا جارہا ہے۔ یہی حال پاکستان میں بھی ہے۔ وہاں بھی تنگ نظر اور ناعاقبت اندیش مُلاؤں نے ایک قیامت برپا کردی ہے۔ اپنی محرومیوں کا انتقام لینے کے لئے وہاں کے شکست خوردہ سیاستدانوں نے بھی معاہدہ تاشقند کو بنیاد بنا کر صدر ایوب کے خلاف متحدہ محاذ بنالیا ہے اور افسوس اس بات کا ہے کہ برخود غلط سیاستدانوں کا یہ طبقہ طلباء کو اپنے جال میں پھنسانے میں کسی حد تک کامیاب ہوگیا ہے۔ صورتِ حال اگرچہ اب قابو میں ہے لیکن امن اور آشتی کے دشمن معاہدہ تاشقند کی روح کو مجروح کرنے کی تاک میں لگے ہوئے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ہندوستان کی نئی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے معاہدہ تاشقندہ پر حرف بحرف عمل درآمد کرنے کا اعلان کردیا ہے۔ پاکستان کی طرف سے بھی اسی قسم کی یقین دہانی کی گئی ہے بلکہ معاہدے پر فوری عمل درآمد کے نتیجے کے طور پر دونوں ملکوں میں سفارتی تعلقات بحال کرنے اور فوجوں کو پیچھے ہٹائے جانے کا کام بھی شروع ہوگیا ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان جنگ کی ہولناکیوں کے بعد موجودہ خوشگوار فضا معاہدۂ تاشقند کی دین ہے، اور جوں جوں معاہدے کی مختلف شقوں پر عمل درآمد ہوتا جائے گا، دوستی، مفاہمت اور بھائی چارے کی قابلِ رشک فضا تعمیر ہوتی رہے گی۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ دونوں ملکوں میں اس معاہدے کے خلاف مفادِ خصوصی سے تعلق رکھنے والے لوگ برسرِ پیکار ہیں، نفرت، تباہی اور بربادی کے ان تاجروں کے خلاف ہمیں

ابھی سے منظّم ہو جانا چاہئے۔ ملک کی تمام ترقی پسند امن پسند، اور تعمیر پسند قوتوں کو مشترکہ طور ایسے عناصر کا مقابلہ کرنا ہوگا جو اپنے جھوٹے غرور کی آسودگی اور اپنے حقیر مفادات کے تحفظ کے لئے خرمنِ امن میں ایک بار پھر آگ لگانا چاہتے ہیں جو ہماری مسجدوں، مندروں اور گرداواروں کو جنگ کے الاؤ میں بھسم کر دینا چاہتے ہیں، ہماری راتوں کی نیندیں اڑا کر انہیں بازاروں میں بیچنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حالیہ جنگ میں آرام دہ خندقوں میں بیٹھ کر اپنی عیاشی کا کاروبار جاری رکھے ہوئے تھے۔ جو ہمارے بہادروں کے کارناموں کو اپنی شہرت بڑھانے کے لئے نیلام کرتے رہے جن کا اس جنگ میں ایک بھی عزیز نہیں مارا گیا، جنہیں ایک دن کے لئے بھی فاقہ نہیں کرنا پڑا۔ جنگ ان کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی، جس کا سہارا لے کر یہ اپنی تجوریوں کا شکم بھرتے رہے، ان لوگوں کو بھلا امن اور دوستی کی فضائیں کیوں کر راس آئیں گی اور اسی لئے امن وسکون کے ان قزاقوں کے مذموم ارادوں کو ناکام بنانے کے لئے ہمیں ابھی سے متحد ہو جانا چاہئے۔ خوش قسمتی سے برصغیر کے کروڑں عوام اس جدوجہد میں ہمارے ساتھ ہیں۔ زخمی مسجدوں، مجروح مندروں اور خاک وخون میں لتھڑے ہوئے کلیساؤں کی دعائیں ہمارے ساتھ ہیں، یتیم بچوں کی آرزوئیں اور بیوہ ماؤں کی آنکھوں میں پوشیدہ غم ہمارے ساتھ ہیں۔ بموں اور توپوں کی آگ سے جھلسی ہوئی زمین کے سینے کا درد ہمارے ساتھ ہے۔ دعاؤں، مرادوں، تمناؤں اور حسرتوں کا یہ قافلہ ساتھ لے کر ہم کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ شرط صرف یہ ہے کہ ہم دشمن کو تیار ہونے کا موقع ابھی نہ دیں اور ابھی سے عوام کو اس کے خوفناک ارادوں اور شرمناک مقاصد سے آگاہ کر دیں۔ اس مقصد کے لئے ہمیں بڑے بڑے شہروں کے علاوہ دور

دراز دیہات میں بسنے والے کروڑوں لوگوں کو معاہدۂ تاشقند کی اہمیت، اس کے تاریخی پسِ منظر اور اس پر عمل درآمد کے لاتعداد فوائد سے آگاہ کرنا ہوگا۔ ہمیں فرقہ پرستوں کے شرانگیز پروپیگنڈے کی قلعی کھول کر اُنہیں دنیا کے سامنے اپنے اصلی روپ میں پیش کرنا ہوگا اور یہ کام صرف ملک کی سرکار یا کانگریس اکیلے نہیں کرسکتی۔ موجودہ حکومت یا کانگریس سے اختلافات اپنی جگہ پر قائم رہیں گے۔ لیکن معاہدۂ تاشقند چونکہ برصغیر کے کروڑوں عوام کی دعاؤں کا حاصل ہے اس لئے اس کے تقدس کو برقرار رکھنے کے لئے ہمیں سرکار سے مکمل تعاون کرنا ہوگا۔ جس معاہدے پر لال بہادر شاستری نے اپنی زندگی دے کر مہرِ تصدیق ثبت کردی ہے اسے چند فرقہ پرستوں اور جنگ بازوں کی خونی پیاس بجھانے کے لئے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا!۔

۳۱ر جنوری ۱۹۶۶ء

طالب علموں کی نظر بندی

جب آنے والا مورخ موجودہ حکومت کے خلاف فردِ جرم مرتب کرے گا تو اس میں نوعمر، کمسن اور نادان بچوں کی مسلسل نظر بندی کا الزام سرفہرست ہوگا۔ تہذیب، شائستگی اور جمہوریت کے نام پر برسرِ اقتدار آنے والی حکومت کے لئے یہ امر کتنا شرمناک ہے کہ اس کی جیلوں میں آج چار ماہ سے تین سو سے زائد طالب علم نظر بند ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ ان میں ۱۴ سے ۱۸ سال تک کے کم سِن نوعمر بچے بھی شامل ہیں۔ ہم طالب علم کی معصومیت اور بے گناہی کا واسطہ دے کر حکومت سے ان کی رہائی کا مطالبہ نہیں کرتے، کیونکہ ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ طالب علموں نے ہلڑ بازی اور ہنگامہ آرائی کر کے حکومت کو اس سخت اقدام پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن ہم حکومت کے سربراہوں کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ سزا کی شدت کا تعلق جرم کی نوعیت سے ہوتا ہے افراد کے نفسیاتی ردِ عمل سے نہیں، جن طالب علموں کے خلاف توڑ پھوڑ کی کاروائیوں میں حصہ لینے کے الزامات ہیں، ان کے خلاف باقاعدہ مقدمے چلائے جانے چاہیں، اور انہیں مناسب سزا دی جانی چاہیئے، لیکن اسکا کیا کہیئے کہ اکثر طالب علموں کو تقریر کرنے، نعرے دینے یا جلوس میں

شرکت کرنے کی پاداش میں نظر بند رکھا گیا ہے۔ ان جرائم کے لئے مہینے
ڈیڑھ مہینے کی نظر بندی کافی تھی۔ لیکن حکومت انصاف اور شائستگی کے تقاضوں
کو بالائے طاق رکھ کر انتقامی کاروائی پر اتر آئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ریاست
میں مکمل امن وامان قائم ہونے کے بعد بھی ان طالب علموں کو رہا نہیں کیا
جاتا۔ ناپختہ اور کمسن بچوں کو سیاسی لیڈروں اور کارکنوں کی سطح پر نہیں رکھا
جاسکتا۔ اپنی ذہنی ساخت اور ناتجربہ کاری کی بنا پر ان سے اس تدبر اور دُور
اندیشی کی توقع نہیں رکھی جاسکتی، جس کی عدم موجودگی نے انہیں بعض...
ناپسندیدہ سرگرمیوں میں حصہ لینے کی ترغیب دی۔ اکثر بچے سیاسی جماعتوں
کے آلہ کار بن گئے۔ بعض یہ جانے بغیر کہ ان کی منزل کیا ہے، ہنگاموں میں
شریک ہوگئے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو ماحول کی یکسانیت اور بے رنگی سے تنگ
آکر زندگی میں کوئی ہل چل چاہتے تھے، اور چند ایک تو ایسے بھی ہیں، جنہیں
صرف اس لئے محبوس رکھ دیا گیا ہے کہ کسی سراغرساں کو ان کے کسی عزیز کا
کوئی پرانا قرضہ چکانا تھا۔ بہر حال، وجوہات کچھ بھی ہوں، سزا کی شدت اور
جرم کی نوعیت کے ساتھ ساتھ مجرم کی عمر اور اس کی ذہنی سطح کو بھی مدنظر رکھنا
چاہئے۔ لیکن صادق صاحب کی مہذب دورِ حکومت میں ایسا بھی ہوا ہے کہ
کچھ کم سن بچوں کو پولیس کی گاڑیوں میں جیل لے جاتے ہوئے اس قدر پیٹا
گیا کہ آج تین ماہ بعد بھی ان کے زخم مندمل نہیں ہوسکے ہیں۔ ہم جانتے ہیں
کہ صادق صاحب کو اس کا علم نہیں ہے لیکن ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ انہیں اس
بات کا علم کیوں نہیں؟ ان کی لاعلمی انہیں اس سانحے کی اخلاقی ذمہ داری سے
آزاد نہیں کرسکتی۔ ہم ایسے تمام واقعات کی چھان بین کا مطالبہ کرتے ہیں
جہاں کمسِن اور معصوم بچوں کو نہایت بے کسی اور بے بسی کی حالت میں

زدوکوب کیا گیا یا انہیں جسمانی اذیتیں دی گئیں۔

خوش قسمتی کی بات ہے کہ اربابِ اقتدار میں سبھی صاحبِ اولاد ہیں۔ وہ اگر لمحہ بھر کے لئے اپنے سیاسی منصب اور ذاتی مفادات کو بھول کر غور کریں، تو انہیں اس بات کا احساس ہوگا، کہ ان کے اپنے بچے ان بچوں سے مختلف نہیں ہیں، جو آج جیل خانوں میں نظر بند ہیں، ان کے اپنے بچوں سے بھی غلطیاں ہوئی ہیں اور بچوں کی غلطیوں کو انتقامی کاروائی کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ جیل خانوں میں نظر بند بچوں کے تعلیمی کردار تباہ ہو گئے ہیں، ان کے گھروں کا صبر وسکون لُٹ گیا ہے اور چار سو گھروں میں حکومت کے خلاف شدید نفرت اور بیزاری کا لاوا پک رہا ہے۔ نظر بند طالب علم بھی جیل کی صعوبتیں برداشت کرتے کرتے ''سخت'' ہو جائیں گے، اور پھر ان کا علاج بھی ممکن نہ ہوگا بہتر یہی ہے کہ نظر بند طالب علموں کو رہا کر کے حکومت ان تلخ یادوں کو بھلانے کی کوشش کرے، جو اس کے وجود سے وابستہ ہیں۔

۸؍مارچ ۱۹۶۶ء

بخشی صاحب کی مراجعت

کچھ عرصہ سے ریاست کے سابق وزیر اعظم بخشی غلام محمد کے دوبارہ سیاست میں داخل ہونے کی خبریں کچھ اس طرح اُڑائی جارہی ہیں، کہ جیسے وہ واقعی اس سے پہلے سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے، سیاست دانوں کا سیاست سے کنارہ کش ہونے کا فیصلہ بھی سیاسی جنگ کے داوٗ پیچ میں شمار ہوتا ہے۔ اس کنارہ کشی کو حرف آکر سمجھنا ''سیاسی شعور'' کی ناپختگی اور جنگ زرگری کے اصولوں سے ناواقفیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے پہلے شری جے پرکاش نرائن، اور ماسٹر تارا سنگھ بھی سیاست سے ''توبہ'' کر چکے تھے۔ لیکن اب تک وہ اتنی مرتبہ ''توبہ کو توڑ تاڑ کر'' پامال کر چکے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان کی توبہ جام شکن ہے یا ان کا جام توبہ شکن۔ بخشی غلام محمد کی توبہ کسی داخلی انقلاب کی بجائے خارجی دباوٗ کا نتیجہ تھی اس لئے جونہی حالات نے کروٹ بدلی اور دباوٗ کم ہونے لگا، انہیں اپنی حکمت عملی پر از سرِ نو غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ آج سے ایک سال قبل جب بخشی غلام محمد نے سیاست سے ریٹائر ہونے کا فیصلہ کیا تو ہم نے اسے ایک دانش مندانہ فیصلہ قرار دیا تھا۔ اس وقت ان کی سیاسی زندگی ایک ایسے نازک دور سے گذر رہی تھی کہ ان کے لئے

سیاست سے کنارہ کشی سے بہتر کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ ائینگر کمیشن کے سامنے ملزم کی حیثیت سے کھڑے تھے، ان کا کوئی سیاسی پروگرام نہیں تھا۔ ان کے مقاصد غیر واضح اور ان کی منزل غیر مُعین تھی، مرکز میں ان کی عزت وتوقیر تو کیا ان کا وجود بھی مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اگر چہ ''جان نثاروں'' کی ایک خاصی تعداد ان کے ساتھ تھی، لیکن بحثیت مجموعی تنظیم اور لیجسلیچر پر ان کی گرفت کمزور پڑ چکی تھی۔ اقتدار کے جادو سے قائم کیا ہوا ان کی شخصیت کا طلسم ٹوٹتا جارہا تھا اور اس پر طُرّہ یہ کہ ان کی جسمانی صحت پریشان کُن حد تک گر چکی تھی۔ ان حالات میں سیاست سے علاحدگی کا فیصلہ کر کے انہوں نے کم سے کم مزاحمت کا راستہ اپنانے کی کوشش کی۔ اگر چہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے سیاسی مخالفین نے کبھی بھی ان کے اس فیصلے کو سنجیدگی سے قبول نہیں کیا۔ بخشی صاحب کے تازہ اعلان نے ان کے اندازے اور اندیشے صحیح ثابت کیے ہیں۔

بخشی غلام محمد نے دوبارہ سیاست میں حصہ لینے کا کیوں فیصلہ کیا ہے؟ جن حالات میں اور جن وجوہات کی بنا پر انہوں نے سیاست سے علاحدگی کا فیصلہ کیا تھا، کیا وہ آج موجود نہیں ہیں؟ کہا جاتا ہے کہ ان کے ساتھوں نے انہیں دوبارہ عملی سیاست میں حصہ لینے کے لئے مجبور کر دیا۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ ان کے ساتھیوں کا زبردست احتجاج بھی انہیں کنارہ کشی کے فیصلے سے باز نہ رکھ سکا؟ پھر آج وہ اپنے ہی فیصلے کی تنسیخ پر کیوں آمادہ ہو گئے؟ اگر چا آئینگر کمیشن کے وجود کو ریاستی ہائی کورٹ نے کالعدم قرار دیا ہے لیکن سپریم کورٹ میں ریاستی سرکار کی اپیل سے یہ مسئلہ ابھی زندہ ہے۔ بظاہر کانگریس یا لیجسلیچر پر ان کی گرفت پہلے سے زیادہ مضبوط نہیں ہے۔ ان حالات میں بخشی صاحب کے تازہ ترین فیصلے کا تجزیہ سیاست کے طالب علموں کے لئے بڑی اہمیت رکھتا

ہے، لیکن جب تک بخشی صاحب کے سیاسی مقاصد، ان کے لائحہ عمل اور پروگرام کے متعلق مزید معلومات فراہم نہ ہوں، اس کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کرنا مشکل ہوگا۔ اگرچہ ان کا سیاست میں دوبارہ حصہ لینے کا فیصلہ بجائے خود کچھ اہم نتائج اخذ کرنے میں مدد دے سکتا ہے مثلاً یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ بخشی صاحب اگر آج مرکز میں مقبول نہیں ہیں، تو معتوب بھی نہیں ہیں، وہ اگر آج سے دوسال پہلے تنہا عوامی نفرت، غیض وغضب اور اجتماعی بیزاری کے مرکز تھے تو آج صادق صاحب اور ان کے ساتھی اس ''مالِ غنیمت'' میں ان کے شریک ہیں۔ بلکہ اقتدار سے وابستگی کی بنا پر ان کا حصہ بخشی صاحب سے زیادہ ہے۔ اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد صادق صاحب نے اپنے وعدوں اور اپنی کارگزاریوں سے اپنی جو شبیہہ بنائی تھی، اس کی خوبصورتی نے بخشی صاحب کی تصویر کو خوفناک بنادیا تھا لیکن آج دوسال بعد اگر دونوں تصویریں ایک ہی نمائش میں رکھ دی جائیں، تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ کون سی تصویر سے زیادہ وحشت برستی ہے۔ بعض ماضی پرستوں کو بخشی غلام محمد کی تصویر مقابلتاً گوارا نظر آئے گی، یہ ہماری تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ صرف دوسال کے عرصے میں بخشی غلام محمد کے دور سے وابستہ تلخ ترین یادیں ذہنوں سے محو ہوگئیں اور ''مہذب، صالح، دیانتدار، باشعور'' لیڈروں نے اپنے نکمے پن، نااہلیت اور ناعاقبت اندیشی کی بناء پر انہیں ایک اہم سیاسی Factor بنادیا۔ اس پس منظر میں ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ بخشی صاحب کو دوبارہ عملی سیاست میں حصہ لینے کا حوصلہ موجودہ حکمرانوں نے دیا ہے، انہیں زندہ رکھنے کا سہرا صادق صاحب، قاسم صاحب اور ڈی۔ پی صاحب کے سر رکھا جائیگا۔ غیر شعوری طور پر وہ بخشی صاحب کے بہترین دوست ثابت ہوئے ہیں۔

بخشی غلام محمد کا سیاسی مستقبل کیا ہے؟ وہ کس حد تک ریاست کی سیاسی زندگی کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ اس کا انحصار ان کی نیّت، ان کے طرزِ عمل اور ان کے سیاسی موقف پر ہے۔ اگر ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ کسی بھی طور اقتدار کی کھوئی ہوئی ہڈیاں حاصل کر سکیں، تو پھر ان سے کسی صحت منداور تعمیری رول کی توقع رکھنا بے کار ہے۔ اگر وہ بادشاہ سے زیادہ وفاداری کا ثبوت بہم پہنچا کر مرکزی لیڈروں کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو ان کا راستہ بہت آسان ہے۔ اگر وہ صرف اپنے ساتھیوں، رفیقوں اور جانثاروں کی عافیت کے طلب گار ہیں تو جلد یا بدیر حکمران جماعت کے ساتھ ان کا سمجھوتہ ہو جائے گا، اور انہیں اقتدار کی ہڈیوں میں سے اپنا حصّہ ملے گا۔ لیکن اگر وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے خلوصِ دل اور خلوصِ نیت سے ریاستی عوام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں، اگر وہ ماضی کے تجربوں سے سبق سیکھ کر اپنا مستقبل اور اپنی عاقبت سنوارنا چاہتے ہیں، اگر وہ موجودہ حکمرانوں کے طریقِ کار، طرزِ عمل اور ان کی تنگ نظر سیاست سے اس لیے اختلاف رکھتے ہیں کہ یہ ملک کے مفادات کے منافی ہیں تو ریاست ہی نہیں، ملک کی سیاسی زندگی میں انہیں ایک اہم رول ادا کرنے کا موقعہ ملے گا۔ ان کی مستعدی، ذہانت، قوتِ عمل اور قوتِ فیصلہ ضرب المثل بن چکی ہے۔ بد قسمتی صرف یہ ہے کہ اپنے دورِ اقتدار میں انہوں نے اپنی یہ ساری صلاحتیں بڑے حقیر اور ہیچ مقاصد کے لئے صرف کر دیں۔ اگر وہ دیانتداری سے اپنی ان صلاحتیوں کو قومی اور ملکی مفاد کے لئے وقف کر دیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کی ذات سے وابستہ تلخ یادوں کو بھلا کر انہیں عزت اور محبت سے یاد نہ کیا جائے۔ ریاست میں اس وقت سب سے اہم ضرورت موجودہ حکومت کی بے اعتدالیوں اور

بدعنوانیوں کے خلاف آواز بلند کرنا ہے۔ قوم پرست حزب مخالف کے عدمِ وجود نے حکمران جماعت کو مطلق العانیت اور فاشزم کے قریب کر دیا ہے۔ اگر بخشی صاحب اپنی ذاتی عافیت سے بلند ہو کر حکومت کی بے راہ رویوں اور بداعمالیوں کے خلاف آواز بلند کریں، تو انہیں ریاست کی ان ترقی پسند قوتوں کی بھرپور حمایت حاصل ہوگی، جو ماضی کی بجائے مستقبل اور مغنّی کی بجائے نغمے پر اعتقاد رکھتی ہیں۔

بخشی صاحب کے تازہ ترین فیصلے نے خواجہ غلام محمد صادق کی ذات اور ان کی حکومت کو بڑی کڑی آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ صادق صاحب کو اب زیادہ انہماک اور توجہ سے اپنے ساتھیوں کی ''دیکھ بھال'' کرنا پڑے گی، صادق صاحب کی جمہوری حس کو بھی امتحان سے گذرنا پڑے گا۔ الحاق دشمن اور پاکستان نواز سیاسی جماعتوں کے خلاف لڑنے کے لئے ڈی۔ آئی۔ آر کا حربہ بڑا موثر ثابت ہوا ہے۔ بخشی غلام محمد سے نپٹنے کے لئے شاید یہ حربہ موجودہ حالات میں کارگر ثابت نہ ہو، اس لئے اب یہ دیکھنا ہے کہ قوم پرست اور الحاق نواز مخالفوں کے ساتھ موجودہ حکومت کیا برتاؤ کرے گی۔ کانگریس کی موجودہ قیادت کو بخشی غلام محمد سے خوفزدہ ہو کر غیر جمہوری طریق کار کا سہارا نہیں لینا چاہئے۔ اُسے عوام کی قوت فیصلہ پر اعتماد کر کے بخشی صاحب کو سیاسی میدان میں شکست دینے کی کوشش کرنا چاہئے۔ لیکن ایسا کرنے کے لئے اُسے اپنی ان تمام خامیوں اور کمزوریوں کو دور کرنا ہوگا، جن کی بنیاد پر بخشی صاحب اپنی سیاست کا قصر تعمیر کرنے والے ہیں۔ بخشی صاحب کے سیاست میں دوبارہ حصہ لینے کے فیصلے کا اگر صرف یہی فائدہ ہو کہ موجودہ حکومت کو اپنی خامیوں اور محرومیوں کا احساس ہو جائے، تو بالواسطہ طور پر بخشی صاحب ریاستی عوام کی بہت بڑی خدمت انجام دیں گے۔

۱۵/ مارچ ۱۹۶۶ء

کشمیری صوبہ

پنجابی صوبہ کا مطالبہ تسلیم کر کے کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ایک جرأت مندانہ اور دانش مندانہ فیصلہ کیا ہے اور کانگریس کی موجودہ قیادت اس فیصلے کے لئے مبارکباد کی مستحق ہے۔ اگر چہ ورکنگ کمیٹی کا فیصلہ ممبروں کی مجموعی فکر کا نتیجہ ہے لیکن اس اُلجھے ہوئے مسلے کو فوری طور پر حل کرانے کا سہرا یقیناً وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے سر رہے گا۔ موجودہ پنجاب میں سے ایک پنجابی صوبہ بنائے جانے کا فیصلہ اندرا سرکار کا اولین اہم فیصلہ ہوگا اور اس کے بڑے دوررس نتائج ہوں گے، لیکن اس سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ موجودہ حکومت اہم اور تاریخی فیصلے کرنے سے نہیں ہچکچاتی۔ پنجاب کی موجودہ سیاست ایک ایسی ڈگر پر جارہی تھی کہ اگر قومی قیادت مزید کچھ وقت کے لئے تذبذب یا تاخیر کی پالیسی پر کاربند رہتی، تو ملک کی سالمیت اور اس کا اندرونی امن واماں خطرے میں پڑ جاتا۔ ورکنگ کمیٹی کے فیصلے سے ہر مکتب خیال کو اتفاق نہیں ہوسکتا لیکن ملک کی اکثر سیاسی جماعتوں نے اس کا خیر مقدم کیا ہے۔ اور ہمیں توقع ہے کہ پنجابی صوبے کے قیام سے وہ فرقہ پرست عناصر کمزور پڑ جائیں گے جو پنجابی صوبے کی آڑ میں فرقہ پرستی اور تنگ نظری کا

زہر پھیلا رہے تھے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ قومی قیادت نے دس سال تک اس جائز، معقول اور موزوں مطالبے کو تسلیم نہ کر کے ان فرقہ پرستوں کو اپنی لیڈری چمکانے کا موقع دیا۔ ہمارے ملک میں یہ دستور بن گیا ہے کہ ہر جائز مطالبے کو اس وقت تسلیم کیا جاتا ہے جب اس کو تسلیم کیئے جانے کا کریڈٹ فیصلہ کرنے والوں کے بجائے ان کے مخالفین کو مل سکے۔ پنجاب کے سلسلے میں بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ اطمینان بخش بات یہ ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے مزید وقت ضائع کیئے بغیر پنجاب کو ایک لسانی صوبہ بنانے کی تجویز منظور کی ہے۔

لسانی بنیادوں پر صوبوں کی تشکیل غلط ہے یا صحیح؟ اس پر اب بھی بحث کی گنجائش موجود ہے۔ لیکن چونکہ ملک کا موجودہ ڈھانچہ لسانی بنیادیوں پر قائم کیا گیا ہے، اس لئے صوبوں کی تشکیل یا تنظیم میں اس اصول کو بنیادی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ پنجابی صوبہ اس سلسلے کی آخری کڑی نہ سہی، اہم ترین کڑی ضرور ہے۔ اب یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ ایک فیڈریشن میں اکائیوں کی کیا اہمیت ہے اور فیڈریشن کے استحکام کے لئے مختلف اکائیوں کی رضامندی اور خوشنودی کتنی ضروری ہے۔ اس مرحلے پر ریاست کے گورنر ڈاکٹر کرن سنگھ کی اس تجویز کا اعادہ کرنا ضروری ہے، جس میں انہوں نے ریاست جموں کشمیر کو لسانی بنیادوں پر تشکیل دیئے جانے کا سجھاؤ پیش کیا تھا۔ اگر چہ ریاستی کانگریس اور جن سنگھ کی پُر زور مخالفت اور ڈاکٹر کرن سنگھ کی پر معنی خاموشی سے اس تجویز پر بحث و تمحیص کا سلسلہ یک لخت بند ہوگیا ہے لیکن پنجابی صوبے کے قیام کے بعد اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر کرن سنگھ نے جموں اور کشمیر کو دو الگ تہذیبی، لسانی اور تاریخی اکائیاں قرار دے کر جموں کو ہماچل پردیش

کے ساتھ ملانے، کشمیر کو کشمیری بولنے والوں کا ایک الگ لسانی صوبہ بنانے اور لداخ کو مرکز کی نگرانی میں دیئے جانے کی تجویز پیش کی تھی۔ بدقسمتی سے ریاستی کانگریس کی موجودہ قیادت نے اس تجویز پر سوچے سمجھے بغیر اپنا ردِعمل ظاہر کیا اور اسے ''بیرونی مال'' قرار دے کر ناقابل عمل اور مضرت رساں قرار دیا۔ حالانکہ ڈاکٹر کرن سنگھ کی متذکرہ تجویز اور پنجابی صوبے کی تشکیل کے فیصلے میں گہری مماثلت اور فکری وحدت کارفرما ہے، اگر لسانی بنیادوں پر ملک کی تشکیل نو کا فیصلہ ناقابلِ عمل اور مضرت رساں نہیں تو پنجاب اور کشمیر کی لسانی تشکیل ملک کی سالمیت اور مفادات کے لئے مضرت رساں کیوں کر ہو سکتی ہے۔

جموں اور کشمیر کو ناقابل تقسیم وحدت قرار دینے والے اکثر یہ بھول جاتے ہیں، کہ ہندوستان کی کوئی ریاست ان معنوں میں ناقابل تقسیم نہیں رہی ہے کہ اس کی سرحدوں کا ازسرِنو تعین نہ ہو سکے۔ ریاست جموں و کشمیر ہندوستانی فیڈریشن کا ایک ایسا ہی حصہ ہے جیسا آندھرا، مہاراشٹر یا پنجاب۔ اگر ملک کا نیا نقشہ تیار کرنے کے لئے حیدر آباد، گجرات اور پنجاب کی سرحدیں پامال ہو سکتی ہیں، تو جموں و کشمیر کی مصنوعی وحدت سے ایسا کون تقدس وابستہ ہے کہ ملک کے وسیع تر مفادات پر اس کو ترجیح دی جائے؟ مختلف تہذیبی اکائیوں اور جغرافیائی وحدتوں کے لئے اندرونی خودمختاری کا اصول ملک کے آئین میں تسلیم کیا جا چکا ہے۔ اور پنجابی صوبہ کی تشکیل اس اصول کی معقولیت اور افادیت کا بین ثبوت ہے۔ اگر اہل کشمیر کے بعض فرضی اور حقیقی اندیشوں کو دور کرنے کے لئے کشمیر کو کشمیری بولنے والوں کا ایک الگ صوبہ بنا دیا جائے، تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ اہل کشمیر کی ذہنی اور نفسیاتی آسودگی ان علاحدگی پسند قوتوں کو کمزور کر دے، جو موجودہ سیاسی اور نفسیاتی

بحران سے فائدہ اٹھا کر ریاستی عوام کے شکوک اور شبہات کو تقویت پہنچا رہی ہیں۔ جو لوگ سطحی جذباتیت کا شکار ہو کر جموں اور کشمیر کی تقسیم کو فرقہ پرستوں اور رجعت پسندوں کی فتح قرار دیتے ہیں، انہیں ایک لمحے کے لئے اس تاریخی پسِ منظر کو ذہن میں رکھنا چاہئے، جو ریاست کی ''وحدت'' کا ذمے دار رہا ہے۔ ریاست کی موجودہ وحدت کسی جغرافیائی، تہذیبی یا لسانی اشتراک کی بجائے ڈوگرہ حکمرانوں کی توسیع پسندی اور ان کی استعماریت کی مرہون منت ہے اور اُن کے سو سالہ دورِ اقتدار میں جموں اور کشمیر سیاسی طور پر ایک وحدت ہوتے ہوئے بھی نفسیاتی طور پر ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔ ہمارے کہنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ جموں اور کشمیر کے عوام کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں، بلکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مطلق العنانیت اور استبداد کے خلاف جدوجہد میں اشتراک نے انہیں ایک گہرے سمبندھ میں جوڑ دیا ہے لیکن اس سمبندھ کو اور مضبوط بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دونوں صوبوں کے عوام میں ٹکراؤ، تصادم اور تشکیک کے عناصر کر ختم کر دیا جائے، تاکہ جموں اور کشمیر کے عوام رقیبوں کی بجائے دوستوں کی طرح آگے بڑھ سکیں۔ موجودہ تصادم اور تشکیک کی ذمہ داری ان سیاسی لیڈروں پر ہے جو تہذیبی امنگوں اور لسانی تحفظات کو تنگ نظری اور فرقہ پرستی سے تعبیر کر کے غلط مبحث کر رہے ہیں۔ کشمیر کی موجودہ الجھنوں کا حل جموں کی نفسیات سمجھے بغیر ممکن نہیں اور اسی لئے ہم ڈاکٹر کرن سنگھ کی تجویز کو صرف کشمیر ہی نہیں بلکہ جموں کے مسائل کا حل بھی سمجھتے ہیں۔ آخر جموں کے عوام کو کشمیر کی قربان گاہ پر کیوں بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے؟

ڈاکٹر کرن سنگھ کی تجویز کو عملی شکل دینے میں بعض اہم مشکلات حائل

ہوں گی لیکن ہر بڑے مسئلے کو حل کرنے میں کچھ اہم مشکلات کا درپیش ہونا ناگزیر ہے، اس لئے ہم مرکزی سرکار اور ریاستی کانگریس کو مشورہ دیں گے کہ وہ اس تجویز پر جذباتی انداز سے سوچنے کی بجائے اس کا مطالعہ حقائق اور تاریخی تقاضوں کی روشنی میں کرے۔ حب الوطنی اور قومیت کا معیار یہ ہے کہ ہم ذاتی عافیت اور مفادات کی سطح سے بلند ہو کر ملک کے مجموعی مفادات کا احترام کرنا سیکھ جائیں۔ لسانی بنیادوں پر ریاست کی تشکیل کے بعض معترضین کا کہنا ہے کہ دراصل اس قسم کی تنظیم ریاست کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کئے جانے کے مترادف ہوگی، ان کی خدمت میں صرف یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ اگر اڑیسہ، بنگال، پنجاب ۸۰ فیصدی ہندو آبادی کے باوجود ہندو صوبے نہیں کہلاتے، تو کشمیر کے سلسلے میں مسلم اکثریت کو مذہبی تقسیم کی بنیاد کیوں کر تصوّر کیا جاسکتا ہے؟ پنجابی صوبے کے متعلق بھی اکثر یہی اعتراض کیا جاتا رہا ہے، اور ماسٹر تارا سنگھ تو اب بھی سکھ اکثریت والے صوبے کا ہی مطالبہ کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اس اعتراض کو کوئی اہمیت دیئے بغیر پنجابی صوبے کے قیام کی سفارش کی گئی ہے۔ کشمیری صوبے کی تشکیل میں بھی اس قسم کے عذرِ لنگ مانع نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر ہم پوری سنجیدگی اور دیانت داری سے پاکستان کو کشمیر کے مسلے میں فریق تصور نہیں کرتے تو پاکستان کو مطمئن کرنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہونا چاہئے کہ ہم کشمیری عوام کو بھی فریق تسلیم نہ کریں۔ صدر جمہوریہ نے آج سے کچھ ماہ قبل اپنی ایک تقریر میں یہ معنی خیز بات کہی تھی کہ ہمارے لئے کشمیر کے مسائل کو وہی حیثیت حاصل ہے جو ہندوستان کی کسی اور ریاست کے مسائل کو حاصل ہوسکتی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس طرح پنجاب کے مسلے کو حل کرنے

کے لئے مرکزی سرکار نے پنجاب کے مختلف الخیال سیاسی لیڈروں سے بات چیت کر کے ایک فارمولہ تیار کرلیا، اسی طرح کشمیر کی الجھن کو سلجھانے کے لئے کشمیر کی مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے بات چیت کر کے کوئی نہ کوئی صورت پیدا کی جاسکتی ہے۔ اگر مرکزی سرکار ناگا باغیوں اور میزوقبائیلوں کے ساتھ بات چیت کر کے انہیں اس بات کا یقین دلاسکتی ہے کہ ہندوستان کے ساتھ وابستہ رہ کران کے مفادات اوران کی علاقائی خودمختاری محفوظ رہ سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اہل کشمیر کواس حق سے محروم رکھا جائے۔

۳۱ / مارچ ۱۹۶۶ء

چراغ بُجھ رہا ہے

۱۰ / جنوری کو سرزمین تاشقند سے جب ایک چراغ روشن ہوا تو جنگ اور نفرت کی ظلمتیں امن و محبت کی کرنوں سے پامال ہو گئیں، اور سہمی ہوئی انسانیت کے چہرے پر زندگی آمیز مسکراہٹ کِھل اُٹھی، دیوانگی اور غارت گری کے مہیب سائے مٹ گئے اور امید و آرزو کا عنوان لئے ہوئے ایک نئی صبح طلوع ہو گئی۔ مگر ابھی اس چراغ کو روشن ہوئے پورے تین ماہ بھی نہیں گزرے ہیں کہ اس کی لو تھرتھرانے لگی ہے اور چاروں طرف سے بادِ مخالف کے جھونکے اسے بجھانے کے لئے اس پر یلغار کر رہے ہیں۔ عجب نہیں کہ "چراغِ تاشقند" ان مسموم ہواؤں کی تاب نہ لا کر دم توڑ دے، اور زندگی ایک بار پھر موت اور مایوسی کے اندھیروں میں اپنا راستہ کھو بیٹھے۔

معاہدۂ تاشقند نفرت اور دیوانگی پر محبت اور عقل سلیم کی فتح ہے اور اسے بجا طور پر ہندوستان اور پاکستان کے لیڈروں کے تدبر، ان کی دانشمندی اور عاقبت اندیشی کا نچوڑ قرار دیا گیا ہے، ۱۷ دن کی خوفناک اور تباہ کن جنگ کے بعد دونوں ملکوں کو اس حقیقت کا احساس ہو چکا تھا کہ فوجی طاقت اور خوں ریزی کے بل بوتے پر باہمی مسائل کو سلجھانا اتنا آسان نہیں، جتنا بادی النظر

میں دکھائی دیتا ہے۔ تاشقند کا اعلان اس احساس کی پیداوار اور اس حقیقت کا اعتراف تھا۔ ہندوستان کے وزیر اعظم سورگیہ لال بہادر شاستری اور پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل ایوب خان دیانتداری سے اس نتیجے پر پہونچے کہ دونوں ملکوں کے لئے زندہ رہنے کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ ہے امن واخوت سے باہمی مسائل طے کرنے کا، بظاہر یہ فیصلہ ایک عام حقیقت کا اظہار تھا لیکن اس معمولی سی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہزاروں نوجوانوں کا خوں بہا، لاکھوں لوگ بے گھر ہو گئے اور لاتعداد بستیاں اجڑ گئیں۔ اس پس منظر میں معاہدۂ تاشقند کی تاریخی اہمیت اور سیاسی معنویت واضح ہو جاتی ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ماسوائے چین کے دنیا کی تمام بڑی طاقتوں نے اسے ایک اہم تاریخی دستاویز قرار دے کر اس کا خیر مقدم کیا اور ہندوستان کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے اپنی زندگی کا خراج ادا کر کے اس معاہدے پر چالیس کروڑ عوام کی مہر تصدیق ثبت کر دی۔ سورگیہ لال بہادر شاستری کے جنازے کو کاندھا دے کر پاکستان کے صدر نے اس بات کا اقرار کیا کہ وہ اپنے قول پر قائم رہ کر اس معاہدے کی عزت وعصمت کی حفاظت کریں گے، جس پر لال بہادر کے دستخط موجود ہیں۔ معاہدے کے فوراً بعد دونوں ملکوں میں خیر سگالی، نیک نیتی، امن واطمینان اور صلح وآشتی کی جو فضا قائم ہوگئی، اس سے یہ امید بندھ گئی تھی، کہ دونوں ملکوں کی تاریخ میں ایک خوشگوار باب کا آغاز ہو رہا ہے۔ سفارتی تعلقات کی بحالی، مقررہ تاریخ کے اندر اندر فوجوں کی واپسی، جنگی قیدیوں کا تبادلہ اور اس نوعیت کے سبھی اقدامات نے اس امید کو یقین کا درجہ عطا کیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے پچھلے کئی ہفتوں سے تاشقند سپرٹ کو بالائے طاق رکھ کر پھر اس پرانی ذہنیت کا مظاہرہ کیا جانے لگا ہے، جس نے

ہمیں جنگ اور تباہی کی آگ میں دھکیل دیا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل غور ہے کہ تاشقند اعلان کی خلاف ورزیوں کا سلسلہ پاکستان کی طرف سے شروع ہوا ہے اور پاکستان کے لیڈر ایک بار پھر ایک ایسی فضا پیدا کر رہے ہیں، جس میں مسائل کے سلجھنے سے زیادہ الجھنے کا امکان ہوتا ہے۔ معاہدۂ تاشقندہ کے تئیں پاکستان کے رویے کا ہندوستان میں ردعمل ہونا ناگزیر ہے اور اس لئے یہ بات حیران کن نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں معاہدۂ تاشقند کے مخالف ''ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا'' کی آوازیں بلند کر کے حکومت کے لئے مشکلات پیدا کر رہے ہیں۔ یوم پاکستان کے موقع پر چینی اسلحہ کی نمائش اور چینی صدر لیوشاچی کے دورۂ پاکستان نے ہندوستان کے عوام میں تشکیک اور بے اعتمادی کی وہی پہلی سی فضا قائم کر دی ہے اور یہ بڑی افسوسناک بات ہے کہ عین اس مرحلے پر جب کہ برصغیر میں رہنے والے کروڑوں عوام خوشگوار تعلقات اور باہمی میل جول کے خواب دیکھ رہے تھے، پاکستان کے حکمرانوں نے ان کی امیدوں پر شب خوں مارنے کا فیصلہ کیا ہے۔ چینی صدر کی اشتعال انگیزیوں نے خیر سگالی اور بھائی چارے کے ان تمام امکانات کو مجروح کر دیا ہے جو پچھلے تین ماہ میں روشن ہوئے تھے۔ اگرچہ ابھی تک دونوں ملکوں کے لیڈر معاہدۂ تاشقند کی گردان کر رہے ہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ تاشقند سپرٹ کو نظر انداز کر کے ایک بار پھر باہمی نفرت، تشکیک، بیزاری اور بداعتمادی کی فضا پیدا کی جا رہی ہے اور رفتہ رفتہ ہم اسی منزل کی طرف لوٹ رہے ہیں جہاں سے آگے چل کر ہم نے امن، دوستی اور بھائی چارے کے عہد و پیماں باندھے تھے۔ ہم میں سے ہر شخص یہ جانتا ہے کہ ہم ایک بار پھر تباہی، غارتگری اور خوں ریزی کے راستے پر جا رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود ہم کچھ نہیں کر سکتے، یہ انسانی

تہذیب کی بلندی اور انسان کی روشن دماغی پر کتنا گہرا طنز ہے۔ حیوان اور زمین پر رینگنے والے کیڑے بھی اپنے تجربات سے سبق سیکھنے کا ادراک رکھتے ہیں۔ لیکن ہم انسان ہوتے ہوئے بھی غلطیوں کو دہرا رہے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کے دانشور، سیاسی لیڈر اور اہل اقتدار تاشقند میں روشن کئے ہوئے چراغ کی لو کو نفرت کی آندھیوں سے بچانے کے لئے ایک آخری کوشش کریں؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ دونوں ملکوں کے امن پسند، صلح جو اور خیر اندیش عناصر متحد ہو کر ان قوتوں کو ناکام بنا دیں، جو ہمارے گھروں اور ہمارے کھلیانوں پر بم برسا کر اپنے جھوٹے غرور کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، ابھی آندھیوں کی رفتار مدھم ہے، ابھی چراغ کی لو بجھی نہیں ہے اور ابھی آرزوؤں کے کنول مرجھائے نہیں ہیں، لیکن اگر ہم نے آندھیوں کی زد میں آئے ہوئے چراغ کی لو کو بچانے کی کوشش نہ کی، تو یہ چراغ بجھ جائیگا اور دوسرا چراغ روشن کرنے کے لئے نہ معلوم کتنے نوجوانوں کا خوں، کتنی عورتوں کے سہاگ اور کتنے بچوں کی مسکراہٹیں قربان کرنا پڑیں گی۔

۱۵/اپریل ۱۹۶۶ء

یہ خود ساختہ نمائندے

آئین کی دفعہ ۳۷۰ کو ختم کر دینے کے لئے پارلیمنٹ کے جن سنگھی ممبر پرکاش ویر شاستری کے پرائیویٹ بل پر بحث کے دوران یہ بات واضح ہو گئی ہے۔ کہ بعض سنجیدہ اور صائب الرائے ممبر بھی جذبات کی رو میں بہہ کر مسائل کی صحیح نوعیت کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ایک کمیونسٹ اور ایک سوتنترا ممبر کے علاوہ بل پر بحث میں حصہ لینے والے سبھی ممبروں نے ۳۷۰ کو اڑا دینے کی حمایت کی۔ حد یہ ہے کہ آچاریہ کرپلانی اور مہاویر تیاگی جیسے کہنہ مشق اور آزمودہ کار ممبروں نے بھی جن سنگھی نقطۂ نظر کی حمائت کی۔ اگرچہ حکومت کی اس یقین دہانی کے بعد کہ ۳۷۰ کو ختم کر دینے کا عمل بتدریج جاری ہے، شری شاستری نے اپنا پیش کردہ بل واپس لے لیا لیکن اکثر ممبروں کی تقریروں سے یہ افسوسناک حقیقت اپنی پوری شدت کے ساتھ واضح ہو گئی کہ دہلی اور سرینگر کے درمیان ابھی طویل ذہنی فاصلے موجود ہیں، انتظامی ادغام سے پہلے جس جذباتی ہم آہنگی اور نفسیاتی تال میل کی ضرورت ہے، اُسے قطعی غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ جذباتی تقریروں اور کھوکھلے نعروں کی گونج میں اس اہم حقیقت کو فراموش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اہل کشمیر ابھی تک

ذہنی، نفسیاتی اور نظریاتی طور پر دفعہ ۳۷۰ سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں، اور اس ناتیاری میں ان کا اتنا دوش نہیں ہے جتنا مرکزی لیڈروں اور مرکزی سرکار کی غلط کار پالیسیوں کا ہے۔ دفعہ ۳۷۰ کے متعلق ہم نے انہی کالموں میں بار ہا اپنے نقطۂ نظر کی صراحت کی ہے، اور اس اشاعت میں معاصر کشمیر ٹائمز جموں کا وہ حقیقت افروز اور فکر انگیز اداریہ بھی شائع کیا جارہا ہے جو اس موضوع پر ہمارے خیالات کی مکمل ترجمانی کرتا ہے۔ اس لئے اس کی افادیت، تاریخی اہمیت اور نفسیاتی پس منظر کے سلسلے میں ہم مزید کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ لیکن ہمیں اس بات سے بے حد دُکھ ہوا ہے کہ شری شاستری کے بل پر بحث میں حصہ لینے والے تین کشمیری ممبران نے بھی دفعہ ۳۷۰ کو اڑا دینے کی پُرزور حمایت کی ہے۔ دہلی اور ملک کے دور افتادہ حصوں میں رہنے والے لوگ اکثر کشمیر کے اندرونی مسائل اور کشمیری عوام کے احساسات وجذبات کے متعلق کوئی غلط رائے یا اندازہ قائم کریں، تو بات سمجھ میں آسکتی ہے۔ لیکن جب کشمیر میں رہنے والے اور کشمیری عوام کے نام پر منتخب ہونے والے ممبر بھی اپنا نام ''شہسواروں'' کی فہرست میں لکھوانے کے لئے اس دوڑ میں شریک ہوجائیں، تو بات افسوس کی حد سے گذر کر احتجاج کی سرحدوں میں داخل ہوتی ہے۔ ہم کشمیری عوام کے ان نام نہاد نمائیندوں سے یہ پوچھنا چاہیں گے، کہ دفعہ ۳۷۰ کو ختم کرنے کے لئے جن سنگھی مطالبے کی حمایت میں تقریریں جھاڑ کر تم کس کی نمائندگی کر رہے ہو؟ ہم یہ جاننا چاہیں گے، کہ ایوان نمائیندگاں میں چور دروازے سے گھُسنے کے بعد سے اب تک تم نے کتنی مرتبہ اپنے آپ کو ریاستی عوام کی خواہشات، ان کی امنگوں اور آرزؤں کے ساتھ وابستہ کیا ہے؟ کیا تمہارا کام صرف یہی ہے کہ فرقہ پرست جماعتوں سے چند تالیوں کا خراج

لے کر اپنے ضمیر، اپنے شعور اور اپنی آگہی کا سودا کرو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ قومی یکجہتی کے دلفریب نعروں کی آڑ میں جن سنگھی لیڈروں کے عزائم کیا ہیں؟ کیا تم یہ بھی نہیں جانتے کہ ابھی دفعہ ۳۷۰ کو ختم کرنے کے لئے ملک کی فضا سازگار نہیں؟ تم اگر یہ سب کچھ نہیں جانتے تو تمہیں ملک کے اس معزز ایوان میں رہنے کا کوئی حق نہیں، کہ تمہاری لاعلمی بہت سے باشعور اور بلند کردار لوگوں کو گمراہ کر سکتی ہے اور اگر یہ سب کچھ جاننے کے باوجود بھی تم اپنے مفادِ خصوصی کی نگہداشت کے لئے ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور ہو، تو یاد رکھو کہ ملک کی تاریخ تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ کشمیر کے ممبران پارلیمنٹ نے ۳۷۰ کو اُڑا دینے کے بل کی حمائت کر کے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ کشمیر کے نام پر پارلیمنٹ میں منتخب ہونے والے ممبران کشمیری عوام کے نمائندے نہیں ہیں اور اگر انہیں ہمارے اس بیان کی صحت پر شبہ ہو تو وہ آنے والے انتخابات میں اسی سوال پر انتخاب لڑ کر دیکھ لیں کہ وہ کس حد تک کشمیری عوام کے جذبات، احساسات، اُن کی امنگوں اور آرزوؤں کی ترجمانی کا حق رکھتے ہیں۔

۱۰؍مئی ۱۹۶۶ء

ایک اہم فیصلہ

سرکار بنام بخشی غلام محمد میں سپریم کورٹ کا تازہ ترین فیصلہ ملک کی قانونی اور سیاسی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ ریاستی ہائی کورٹ کے فیصلے سے مروجہ اخلاق اور انصاف کے تقاضے بے حد مشکوک ہو چکے تھے، اور کچھ ایسے مفروضوں کو تقویت پہنچی تھی، جن سے بہت سے غلط اور گمراہ کن نتائج اخذ کئے جا سکتے تھے۔ ''عوامی اہمیت کے مسائل'' کے متعلق ریاستی ہائی کورٹ کی تشریح نے کسی بھی وزیر کے خلاف تحقیقات کو عملاً ناممکن بنا دیا تھا۔ اسی طرح کابینہ کی مشترکہ ذمہ داری کے اصول پر زور دے کر ریاستی ہائی کورٹ کے فاضل ججوں نے مشترکہ ذمہ داری کے بعض اہم پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ ایک فاضل جج نے بخشی صاحب کے استعفیٰ کے فوراً بعد صادق صاحب اور ان کے ساتھیوں کی تعریفی تقریروں کو بھی بخشی صاحب کے موقف کی صحت سے تعبیر کیا تھا۔ بادی النظر میں بعض اہم نکتوں پر ریاستی ہائی کورٹ کا فیصلہ ایک عام آدمی کو مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔ سپریم کورٹ کے فیصلے نے بہت سی ذہنی الجھنوں کو دور کر دیا ہے اور بعض اہم مسلوں پر اپنی قطعی اور واضح رائے ظاہر کر کے شکوک و شبہات دور کر دئے ہیں۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ ریاستی ہائی کورٹ

کے فاضل ججوں کے نکتہ نگاہ کی تردید یا تکذیب کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ بعض اہم قانونی مسائل پر ملک کے عظیم ایوانِ انصاف کا اختلاف رائے ظاہر کرتا ہے۔ یہ ہمارے ملک کے نظام عدلیہ کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ اعلیٰ عدالتوں کے فاضل جج کسی بیرونی دباؤ، اثر ورسوخ سے متاثر ہوئے بغیر قانون کی تشریح وتوضیح کرتے ہیں۔ ریاستی ہائی کورٹ نے ریاستی سرکار کے خلاف فیصلہ صادر کر کے یہ بات ثابت کر دی کہ ریاست کے نظم ونسق میں لاکھ بُرائیاں ہوں، یہاں کا عدلیہ ہر قسم کے اثر ورسوخ سے بلند و برتر ہے۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ اس بات کی شہادت ہے کہ ایک ہی قانون کی مختلف تشریحات وتوضیحات ممکن ہیں، سپریم کورٹ کا فیصلہ ان معنوں میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ تحقیقاتی کمیشنوں سے متعلق قانونی نکات پر اپنی نوعیت کا اولین فیصلہ ہے اور اس فیصلے کی رو سے ہر اس شخص کے خلاف تحقیقات کی جا سکتی ہے جو کبھی بھی اقتدار سے وابستہ رہا ہو اور جس نے دورانِ اقتدار کسی قسم کی بدعنوانی یا بے ضابطگی روا رکھی ہو۔

سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ ان بدکردار اور بدعنوان حکمرانوں کے لئے عبرت کا تازیانہ ہے جو اقتدار کے مخملیں فرش پر بیٹھ کر اپنی عاقبت سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ ریاستی حکومت کے ان سربراہوں کو (جو اس فیصلے کے فوری اثرات پر مسرت وشادمانی کا جشن منا رہے ہیں) یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ مستقبل قریب میں اس فیصلے کا اطلاق ان پر بھی ہو سکتا ہے۔

۱۵؍جون ۱۹۶۶ء

نئے مسیحا

انتظامیہ کی کارکردگی کا معیار بلند کرنے کے لئے ریاستی حکومت وقتاً فوقتاً ملک کے دوسرے حصوں سے تجربہ کار اور ماہر افسروں کو بلا کر اہم عہدوں پر تعینات کرتی رہتی ہے۔ شروع شروع میں یہ سلسلہ دو ایک افسروں تک محدود تھا۔ لیکن اب ریاست کے بہت سے کلیدی عہدوں پر غیر ریاستی افسر براجمان ہیں اور چونکہ حکومت کے نزدیک انتظامیہ کے مریض جاں بہ لب کو صرف بیرونِ ریاست کے مسیحا ہی نئی زندگی عطا کر سکتے ہیں، اس لئے توقع رکھنا چاہئے کہ مستقبل میں یہ سلسلہ اور بھی دراز ہوگا۔ افسروں کی درآمد میں اعلیٰ وادنیٰ کی تمیز مٹ جائے گی اور رفتہ رفتہ مسیحاؤں کی تلاش میں ہم زماں و مکاں کی قید سے بھی آزاد ہو جائیں گے۔ ہم بنیادی طور پر ریاستی اور غیر ریاستی تفریق اور امتیاز کو کوئی وقعت نہیں دیتے، ایک وسیع و عریض ملک کا ایک حصہ ہونے کی حیثیت سے ہمیں مشترکہ اثاثے سے مستفید ہونے کا اتنا ہی حق ہے، جتنا ملک کے کسی دوسرے حصے کو اور اسی لئے ملک کے تجربہ کار افسروں کو ضرورت پڑنے پر درآمد کرنے کی پالیسی بجائے خود قابل، اعتراض نہیں ہے لیکن جب ضرورت اور عیاشی کی حد فاصل مٹ جائے اور افسروں کی درآمد انتظامیہ کا معیار بہتر بنانے کی بجائے سروسز کی حوصلہ شکنی اور ذاتی انتقام گیری کا

ذریعہ بن جائے، تو ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ہم اس طریق کار کے خلاف احتجاج کریں۔ کچھ عرصے سے سرکاری ایوانوں میں یہ رجحان بڑھتا جا رہا ہے کہ ہر معمولی اور غیر معمولی عہدے کے لئے بیرونِ ریاست کے افسروں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ رجحان اس لئے زیادہ افسوسناک ہے کہ ایسے عہدوں کو پُر کرنے کے لئے ریاست میں درآمد شدہ افسروں سے زیادہ بہتر افسر دستیاب ہو سکتے ہیں۔ لیکن اربابِ اقتدار اس درجہ احساس کمتری کا شکار ہیں کہ وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لئے بغیر ہر اس بازاری ڈاکٹر کو مسیحا سمجھتے ہیں، جس کا تعلق ریاست سے نہ ہو، نتیجے کے طور پر آج ریاست کے اہم ترین عہدوں پر وہ غیر ریاستی باشندے فائز ہیں، جو اپنی قابلیت، اہلیت اور غیر معمولی صلاحیتوں کے باوجود انتظامیہ کو بہتر بنانے میں اس لئے کوئی حصہ ادا نہیں کر سکتے کہ انہیں نہ یہاں کے مسائل سے بخوبی واقفیت ہے، نہ ان لوگوں کے مزاج سے جن کے مسائل حل کرنے کے لئے انہیں یہاں آنے کی زحمت دی گئی ہے۔ دوسری طرف حکومت کے اس روّیہ سے انتظامیہ میں بد دلی اور بے چینی پیدا ہوتی جا رہی ہے اور ہمارے ہاں کے افسر مایوسی اور شکست خوردگی کا شکار ہو کر اپنی ذمہ داریوں سے انصاف کرنے کی اہلیت کھو بیٹھے ہیں۔ انہیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ ان کے سروں پر بیرونِ ریاست کے ایسے افسر بھی لادے گئے ہیں جو ان کے مقابلے میں نا تجربہ کار ہی نہیں، نا اہل بھی ہیں۔ بہت سے ایسے غیر ریاستی افسروں کی مثالیں دی جا سکتی ہیں، جن کے مقابلے میں ہمارے ہاں کے اپنے افسر زیادہ مستعد، تجربہ کار، محنتی اور دیانت دار ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ غیر ریاستی افسروں کا تقرر صرف اپنے ہاں کے افسروں کو تربیت دینے کے مقصد تک محدود رہنا چاہئے۔ لیکن موجودہ رجحان سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں

کہ حکومت انتظامیہ کے مقامی افسروں کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کرنے کے لئے ملک کے دوسرے حصوں سے افسر درآمد کر رہی ہے۔ یہ صورتحال کسی بھی لحاظ سے تسلی بخش نہیں۔

بیرون ریاست سے افسروں کا انتخاب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ صرف غیر معمولی صلاحیتوں کے افسروں کا انتخاب کیا جائے اور موجودہ افسروں کے انتخاب کے وقت غالباً اس معیار کو سامنے نہیں رکھا گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ سلسلہ صرف افسروں کی درآمد تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہئے۔ بلکہ ریاستی افسروں کو بھی ملک کے دوسرے حصوں میں برآمد کیا جانا چاہئے اس سے نہ صرف قومی یکجہتی کا احساس بڑھ جائیگا بلکہ ہمارے افسروں کو تجربہ حاصل کرنے کے لئے نئی جولان گاہیں بھی دستیاب ہوتی رہیں گی۔ تیسری بات یہ ہے کہ بنیادی مقصد اپنے ہاں کی سروسز میں اعتماد اور اہلیت پیدا کرنا ہے۔ اسلئے بیرون ریاست سے اسی وقت افسر درآمد کئے جانے چاہئیں جب یہاں موزون اور مناسب امیدوار نہ مل سکیں۔ ہم ایک بار پھر یہ بات دہرانا چاہتے ہیں کہ ہمارے انتظامیہ میں غیر معمولی اہلیت اور قابلیت رکھنے والے افسروں کی کمی نہیں۔ ان کی دریافت اور حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔

کُفر و ایمان کی آزمائش

سُنا تھا کہ جب موت کا فرشتہ بُلاوا لے کر آتا ہے تو بڑے بڑے ویروں اور زیرکوں کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ زبان میں لکنت آجاتی ہے اور چہروں کے رنگ اُڑ جاتے ہیں۔ پچھلے ہفتے اپنی آنکھوں سے اس بے رحم حقیقت کو عُریاں دیکھا۔ موت کا فرشتہ نہیں آیا، صرف اس کے قدموں کی آہٹ سُنائی دی کہ بڑے بڑے کافروں کو خُدا یاد آیا۔ پچھلے ہفتے جب بھونچال کے چند جھٹکوں کی وجہ سے

زمین نے جھولا جھولنا شروع کیا تو چراغ بیگ کی حالت دیکھنے والی تھی۔ اس نے سمجھا کہ وقتِ آخر آن پہنچا ہے، یہ دُنیا فانی ہے اِنا لِلّٰہِ و انا الیہ راجعون! دوست واحباب کا خیال ہے کہ ان ہی کی طرح میرا رنگ بھی فق ہو گیا تھا۔ میں کُرسی سے اُتر کر زمین پر بیٹھ گیا تھا، خُدا اور رسول کا نام ورِدِ زبان تھا۔ جتنی دیر کے لیے بھونچال کے جھٹکے محسوس ہوتے رہے، مجھے اپنے آپ کا تو کچھ ہوش نہ تھا، لیکن اپنے گرد و پیش پر میری پُوری نظر تھی۔ اُس وقت میں عدالت کے احاطے میں تھا، جہاں سینکڑوں کی تعداد میں وکیل، مُوکل، مُنصف، مُلزم اور گواہ موجود تھے۔ وکیل مُلزمین کی جیبوں میں موجود نوٹوں کو اپنی جیبوں میں منتقل کرنے کی فکر میں تھے۔ مُوکل، وکیل کو عزرائیل سمجھ کر اسے جھانسا دینے کی تاک میں تھے۔ منصف اپنی کُرسیوں پر بیٹھ کر انصاف کے ترازو کا پاسنگ برابر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مُلزم گواہوں سے مل کر انصاف میں مِلاوٹ کر رہے تھے کہ زمین پاؤں سے کِھسکنا شروع ہو گئی۔ اِس کے بعد بڑے بڑے ترقی پسندوں کے چہرے دیکھنے والے تھے، وہ جو خدا کی خدائی کا مذاق اُڑانے میں پیش پیش رہا کرتے تھے، بے اختیار خُدا کے وجود کے قائل ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں خوف، ان کے چہروں پر وحشت اور ان کے سارے وجود پر مُردنی چھا گئی۔ بھونچال کو ایک جغرافیائی عمل سمجھنے والے مُلحد لمحہ بھر کے لیے کسی نا معلوم قوّت پر ایمان لائے۔ بہت سے کمیونسٹ، جو خدا کے بجائے کوسی جن اور ماوزے تنگ پر یقین رکھتے ہیں، دو منٹ کے لیے جدلیات بھول گئے اور اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی زندگی کی حفاظت کے لیے کچھ بُڑ بڑاتے ہوئے نظر آئے۔ بڑے بڑے قانون دان، جو بال کی کھال اُتارنے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں، ایک ہلکے سے جھٹکے کی تاب نہ لا کر یوں بدحواس بھاگنے لگے کہ جیسے انصاف کے ترازو کی ڈنڈی ان کے سروں

پر پڑنے والی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سیکرٹریٹ کا اس سے بھی بُرا حال تھا۔ وہاں بیٹھنے والے تو اپنے آپ کو خدا کا نائب تصوّر کرتے ہیں اور ان میں سے بعض کی ترقی پسندی ضرب المثل ہے۔ لیکن راویوں کا کہنا ہے کہ بھونچال کے ایک ہی جھٹکے سے خدا کے نائبوں اور پٹواریوں کی بولتی بند ہوگئی اور ترقی پسندوں نے لفٹوں کے ذریعے بلندیوں سے پستیوں کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ یہ تو رہا خدا کے منکروں اور باغیوں کا احوال، جو تقریباً ہر مقام، ہر مکان اور ہر دفتر میں ایک جیسا تھا۔ خدا کے ماننے والوں، اس کی مشیّت پر ایمان رکھنے والوں اور اس کی قدرت پر یقین رکھنے والوں کی حالت اس سے بھی بُری تھی۔ وہ جانتے تھے کہ وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔ انہیں اس بات پر یقین تھا کہ موت کا ایک دن معین ہے، لیکن اس کے باوجود زمین کی ایک جُنبش سے ان کے یقین اور ان کے ایمان کی جڑیں ہل گئیں۔ وہ بچوں کی طرح رو رہے تھے ان کے سارے وجود میں رعشہ تھا، وہ بھاگتے بھاگتے کئی مرتبہ گر پڑے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیوں بھاگ رہے تھے اور بھاگ کے کہاں جارہے تھے، کیا یہ نہیں جانتے تھے کہ موت پاتال تک ان کا پیچھا کرسکتی ہے۔ بہت سے لوگ بے تحاشا خُدا کا نام لے رہے تھے......اور مجھے اقبال کا یہ مصرعہ یاد آرہا تھا ؎

یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا۔

۳۱ / اگست ۱۹۲۶ء

میرا فیصلہ

لوک سبھا میں آزاد ممبر شری پرکاش ویر شاستری کی تحریک پر ایوان نے اتفاق رائے سے میرے خلاف مراعات شکنی کی تحریک کو پارلیمنٹ کی مراعات کمیٹی کے سپرد کر دیا ہے۔ اب مراعات کمیٹی یہ فیصلہ کرے گی، کہ آیا میں نے پارلیمانی مراعات کی خلاف ورزی کی ہے یا نہیں۔ اور اگر کی ہے تو میرے لئے کونسی سزا مناسب ہوگی، مراعات شکنی کے اس الزام کی بنیاد غالباً پندرہ اگست کے شمارے میں "یہ نہیں ہوگا" کے عنوان سے میرے اس اداریہ پر رکھی گئی ہے جس میں میں نے پارلیمنٹ میں ریاست کی درسی کتابوں کے متعلق بحث کے دوران بعض معزز ممبران کے رویّے پر تنقید کی ہے۔ میری معصیت یا معصومیت کا مسلہ چونکہ پارلیمنٹ کی مراعاتی کمیٹی کے زیر غور ہے، اس لئے اس مرحلے پر میں اپنے نکتہ نظر کی وضاحت اور صراحت میں چند باتیں کہنا چاہوں گا۔ مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ پارلیمنٹ ہمارے ملک کا سب سے معزز اور مقدس ایوان ہے اور ممبران پارلیمنٹ کو اپنے فرائض انجام دینے کے لئے غیر معمولی مراعات حاصل ہیں اور ہونا چاہیں۔ آئین میں ان مراعات کے متعلق صرف یہ کہا گیا ہے کہ جب تک قانون کی رو سے ان کی

آئینہ نما
آئینہ" میں شائع شدہ

حدود کا تعین نہ کیا جائے، ہندوستانی پارلیمنٹ کو وہی مراعات حاصل ہوں گی، جو برطانوی پارلیمنٹ کو حاصل ہیں۔ اس طرح آج اٹھارہ سال بعد بھی پارلیمنٹری مراعات کی نہ کوئی حد مقرر ہے اور نہ ان کی تشریح کے لئے کوئی مستند ضابطہ! نتیجہ یہ کہ بعض ممبران پارلیمنٹ نے مراعات خصوصی کو موقع بے موقع، محل بے محل استعمال کر کے ایک عجیب صورتحال پیدا کر دی ہے اور جس ''ہتھیار'' کو پارلیمنٹ کی خودمختاری اور ممبران پارلیمنٹ کی آزادی کے لئے تخلیق کیا گیا تھا، اسے آج پارلیمنٹ کی کارکردگی میں رخنہ اندازی پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ پارلیمنٹ کے موجودہ سیشن میں مراعات شکنی کی اتنی تحریکیں پیش ہوئی ہیں کہ مراعات کے متعلق عام تصور میں ایک انقلاب رونما ہو گیا ہے۔ عام لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ مراعات ممبروں کی آزادی رائے کی ضمانت سے زیادہ ان کی خودنمائی کا ذریعہ بن گئی ہیں۔ بہرکیف پارلیمانی مراعات کے اس بیجا استعمال کے باوجود میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ممبران کو خیال فکر اور اظہار کی مکمل آزادی حاصل ہونا چاہئے اور ان حقوق کی نگہداشت کے لئے پارلیمنٹ کو غیر معمولی اختیارات حاصل ہونا چاہئیں۔ لیکن ایک بات جس کی طرف معزز ممبران پارلیمنٹ نے غالباً توجہ نہیں کی ہے، وہ یہ ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ اور ہندوستان کی پارلیمنٹ میں ایک بنیادی فرق ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ کی خودمختاری کے متعلق اکثر کہا جاتا ہے کہ مرد کو عورت اور عورت کو مرد بنانے کے علاوہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ ہندوستان کی پارلیمنٹ کے متعلق ایسا کہنا صحیح نہیں ہوگا یہ ادارہ خودمختار اور با اختیار ہونے کے باوجود بعض ''رسوم و قیود'' کا پابند ہے اور اپنے وجود، طریق کار اور دائرہ کار کے لئے آئین ہند کا تابع ہے۔ اس طرح ہمارے ملک میں

پارلیمنٹ کی بجائے آئین کی سرداری مقدم اور مسلم ہے جبکہ برطانیہ میں پارلیمنٹ کو حرفِ آخر کی حیثیت حاصل ہے۔ اس بنیادی فرق کو ذہن میں نہ رکھنے کی وجہ سے بعض اوقات ہمارے بعض ممبران پارلیمنٹ اپنی مراعات کے تحفظ میں عام شہریوں کے بنیادی حقوق سے متصادم ہوتے ہیں۔ آئین کی رو سے ہر ہندوستانی شہری کو تحریر، تقریر، مذہب، عقیدے اور طرزِ رہائش اختیار کرنے کی آزادی حاصل ہے اور جب تک وہ ان آزادیوں کا صحیح اور جائز استعمال کرتا ہے، پارلیمنٹ کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتی، جس سے فرد کی آزادی کا دائرہ محدود یا متاثر ہو اور اگر پارلیمنٹ اپنے حقوق اور اختیارات سے تجاوز کر کے اس قسم کا کوئی قانون بنائے، تو ہمارے عدلیہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسے ناجائز اور ناقابل عمل قرار دے۔

اس اخبار کے پندرہ اگست کے شمارے میں ''یہ نہیں ہوگا'' کے عنوان سے میں نے اپنے اس نکتہ نظر کی وضاحت یوں کی تھی۔ ''ہم معزز ممبرانِ پارلیمنٹ کا احترام کرتے ہیں۔ ہمیں ملک کی سالمیت، خود مختاری اور وقار کے تئیں ان کی نازک مزاجی کا بھی احساس ہے، لیکن ہم انہیں کبھی یہ حق دینے کے لئے تیار نہیں کہ وہ اپنے حقوق کا غلط استعمال کر کے دوسروں کے حقوق پامال کرنے کی سعی کریں۔'' میں نہیں جانتا کہ میرے اس اظہار سے بعض ممبرانِ پارلیمنٹ کی جبینوں پر شکن کیوں آ گئی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس انداز بیان سے کن پارلیمانی مراعات کی خلاف ورزی ہوئی ہے لیکن اس مرحلے پر بلا کسی خوف اور اندیشے کے اپنے اس عزم کا ارادہ کرنا چاہوں گا کہ پارلیمنٹ کی مراعات کی کمیٹی کا فیصلہ کچھ بھی ہو، میں اپنے بنیادی حقوق سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں نے کشمیر کی جنگ آزادی کے تقدس، نیا

کشمیر کی عظمت، ہندوستانی فرقہ پرستوں کی نا معقول روش اور بعض ممبرانِ پارلیمنٹ کی ناواقفیت کے متعلق اپنے ادارے میں جو کچھ کہا ہے، میں اُسے حرف بحرف دہراتا ہوں اور مجھے اس بات پر وشواس ہے کہ میری تحریر سے پارلیمنٹ یا ممبران پارلیمنٹ کی تحقیر کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ میں خلوص دل سے پارلیمنٹ کا احترام کرتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ ہندوستان کی پارلیمنٹ کے وقار میں روز بروز اضافہ ہو اور اسی لئے جب بعض ممبران حقائق سے آنکھیں چُرا کر تنگ نظری، تعصب اور جذباتیت کے شکار ہو جاتے ہیں تو ایک محبِّ وطن ہندوستانی کی حیثیت سے یہ میرا فرض بن جاتا ہے کہ انہیں حقائق کا احساس دلاؤں۔ میں ایمانداری سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے پارلیمنٹ کے بعض ممبر اپنی ذاتی تشہیر کے لئے ملک کی تحقیر کا سامان کرتے ہیں، میں دیانتداری سے اس بات کا قائل ہوں کہ کئی ممبران جان بوجھ کر ہندوستان اور کشمیر کے باہمی تعلق کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے میں اس لئے خاموش رہوں کہ پارلیمنٹ کو غلط سوچنے، غلط سمجھنے اور غلطیاں کرنے کی ''مراعات'' حاصل ہیں۔

ریاست کی درسی کتابوں کے سلسلے میں چند ہفتے قبل پارلیمنٹ میں جو ہنگامہ ہوا وہ یقیناً بڑی شدید غلط فہمیوں کا نتیجہ تھا۔ اور اس کا کشمیر میں غیر معمولی ردِ عمل ہوا ہے اور میں نے ''یہ نہیں ہوگا'' کے عنوان سے اسی ردعمل کو الفاظ کی گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ اگر حقائق کے اظہار اور صداقت پر اصرار کرنے سے کسی ایوان کو حاصل شدہ مراعات کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو حقائق اور صداقت کو بدلنے کی بجائے ان مراعات کو بدلنا زیادہ مناسب رہے گا، جو حقائق سے ٹکرا کر صداقت پر پردہ ڈالنے کی روادار ہیں۔

''آئینہ'' کے خلاف مراعات شکنی کی تحریک کے اتفاقِ رائے سے پاس ہونے کے بعد پارلیمانی مراعات کا ضابطہ مرتب کرنے کی اہمیت اپنی پوری شدت کے ساتھ واضح ہوگئی ہے۔ ممبران پارلیمنٹ کی مراعات مسلّم، لیکن اخبار نویسوں کو بھی کچھ مراعات حاصل ہیں اور جوں جوں ممبران پارلیمنٹ کی نازک مزاجی بڑھتی جائے گی، پریس اور پارلیمنٹ کا تصادم بھی ناگزیر ہوتا جائے گا۔ اسلئے میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گا کہ پارلیمانی مراعات کی خلاف ورزی کے الزام میں صرف میں ہی ماخوذ نہیں، ہندوستان کا وہ ہر شہری اور اخبار نویس ماخوذ ہے، جو فرد کی آزادی اسکے بنیادی حقوق اور فرائض کی اہمیت کو سمجھتا ہے، جو خودمختاری کے ساتھ آئین کی سرداری کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ فیصلہ میرے حق میں ہوگا یا میرے خلاف۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ اس فیصلے سے ہندوستانی صحافت کی عظمت، فرد کی آزادی اور اور جمہوریت کا تقدس وابستہ ہے۔ اسی لئے میں نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے ہر قیمت ادا کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس ''جنگ'' میں ہندستان ہی نہیں، دنیا بھر کے جمہوریت پسندوں اور صحافیوں کی ہمدردیاں میرے ساتھ ہیں۔

۳۱/اگست ۱۹۶۶ء

یہ چلتے پھرتے جہنم!

پچھلے دنوں سیاحوں کے استقبالیہ مرکز میں ریاست کی کلچرل اکاڈمی کے زیرِ اہتمام منعقد کئے گئے مشاعرے میں جب جناب اختر انصاری نے یہ شعر پڑھا ۔

آدم نے بنا ڈالے جہنم لاکھوں
تو ایک جہنم کو لئے بیٹھا ہے

تو نہ معلوم چراغ بیگ کی توجہ فوراً سٹی بس سروس کی طرف کیوں منتقل ہوگئی! اب جو سوچتا ہوں تو اس کا نفسیاتی پسِ منظر سمجھ میں آجاتا ہے۔ خدا میری پھٹیچر سائیکل کو چشمِ بد سے بچائے رکھے کہ اس کے ہوتے ہوئے مجھے سٹی بس سروس میں سفر نہیں کرنا پڑتا اور اسی لئے مجھے اس سے پہلے کبھی یہ اندازہ نہ تھا کہ یہ چلتے پھرتے جہنم، جنہیں عرفِ عام میں سٹی بس سروس یا رُورل بس سروس کہتے ہیں، کس درجہ تکلیف دہ، اذیت بخش اور عبرت ناک ہو سکتے ہیں۔ پچھلے ہفتے میری سائیکل جو کثرتِ استعمال سے مریضِ جاں بہ لب کی کیفیت سے دوچار ہے، میری زیادتیوں کی تاب نہ لاکر دم توڑ بیٹھی اور ناچار مجھے سٹی بس سروس کا سہارا لینا پڑا۔ ایک دن کے اندر اندر میں نے چلتے پھرتے جہنموں کے متعلق وہ سب کچھ جان لیا، جسے جان کر میں نے دوبارہ کبھی بس میں سفر نہ کرنے کی قسم کھائی ہے۔ بد اخلاق ڈرائیور، بدتمیز اور گنوار کنڈکٹر، بے ہنگم اور نامعقول لوگ، گندی سڑی بسیں، ٹکٹوں کی چوری، ٹکٹ

چیکروں کی بے ایمانیاں۔۔ غرض ایک طوفان بدتمیزی بپا ہے اور اگر آپ ان بسوں میں سفر کرنا چاہتے ہیں تو آپ کے لئے اس طوفان کا مقابلہ کرنا ہی نہیں بلکہ اس کا ایک حصہ بننا ضروری ہے۔ کنڈیکٹر آپ کو ضرور گالی دے گا اور آپکو گالی کا جواب گالی سے دینا پڑے گا۔ ڈرائیور صاحب زبان ومکان کی قید سے آزاد ہیں۔ وقت کی پابندی کا وہ اتنا ہی احترام کرتے ہیں جتنا میں روزوں کی پابندی کا۔ بس میں گھستے گھستے آپ کی قمیض بھی پھٹ سکتی ہے اور بعض اوقات غلط مقام پر آپ کی پتلون مجروح ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔ آپ کے ہم سفر آپ کی خواہشات کا احترام کئے بغیر آپ سے دھینگا مشتی پر آمادہ! جس بس میں ۴۰ آدمیوں کے سفر کرنے کی اجازت ہے، اس میں بیک وقت ۷۵ مسافر سفر کریں گے اور اس کے باوجود مزید لوگ اندر آنے کی کوشش میں ایک دوسرے سے بازی لیں گے۔ الغرض یہ کہ بس میں سفر کرنے سے ''کش مکشِ حیات'' کی ریہرسل ہو جاتی ہے اور ایک بار جب آپ اس جہنم کی چار دیواری میں داخل ہو گئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میونسپلٹی کی کوڑا کرکٹ والی گاڑی میں سوار ہیں۔ سیٹیں پھٹی ہوئی، شیشے ٹوٹے ہوئے، کھڑکیوں سے چٹخیاں غائب، فرش پر دنیا بھر کی غلاظت۔ یعنی ہر وہ چیز موجود ہے جو آپ کو اپنی زندگی سے متنفر کرنے میں ممدومعاون ہو گی۔ القصہ اگر خدا کو معلوم ہو کہ ہماری سٹی بس سروس کے منتظمین نے اس سروس میں اذیتوں کے کتنے سامان میسر کر رکھے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ جہنم کو زیادہ عبرت ناک بنانے کے لئے ان کی خدمات حاصل کرنے میں تامل نہ کرے گا!

❁❁❁

۳۰ر نومبر ۱۹۶۶ء

مجھے کچھ کہنا ہے

جموں کے افسوسناک واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے تین ہفتے قبل میں نے اسی اخبار میں لکھا تھا کہ

''....ان واقعات نے اس نفسیاتی خلیج کو گہرا کر دیا ہے جو دو لسانی اکائیوں کے درمیان بعض تاریخی وجوہات کی بنا پر موجود ہے اور جس نے ایک نہایت ہی ناپسندیدہ اور مریضانہ ذہنی عصبیت کو جنم دیا ہے۔ اس صورتِ حال کو سمجھنے اور اس الجھن کو سُلجھانے کے لئے میرے خیال میں عام انتخابات کے فوراً بعد ڈاکٹر کرن سنگھ کے لسانی فارمولہ پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت پہلے سے زیادہ شدید ہو گئی ہے۔ کیونکہ جموں کا حالیہ سانحہ براہ راست جموں کی اس مجروح انانیت کی علامت ہے، جو اپنے اظہار کا وسیلہ چاہتی ہے''۔ طلباء پر فائرنگ کے بعد سے پچھلے ایک مہینے کے دوران جموں میں جو کچھ ہوتا رہا، اس نے میرا یہ اندازہ صحیح ثابت کر دیا ہے کہ مستقبل قریب میں جموں اور کشمیر کو ایک ساتھ رکھنا تقریباً ناممکن ہو جائے گا اور میں ایک بار پھر اہل سیاست، اہل نظر اور اہل دانش کی توجہ اس تلخ اور ناگوار حقیقت کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ جموں اور کشمیر کا اتحاد ایک ایسا فرضی نقطہ ہے جس کی تلاش میں ہم نے نہ صرف ۱۹ برس ضائع کر دئے بلکہ بہت سے اصولوں اور آدرشوں کو بھی

قربان کر دیا۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۶۶ء تک کی تاریخ گواہ ہے کہ سیاسی، نفسیاتی اور جذباتی طور پر جموں اور کشمیر متوازی نہیں، بلکہ دو متضاد راہوں پر سفر کرتے رہے ہیں۔ ان ۱۹ برسوں میں ایک بھی ایسا لمحہ نہیں آیا جب ان دو لسانی اور تہذیبی اکائیوں کی امنگوں اور آرزوؤں میں کوئی اشتراک پیدا ہوا ہو، کشمیر شروع سے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لئے مضطرب رہا ہے اور جموں اپنی شخصیت کو پورے ملک کے ساتھ جذب کرنے کے لئے بے چین! کشمیر دفعہ ۳۷۰ کو اپنی آزادی کا چارٹر سمجھتا ہے اور جموں اسے ختم کرانے کے درپے، جموں اپنا کھویا ہوا اقتدار ڈھونڈ رہا ہے اور کشمیر اپنی کھوئی ہوئی آزادی، غرض دونوں خطے اپنی تقدیر تلاش کر رہے ہیں اور اس تلاش میں ایک دوسرے سے یوں متصادم ہیں۔ کہ جب تک دونوں کو اس بات کا احساس نہ ہو جائے کہ ان کی محرومیاں اور تضاد دراصل ڈاکٹر کرن سنگھ کے الفاظ میں ایک ''انتظامی بہیمت'' کی پیداوار ہیں اور جذباتیت اور کھوکھلی وحدت کے نعروں کی سطح سے بلند ہو کر بنیادی مسلے کو حل کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو باہمی تشکیک نفرت، حقارت اور تصادم کا موجودہ ماحول ختم ہونے کی بجائے اور زیادہ زہر آلود ہوتا جائے گا۔ اس وقت جموں کے لوگ بڑی ''دیانتداری'' اور ''خلوص'' کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ ان پر کشمیری راج کر رہے ہیں ان کے لیڈروں نے انہیں اس بات کا یقین دلایا ہے کہ سرکاری ملازمتوں، تعلیمی اداروں، تعمیری منصوبوں اور ترقیاتی سکیموں میں اہل جموں کے ساتھ ناقابل برداشت امتیازی سلوک روا رکھا جا رہا ہے اور کشمیریوں کو ہر شعبۂ زندگی میں ترجیح دی جارہی ہے۔ ادھر اہل کشمیر کا یہ عقیدہ روز

بروز راسخ ہوتا جا رہا ہے کہ اصلی طاقت جموں کے ہاتھ میں ہے اور
دراصل پچھلے اٹھارہ برسوں سے جموں ہی کشمیر پر حکمران ہے۔ وہاں کے
لوگ جو چاہیں کرا سکتے ہیں، انہیں ہر طرح کی آزادی حاصل ہے اور وہ
صحیح معنوں میں ہندوستانی جمہوریت سے مستفید ہو رہے ہیں۔ طلبأ کی
حالیہ ایجی ٹیشن اور اس کے تئیں ریاستی حکومت کے رویے نے اس خیال
کو غیر معمولی تقویت بخشی ہے اور کشمیر کے لوگ بڑی ایمانداری سے یہ
بات محسوس کرنے لگے ہیں کہ جموں کے مقابلے میں ان کی حیثیت
دوسرے درجے کے شہریوں کی سی ہے۔ یہاں اس بحث سے کوئی فائدہ
نہیں ہوگا کہ دونوں خطوں میں رہنے والے لوگوں کی یہ شکایات حقائق پر
مبنی ہیں یا تو ہم پر، لیکن اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ باہمی
تشکیک، حسد اور جلن کا وہ ماحول قائم ہے، جو چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی
بڑی حقیقتوں کا لبادہ پہنا دیتا ہے اور اس طرح بعض تو ہمات رفتہ رفتہ
ناقابل تردید حقیقتیں بن جاتی ہیں اور مجھے یہ کہتے ہوئے بے حد افسوس
ہو رہا ہے کہ ہمارے ناعاقبت اندیش رہنماؤں نے بھی بہت سے ان
اندیشوں اور وسوسوں کو صحیح ثابت کر دیا ہے جو دونوں خطوں میں رہنے
والے لوگوں کے دلوں میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے ہیں اور اب وہ
منزل آپہنچی ہے کہ میں بڑی ایمانداری اور خلوصِ نیت سے اس بات کا
اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ جموں اور کشمیر موجودہ ''انتظامی بہیمیت'' کے
تحت ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ آج سے ایک سال قبل جب
ڈاکٹر کرن سنگھ نے ریاست کو لسانی بنیادوں پر از سر نو تشکیل دیئے جانے
کا فارمولا پیش کیا تھا، تو غالباً میں کشمیر کا واحد اخبار نویس تھا جس نے

اس کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی تھی۔ گذشتہ ایک سال کے واقعات نے مجھے اپنے نظریات کی صحت کا پہلے سے زیادہ قائل کر دیا ہے اور اسی لئے میں اب زیادہ شدت اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی اس بصیرت کو عام کرنا چاہتا ہوں کہ جموں اور کشمیر کے درمیان کوئی ایسی قدر مشترک باقی نہیں رہی ہے جو اس کی سیاسی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے جواز بن سکے۔ میں جانتا ہوں کہ میرے بہت سے دوست میرے اس بیان کو میری انتہا پسندی، مایوسی اور انتشار کی پیداوار قرار دے کر ایک بار پھر اُن گھسے پٹے تاریخی اور جدلیاتی مفروضوں کا سہارا لیں گے جنہیں وقت کی بے رحم کسوٹی نے غلط اور گمراہ کن ثابت کر دیا ہے۔ لیکن مجھے یہ اطمینان حاصل ہے کہ جموں کے حالیہ واقعات نے ان ذہنوں میں بھی تلاطم پیدا کر دیا ہوگا، جو تاریخی حقائق کو جذبات اور سیاسی مصلحت کا تابع بنانا چاہتے تھے، جو ہر انقلابی تصور کو شک وشبہ کی نگاہوں سے دیکھ کر ان روایتی بندھنوں سے چمٹے رہنے میں اپنی عاقبت سمجھتے تھے، جن کی افادیت اور اہمیت مشکوک ہے۔ جموں کے حالیہ دھماکے نے بہت سے سوئے ہوئے سمندروں میں بھی ارتعاش اور اضطراب کی لہریں پیدا کر دی ہوں گی۔

میں اس مرحلے پر ایک بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں، وہ یہ کہ ذاتی طور پر میرا روّیہ جموں کے تئیں بہت ہی ہمدردانہ اور مخلصانہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ جموں نے کشمیر کو ہندوستان کا ایک حصہ بنائے رکھنے کے لئے بہت بڑی قیمت ادا کی ہے اور سیاسی شطرنج میں کشمیر کے مہرے کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے، اس نے جموں

کی توقیر اور اس کی انفرادیت کو بہت حد تک مجروح کر دیا ہے۔ میں ایمانداری سے یہ بات محسوس کرتا ہوں کہ جموں کو اپنے وجود، اپنی انفرادیت اور اپنی توقیر بحال کرنے کے تمام مواقع فراہم ہونے چاہئیں۔ اس لئے جب میں جموں اور کشمیر کی علیٰحدگی کی بات کرتا ہوں تو نہ صرف جموں اور کشمیر کے نفسیاتی اور سیاسی تضاد کو دور کرنا چاہتا ہوں، بلکہ جموں کی کھوئی ہوئی تقدیر کی تلاش میں اہل جموں کا ساتھ دیتا ہوں۔

جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے ایک کشمیری ہونے کے ناطے میں ان تمام نفسیاتی الجھنوں اور سیاسی تضادات کا مرکز ہوں، جو ایک غیر فطری وحدت کی پیداوار ہیں اور جن کی وجہ سے کشمیر کی سیاسی، ذہنی، سماجی اور اقتصادی صحت بُری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ جموں اور کشمیر کو ایک سیاسی وحدت تسلیم کرنے کے بعد میرے پاس ان ناقابل توجیہہ ''صداقتوں'' کو سمجھنے کا کوئی وسیلہ باقی نہیں، جو ہر لمحہ اپنے وجود کا اعلان کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جموں اور کشمیر ایک ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے اس قدر مختلف کیوں ہیں؟ زبان، مذہب، کلچر اور تاریخ کے گہرے اختلاف کے باوجود یہ ایک انتظامی وحدت میں کیوں کر منسلک ہیں؟ ان کی اُمنگوں، آرزوؤں اور منزل مقصود میں کوئی اشتراک کیوں نہیں ہے؟ جموں کی فضا میں آزادی اور کشمیر کے ماحول میں گھٹن کا احساس کیوں ہوتا ہے؟ جب جموں احتجاج کرتا ہے تو پورے ملک کی ہمدردیاں اس کے ساتھ کیوں ہو جاتی ہیں؟ جب کشمیر کا پیمانہ صبر لبریز ہوتا ہے، تو وہ پورے ملک کی نگاہوں میں معتوب کیوں قرار پاتا ہے؟ اگر اہل جموں کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ کشمیری ان پر راج کر رہے ہیں تو کشمیر کی بے

اطمینانی، ناآسودگی اور بے چینی میں روز بروز اضافہ کیوں ہوتا جا رہا ہے؟ قوم پرست کشمیری لیڈروں کی قوم پرستی کا مزار جموں ہی میں کیوں بنتا ہے؟ پچھلے اٹھارہ برسوں میں جموں اور کشمیر کے درمیان کوئی بامقصد مکالمہ کیوں نہیں ہو پاتا؟ تحریر وتقریر، اجتماع واحتجاج کی جو آزادیاں اہل جموں کو نصیب ہیں، ان سے کشمیر محروم کیوں ہے؟ اور اسی طرح کے بہت سے سوالات ذہن کے افق پر نمودار ہو کر ''فرضی وحدت'' کے دھندلکوں میں کھو جاتے ہیں۔ ان کا جواب ڈھونڈتے ہوئے میری بے چین روح کی سانس پھول گئی ہے اور میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ یہ دراصل سوالات نہیں کچھ ناگوار حقیقتیں ہیں، جن کو سمجھنے کے لئے ذہن کی کھڑکیوں پر پڑے ہوئے تالے کھول دینا ضروری ہیں۔

میرے نزدیک ڈاکٹر کرن سنگھ کا پیش کردہ لسانی فارمولہ جموں اور کشمیر کی موجودہ اُلجھن کو حل کرنے کا آخری نسخہ نہیں ہے۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ اس کو عملی شکل دینے میں بعض غیر معمولی دِقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن میں اس فارمولہ سے زیادہ اس سیاسی تجزیئے کو اہمیت دیتا ہوں، جو اس کا محرک ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا فارمولہ ایک نقطۂ آغاز ہوسکتا ہے اور اس کو اصولی طور پر تسلیم کئے جانے کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم اس مسئلے کے وجود کا اعتراف کر کے اس کے عناصر ترکیبی کو سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ آئندہ عام انتخابات سے قبل اس سلسلے میں کسی فیصلہ کُن قدم کی توقع رکھنا بے کار ہے۔ لیکن انتخابات کے فوراً بعد جموں اور کشمیر کی قیادت کو ایک ساتھ بیٹھ کر اس الجھن کا کوئی مستقل حل ڈھونڈھ نکالنا ہوگا۔ جموں میں طلباء کی حالیہ ایجی ٹیشن کے بعد سے جموں

کی اندرونی خودمختاری کا مطالبہ زور پکڑنے لگا ہے اور اس نعرے کو جس طور بھی پیش کیا جائے، اس کا اصلی مقصد سیاسی اور انتظامی سطح پر جموں اور کشمیر کی علیٰحدگی ہے۔ یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ موجودہ حالات میں جموں اور کشمیر کا ایک فرضی اور غیر حقیقی سیاسی وحدت بنے رہنا، مسائل کو سلجھانے کی بجائے اور زیادہ الجھا دے گا۔ کشمیری لیڈروں کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہیئے کہ جموں کے لوگ ان کے خلوص اور ایمانداری پر ہرگز ایمان نہیں لا سکتے۔ ان پر چونکہ یہ ''راز'' افشاء ہو چکا ہے کہ برسرِ اقتدار جماعت یا گروہ کو کشمیری عوام کا اعتماد حاصل نہیں ہوتا، اس لئے وہ ہر نازک مرحلے پر کشمیری قیادت کو بلیک میل کر کے اپنے جائز اور ناجائز مطالبات کے لئے ضد کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ شیخ محمد عبداللہ سے لے کر غلام محمد صادق تک کسی بھی لیڈر کو جموں کی حمایت یا تعاون حاصل نہیں ہو سکا۔ کیونکہ جموں کے نزدیک ہر کشمیری لیڈر ایک ایسا غاصب ہے جس نے اُسے اقتدار اعلیٰ سے محروم کر دیا ہے۔ ان حالات میں صادق صاحب یا ان کے ساتھیوں کا روایتی بندھن، اٹوٹ، وحدت اور ناقابل تقسیم ورثے کا راگ الاپنا محض ایک خودفریبی ہے، مجھے اس بات کا زبردست اندیشہ ہے کہ اگر جلد اس علاقائی قومیت کی تسکین کا سامان نہ کیا گیا، تو خود صادق صاحب کی حب الوطنی، قومیت اور حریت فکر کا مقبرہ بھی جموں میں ہی تعمیر ہو گا۔

❁❁❁

۷ دسمبر ۱۹۶۶ء

شاندار فتح

لوک سبھا کی مراعتی کمیٹی نے ''آئینہ'' کے خلاف آزاد ممبر پرکاش ویر شاستری کی پیش کردہ مراعت شکنی کی تحریک کے متعلق اپنا فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ کمیٹی کی رائے میں ۱۵/اگست کے شمارے میں شائع شدہ اداریہ ''یہ نہیں ہو گا'' سے بحیثیت مجموعی مراعت شکنی یا ایوان کی توہین کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ اگرچہ اس کے بعض حصے سخت زوردار، ناپسندیدہ اور غیر ذمہ دارانہ زبان میں ہیں، جو ایک ذمہ دار اخبار کو زیب نہیں دیتے''۔ اس سے قبل راجیہ سبھا کی مراعتی کمیٹی نے بھی ''آئینہ'' کو باعزت طور پر بری کرتے ہوئے یہ فیصلہ دیا تھا کہ ''یہ نہیں ہوگا'' کو بحیثیت مجموعی پڑھنے سے مراعت شکنی کا الزام ثابت نہیں ہو سکتا۔ پورے تین ماہ بعد لوک سبھا کی مراعتی کمیٹی نے راجیہ سبھا کی مراعتی کمیٹی کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے ''آئینہ'' کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا۔ پارلیمنٹ میں جب بھی کسی اخبار کے خلاف مراعت شکنی کی تحریک پیش ہوتی ہے، تو عام طور پر ایڈیٹر لوگ معافی مانگ کر اپنی گلو خلاصی کرتے

ہیں۔ مجھے بھی بعض ''جہاں دیدہ'' اور ''تجربہ کار'' دوستوں نے یہی مشورہ دیا تھا کہ میں بھی اپنے ناکردہ گناہوں کے لئے معافی مانگ کر معاملے کو ختم کردوں، لیکن میرے نزدیک یہ معاملہ صرف ''آئینہ'' اور پارلیمنٹ کے درمیان ہی نہیں، پورے پریس اور ایوان نمائیندگان کے درمیان تمام حُجت کی حیثیت رکھتا تھا، اس لئے میں نے معافی مانگنے یا اظہار معذرت کرنے کی بجائے پارلیمنٹ کا چیلنج قبول کرلیا۔ ۳۱ راگست کے شمارے میں ''میرا فیصلہ'' کے عنوان سے میں نے اپنے نکتۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا۔

''لیکن اس مرحلے پر بلاکسی خوف اور اندیشے کے اپنے اس عزم کا اعادہ کرنا چاہوں گا کہ پارلیمنٹ کی مراعاتی کمیٹی کا فیصلہ کچھ بھی ہو، میں اپنے بنیادی حقوق سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں نے کشمیر کی جنگ آزادی کے تقدس، نیا کشمیر کی عظمت، ہندوستانی فرقہ پرستوں کی نا معقول روِش اور بعض ممبران پارلیمنٹ کی ناواقفیت کے متعلق اپنے اداریے میں جو کچھ کہا ہے، میں اُسے حرف بحرف دہراتا ہوں اور مجھے اس بات پر وشواس ہے کہ میری تحریر سے پارلیمنٹ یا ممبران پارلیمنٹ کی تحقیر کا کوئی پہلونہیں نکلتا۔''

پارلیمنٹ کی مراعات کمیٹی کے فردِ جرم کا جواب دیتے ہوئے میں نے اپنے تحریری بیان میں بڑے زور دار طریقے پر اپنے موقف کی وضاحت کی۔ میں نے ہندوستانی آئین میں درج فرد کے بنیادی حقوق کا سہارا لے کر معزز ممبران پارلیمنٹ پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ مراعات کے مقابلے میں حقوق کو زیادہ فوقیت حاصل ہے اور جب

تک ایک صحافی آئین کی حدود کے اندر رہ کر اپنے ''حقوق'' کا استعمال کرتا رہے گا، ملک کی کسی عدالت یا ایوان کو اس کے خلاف کوئی کاروائی کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ میں نے برٹش پارلیمنٹ اور انڈین پارلیمنٹ کے بنیادی فرق کو واضح کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ ہندوستان میں پارلیمنٹ نہیں، بلکہ اس ملک کا آئین سب سے مقدم اور افضل ہے۔ جبکہ برطانیہ میں پارلیمنٹ کا درجہ آئین اور قانون سے بھی برتر ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ پارلیمنٹ کی مراعتی کمیٹی (جس میں ملک کے کچھ نامور قانون دان بھی شامل ہیں) نے میرے نکتہ نظر کی صحت کو تسلیم کر کے میرے خلاف پیش کی گئی مراعات شکنی کی تحریک پر کسی قسم کی مزید کاروائی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں اسے صرف اپنی اور ''آئینہ'' کی ہی نہیں بلکہ صحافتی دنیا کی شاندار فتح تصور کرتا ہوں۔

یکم جنوری ۱۹۶۷ء

گناہِ بے لذت

ریاست جموں وکشمیر میں کانگریس پہلی مرتبہ ایک کل ہند جماعت کی حیثیت سے انتخاب لڑ رہی ہے۔ اس لئے جائز طور پر اس بات کی توقع تھی کہ انتخاب کے لئے اُمیدواروں کو نامزد کرتے وقت ذاتی پسند و ناپسند کی بجائے جماعتی وقار اور استحکام کو مدنظر رکھا جائے گا۔ خواجہ غلام محمد صادق اور پردیش کانگریس کے دوسرے زعماء نے متعدد بار اپنے اس ارادے کا اظہار کیا تھا کہ آئندہ انتخاب میں بُری شہرت رکھنے والے موجودہ ممبروں کو دوبارہ ٹکٹ نہیں دیا جائے گا اور لیجسلیچر میں نیا خون داخل کرنے کی ہرممکن کوشش کی جائے گی۔ لیکن کانگریسی اُمیدواروں کی فہرست شائع ہوتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا! اُمیدواروں کی اس فہرست میں بُری شہرت والے وہ خوش قسمت بھی ہیں کہ جن کے متعلق صادق صاحب اور قاسم صاحب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ سیاسی زندگی میں ان کا وجود ایک رِستے ہوئے ناسور سے کم نہیں۔ وہ منحوس چہرے بھی ہیں،، جن کے ساتھ نا اہلیت اور نا قابلیت کا تصور کچھ اس طرح وابستہ ہو گیا ہے کہ انہیں ایک نظر دیکھتے ہی

کشمیر کی بد قسمتی پر آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے۔ وہ ابن الوقت، خودغرض اور ریاکار بھی ہیں، جو صرف چڑھتے سورج کی پرستش کر سکتے ہیں اور جنہوں نے پچھلے پندرہ سولہ برسوں میں ریاست کی سیاست کو کثافت سے بھر دیا ہے۔ غرض کانگریس نے اس فیصلہ کن مرحلے پر ریاستی سیاست کے چہرے سے کلنک کے داغ مٹانے کی بجائے اپنے چہرے پر کچھ اور سیاہی مل لی۔ نئے اور تازہ خون کے نام پر کچھ نئے چہروں کو متعارف کرنے کی سعئ بجائے خود قابل تعریف ہے، لیکن بدقسمتی سے نئے چہروں کو منتخب کرتے وقت ریاستی کانگریس کے رہنماؤں نے کانگریس کی نظریاتی اساس اور سیاسی پروگرام کو نظر انداز کر کے افراد کی ذاتی وفاداریوں کو انتخاب کا معیار بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ نئے چہروں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں کہ جن کا کوئی ماضی نہیں اور وہ بھی کہ جن کا سارا ماضی داغ دار ہے۔ اُمید واروں کی اس فہرست کا سب سے قابل اعتراض پہلو یہی ہے کہ اس میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں، جو کانگریس کے بنیادی نظریات سے ناواقف ہی نہیں بلکہ ان کے شدید مخالف ہیں۔ جو نہ سیکولرزم پر یقین رکھتے ہیں اور نہ سوشلسٹ طرز کے سماج پر، جو کانگریس میں صرف اس لئے شامل ہوئے ہیں کہ یہ جماعت برسر اقتدار ہے۔ انتہائی افسوسناک بات یہ ہے کہ کانگریس نے ایسے افراد کو منتخب کر کے ریاست میں کانگریس کے مستقبل کو ہمیشہ کیلئے مخدوش بنا دیا ہے۔ کیونکہ ساری دنیا پر یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ کانگریس کے اونچے ایوانوں میں جگہ پانے کے لئے کانگریس کے نظریات یا اس کے سیاسی مسلک پر ایمان لانا قطعی غیر ضروری ہے، صرف چند کانگریسی رہنماؤں

کی خوشنودی حاصل کرنا لازمی ہے خود کانگریسی رہنماؤں نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ انہیں کانگریس کے مستقبل سے زیادہ اپنے مستقبل سے دلچسپی ہے۔ ورنہ ایسے مشکوک سیاسی کردار والے افراد کو کانگریس کا ٹکٹ دینے کا کوئی جواز نہیں، جن کی سیاسی زندگی فریب، مکر، ریا اور بے ایمانی سے بھری پڑی ہے۔ بظاہر ان لوگوں کو کانگریس کا منڈیٹ دینے کی صرف یہی ایک وجہ ہو سکتی ہے کہ اُنہوں نے رہنمایان قوم کو اپنی ذاتی وفاداری کا یقین دلایا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو پُرانے، تجربہ کار اور آزمائے ہوئے دیانت دار کارکنوں کے مقابلے میں ترجیح دی گئی۔

سیکولرازم اور سماجی انصاف کے علمبرداروں نے بعض مقامات پر ایسے ایسے ناروا اور غیر صحت مند سمجھوتے کئے کہ رہنماؤں کا خلوص اور ان کی نظریاتی سلامتی بھی مشکوک ہو کر رہ گئی۔ مثلاً حبہ کدل کے حلقۂ انتخاب سے شری شِوانرائن فوطیدار کو صرف اس لئے نامزد کیا گیا کہ اس حلقہ انتخاب میں کشمیری پنڈت ووٹروں کی فیصلہ کن تعداد موجود ہے اور شری فوطیدار فرقہ پرست کشمیری پنڈتوں کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔ با الفاظ دیگر ریاستی کانگریس نے فرقہ پرستوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے فرقہ پرستی کے ساتھ سمجھوتہ کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اسی طرح بڈگام میں ایک مشکوک کردار والے صاحبزادے کو بہت سے پُرانے اور تجربہ کار کارکنوں پر صرف اس لئے ترجیح دی گئی کہ اُسے شعیہ فرقے کے مذہبی رہنما آغا صاحب کی حمایت حاصل تھی۔ صاحبزادے کو واقعی آغا صاحب کی حمایت حاصل ہے یا نہیں ہمیں اس سے بحث نہیں لیکن اگر

کانگریس کا مقصد کچھ اصولوں اور آورشوں کو فروغ دینا ہے تو کیا مذہبی رہنماؤں کی سفارش اور حمایت پر اصولوں کو قربان کر دینے سے یہ جماعت اپنے وقار میں اضافہ کر سکتی ہے؟ کانگریس ملک بھر میں اپنی موقع پرستی اور ناجائز گٹھ جوڑوں کے لئے بدنام ہے لیکن ریاستی کانگریس کے رہنماؤں کو یہ سوچ لینا چاہیے تھا کہ ملک کے دیگر حصوں میں کانگریس کی جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ وہ ان غلط کاریوں کے باوجود کچھ دیر کے لئے زندہ رہ سکتی ہے۔ لیکن اس ریاست میں ابھی تک صحیح طور پر کانگریس کی بنیاد بھی نہیں پڑی ہے، اس لئے یہاں کانگریس موقع پرستی اور ناجائز گٹھ جوڑوں کی ''عیاشی'' کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہاں کانگریس کی ''امیج'' قائم کرنے کا سوال تھا اور بدقسمتی سے ریاستی کانگریس کے رہنما اس موقع سے فائدہ نہیں اُٹھا سکے۔ ان کے غلط فیصلوں نے کانگریس کا رہا سہا وقار بھی خاک میں ملا دیا۔ ہمارے نزدیک اس اخلاقی اور نظریاتی انحطاط کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ کانگریس ہر قیمت اور ہر حال میں اقتدار سے وابستہ رہنا چاہتی ہے اور اس جماعت کا مقصد اب صرف اقتدار کا تحفظ رہ گیا ہے اور اسی لئے وہ شرمناک سمجھوتہ بازی اور عریاں موقع پرستی کا سب سے منظّم اور فعال ادارہ بن گئی ہے۔ یہ صورت حال اس لحاظ سے تشویشناک ہے کہ ابھی تک ملک میں کوئی ایسی متبادل سیاسی تنظیم نہیں اُبھری ہے، جو کانگریس کی جگہ لے سکے۔ اس لئے چار ناچار ملک کو ابھی بہت دنوں کے لئے کانگریس استعمار اور اقتدار کے نظارے دیکھنا پڑیں گے۔

ہم ریاستی کانگریس کے رہنماؤں کو یہ پُرخلوص مشورہ دیتے ہیں

کہ وہ بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کی بجائے اپنے لئے نئی راہیں نکالیں کیونکہ کشمیر کے مخصوص سیاسی ماحول میں صرف اقتدار کی حفاظت ہی مقدم نہیں، کچھ اصولوں اور آورشوں کی عزت و عصمت کا تحفظ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کانگریسی رہنماؤں نے انتخاب کے لئے امیدواروں کے انتخاب میں ان اصولوں کا احترام کرنے کی بجائے انہیں پامال کرکے نہ اقتدار کا تحفظ کیا ہے اور نہ اقدار کا۔ اس طرح ہمارے نزدیک ریاستی کانگریس نے ایک ایسے گناہ بے لذت کا ارتکاب کیا ہے جس کا نتیجہ پشیمانی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔

۲۰/اپریل ۱۹۶۷ء

صدارتی انتخابات

صدارتی انتخاب کے سلسلے میں اب کی بار جس گہری دلچسپی کا اظہار کیا جارہا ہے وہ حالیہ عام انتخابات کے بعد ملک کی بدلی ہوئی صورت حال کا لازمی نتیجہ ہے۔ مرکز اور ریاستوں مین کانگریسی اقتدار کی اجارہ وادی ختم ہوجانے کے بعد اب ملک میں پہلی بار فیڈرل طرز حکومت کے امکانات کا جائزہ لیا جانے لگا ہے۔ غیر کانگریسی حکومتوں نے اپنے لئے زیادہ سے زیادہ اندرونی خودمختاری کا مطالبہ کر کے مرکزی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کو چیلنج کرنا شروع کیا ہے۔ ان حالات میں صدر کے عہدے کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ نئے حالات میں صدر جمہوریہ کو مرکز اور ریاستوں کے باہمی تعلقات میں ایک اہم کردار کا رول ادا کرنا ہوگا اور بہت حد تک وفاقی طرز حکومت کی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار صدر کی شخصیت اور اس کے ذہنی رویے پر منحصر ہوگا۔ اس پس منظر میں صدارتی انتخابات کے لئے مخالف پارٹیوں کے متحدہ محاذ کی طرف سے نامزد کئے گئے امیدوار شری سُبھاراؤ اور کانگرسی امیدوار ڈاکٹر ذاکرحسین کے درمیان مقابلے کی اہمیت اور معنویت سمجھ

میں آسکتی ہے۔ ہم اُن لوگوں میں سے ہیں جو صدق دلی سے کانگرسی اقتدار کا خاتمہ چاہتے ہیں اور عام انتخابات کے بعد سے یہ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ جلد ہی ملک کو کانگریسی جاگیرداروں اور نوابوں سے نجات مل جائے گی۔ لیکن صدارتی انتخاب کے لئے ڈاکٹر ذاکر حسین کا نام تجویز کر کے کانگرس نے ہمیں اور ہم جیسے بہت سے لوگوں کو بڑی سخت الجھن میں ڈال دیا ہے۔ ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ اس عہدے کے لئے ڈاکٹر صاحب سے زیادہ موزون اور مناسب شخصیت کا ملنا ناممکن ہے اور ان کے انتخاب سے ہندوستانی جمہوریت اور سیکولرازم کی کھوئی ہوئی توقیر بہت حد تک بحال ہوگی۔ کانگریس سے ہماری بیزاری کے باوجود صدارتی انتخابات کے لئے کانگریس امیدوار کی موزونیت اپنی جگہ پر قائم ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کش مکش میں ہماری تمام تر ہمدردیاں اُس کانگریس کے ساتھ ہیں جو کسی ہمدردی یا رحم کی مستحق نہیں رہی ہے۔ سابق چیف جسٹس شری سبھا راؤ کی قابلیت، ان کی اہلیت اور قانون دانی کا ہمیں اعتراف ہے۔ ان کے کچھ فیصلوں کو عالم گیر شہرت حاصل ہوگئی ہے اور ہندوستان بجا طور پر ان کی ذات پر فخر کر سکتا ہے لیکن صدارتی منصب کے لئے ان کا نام جن حالات میں تجویز ہوا ہے، اس کے پیش نظر مناسب تو یہ تھا کہ شری راؤ مخالف پارٹیوں اور کانگریس کے درمیان اقتدار کی کش مکش کا آلہ کار بننے کی بجائے اس منصب سے انصاف کرتے جس پر وہ فائز تھے مگر صدارتی عہدے کے لالچ نے انہیں ان اصولوں اور روایتوں کی بے حرمتی کرنے سے بھی نہیں روکا جو انہوں نے خود قائم کئے ہیں۔ اپنے عہدے سے مستعفی ہونے سے بہت پہلے وہ

مخالف سیاسی جماعتوں کے سازو باز میں شریک رہے اور اس طرح انہوں نے جوڈیشری کے وقار کو نا قابل تلافی نقصان پہنچایا، قطع نظر اس کے ڈاکٹر ذاکر حسین کے سیاسی کردار، ان کے شاندار ماضی اور ان کے قدوقامت کے مقابلے میں شری سُبھاراؤ اپنی بے پناہ قابلیت کے باوجود ایک بونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صدر جمہوریہ کا منصب صرف قانونی قابلیت ہی کا نہیں، عالمگیر وقار اور بے داغ شخصیت کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی قوم پرستی اور حب الوطنی کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب شری سُبھاراؤ کسی عدالت میں انگریزی اقتدار کی قانونی تاویلات کرنے میں مصروف تھے اور یہ بڑی افسوس ناک بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی ذات مخالف جماعتوں اور کانگریس کے درمیان مقابلے کی بنیاد بن گئی ہے۔ ہمارے نزدیک صدر جمہوریہ منتخب ہونے سے ڈاکٹر ذاکر حسین کی قدر وقیمت میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ لیکن ان کا انتخاب ملک کے وقار میں غیر معمولی اضافے کا باعث ہوسکتا ہے۔ بعض لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کے مسلمان ہونے کو زیادہ اہمیت کا مستحق نہیں سمجھا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے مسلمان ہونے کی وجہ سے اس انتخاب کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ہم پچھلے بیس برسوں سے دنیا کو یہ باور دلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان ایک سیکولر جمہوریت ہے اور یہاں ہر فرقے اور جماعت کے لوگوں کو آگے بڑھنے، ترقی کرنے اور نشونما کے مواقع حاصل ہیں۔ ہم اپنے اس دعوے کے ثبوت میں اپنا آئین پیش کرتے ہیں جس کی رُو سے تمام مذاہب، فرقوں اور طبقوں کے لوگوں کو اس ملک میں یکساں

حقوق حاصل ہیں۔ آج بیس برس بعد ہمیں یہ موقع ملا ہے کہ ہم اپنے دعوؤں کو صحیح ثابت کرسکیں اور دنیا پر یہ واضح کردیں کہ مساوات اور سیکولر جمہوریت کا تصور صرف آئین کی کتابوں تک ہی محدود نہیں بلکہ ہماری عملی زندگی کا ایک جزو لاینفک ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا صدر منتخب ہونا ہمارے اُن دشمنوں کے منہ پر ایک زوردار طمانچے کا کام دے گا جو آئے دن ہم پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ ہندوستان میں ہندو اکثریت اقلیتوں کے حقوق غصب کررہی ہے۔ ہندو اکثریت والے ملک کا صدر مسلمان ہو تو اس سے نہ صرف ملک کی فرقہ پرست جماعتیں کمزور پڑ جائیں گی بلکہ دنیا بھر کے لوگ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ پاکستان کے خلاف ہمارا سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ پاکستانی آئین کی رو سے کوئی غیر مسلم پاکستان کا صدر نہیں بن سکتا۔ مگر پاکستان والے اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ آئینی ضمانت کے باوجود عملی طور پر ہندوستان میں بھی کوئی مسلمان کبھی صدر کے عہدے پر فائز نہیں ہوسکتا۔ اس تمام پروپیگنڈے کا ایک مسکت جواب دینے کے لئے تاریخ نے ہمیں ایک نادر لمحہ عطا کیا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی ذات میں ہمیں صدر جمہوریہ کے لئے سب سے موزون اور معقول شخصیت مل گئی ہے۔ وہ اپنے تبحر علمی، اپنی بے پناہ قابلیت اپنے شان دار ماضی اور روشن دماغی کے علاوہ ایک ایسے قوم پرست اور محبِ وطن مسلمان بھی ہیں، جن کے وجود سے ہندوستانی سیکولرازم کا چراغ روشن ہے۔ اگر ہم اس تاریخی مرحلے پر سیاسی مصلحتوں، ذاتی رقابتوں اور اذیت کوشیوں سے بلند ہو کر ڈاکٹر صاحب کے انتخاب کی غیر معمولی اہمیت کو سمجھ جائیں تو ڈاکٹر

صاحب کی کامیابی بھی یقینی ہے اور ہندوستان کے وقار میں اضافہ بھی! ہم یہ نہیں کہتے کہ اگر ذاکر صاحب صدر منتخب نہ ہو جائیں تو خدانخواستہ سیکولرازم کا تصور ختم ہوگا۔ ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ ذاکر صاحب کی ناکامی مسلمانوں پر عدم اعتماد کے برابر ہوگی۔ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ ذاکر صاحب کی کامیابی سے ہندوستان کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے حوصلے پست ہو جائیں گے۔ سیکولرزم کو تقویت ملے گی اور اقلیتوں کا اکثریت پر اعتماد بحال ہونے میں مدد ملے گی۔ ملک کا صدر کوئی بھی ہو سکتا ہے لیکن جہاں کچھ لوگوں کے صدر بننے سے ان کی ذات محترم بن جائے گی وہاں کچھ شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے اس منصب کا اعزاز بڑھ جائے گا جس پر وہ فائز ہوں۔ ہمارے نزدیک ڈاکٹر ذاکر حسین کی ذات کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔

ذاکر صاحب کی کامیابی کانگریس کے لئے وقار ہی کا نہیں وجود کا سوال بھی بن گئی ہے۔ اس لئے کانگریسی اپنے طور پر ذاکر صاحب کی کامیابی کے لئے سر توڑ کوشش کریں گے۔ لیکن کانگریس کی ناؤ چونکہ ملک بھر میں ڈوب رہی ہے، اس لئے ہمیں تعجب نہ ہوگا کہ خود کانگریس کی صفوں میں سے ہی کانگریس کو ڈبونے والے بھی نکل آئیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ذاکر صاحب کو صرف کانگریس کا امیدوار سمجھنے کی بجائے انہیں ان تمام ترقی پسند سیکولر اور جمہوری عناصر کا نمائندہ سمجھا جائے جو اس ملک میں ایک صحت مند، سیکولر اور جمہوری ڈھانچہ تعمیر کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ ہمیں اس سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ذاکر صاحب کی کامیابی یا ناکامی سے کانگریس کے مستقبل پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ہم صرف

یہ چاہتے ہیں کہ اس تاریخی موقع سے فائدہ اٹھا کر ملک میں فرقہ پرستی کا جنازہ نکال سکیں۔ ذاکر صاحب کی کامیابی اس منزل کی طرف پہلا قدم ہوگی۔ ہم پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کے تمام ممبروں سے پُر زور اپیل کرتے ہیں کہ وہ جماعتی اور سیاسی مصلحتوں سے بلند ہو کر ذاکر صاحب کے حق میں اپنا ووٹ استعمال کریں۔ ذاکر صاحب کی کامیابی کانگریس کی کامیابی نہیں بلکہ سیکولرزم کی کامیابی تصور کی جائے گی! ہمیں یقین ہے کہ کانگریس کے مخالف محض کانگریس دشمنی کی بنا پر اس انتخاب کی تاریخی اہمیت کو نظر انداز نہیں کریں گے اور اپنے ووٹ کا استعمال کرتے وقت ملک کے موجودہ ماحول سے آنکھیں بند نہیں کریں گے!۔

۲۶/ جون ۱۹۶۷ء

۷ جون!

۷ جون کو سرینگر میں رونما ہونے والے افسوسناک اور شرمناک واقعات کا پس منظر کیا تھا؟ اسرائیلی جارحیت کے خلاف ان ''عدیم المثال مظاہروں کا جواز کیا تھا ؟ سکولوں، سیاحوں اور جاگیروں کو اسرائیل سے منسوب کر کے انہیں عوامی غیض و غضب کا مرکز بنانے میں کونسی ذہنیت کارفرما تھی؟ لاقانونیت، غنڈہ گردی اور تشدد کے اس طوفان بدتمیزی کو کس نے منظّم کیا، اس کی رہنمائی کون کر رہا تھا اور اس کا مقصد کیا تھا؟

اس قسم کے بہت سے سوالات پچھلے دو ہفتوں سے بحث کا موضوع بنے ہوئے ہیں، اور ہر شخص اپنے طور پر ان کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت ہوا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے اس کی پشت پر کچھ فرقہ پرست سیاسی تنظیمیں تھیں۔ کچھ انتہا پسندوں کا دعویٰ ہے کہ یہ سب کچھ حکومت کے اشارے سے ہوا ہے۔ کانگریس کے صدر سید میر قاسم کو اس میں بخشی غلام محمد اور اس کے ساتھیوں کا ہاتھ نظر آرہا ہے۔ بخشی غلام محمد کو ان واقعات کے پیچھے حکومت کی مصلحت دکھائی دیتی ہے۔ جن سنگھ کے شری پریم ناتھ ڈوگرہ کو بہت دور کی سوجھتی ہے۔ ان کے خیال میں ان واقعات کی تہہ میں صادق سرکار کی کمیونسٹ نوازی پوشیدہ ہے، شمیم احمد شمیم کے الفاظ میں یہ ہماری بُزدلی، بے غیرتی اور وحشی پن کی علامت ہے۔ غرض ہر شخص اپنی مقدور کے مطابق ان سانحات کی منطق

کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہم نے بھی ان شرمناک واقعات پر غور وفکر کر کے کچھ نتائج اخذ کر لئے ہیں اور ہمارے خیال میں ان واقعات کی منطق سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہمارا ذہن کسی قسم کے کٹرپن، تعصب، یا بنے بنائے فارمولا کے اثر سے آزاد ہو۔

ہمارے نزدیک ۷ جون کے واقعات کے دو اہم پہلو ہیں۔ ایک ہجوم کا رویہ، اور دوسرا حکومت کی پالیسی۔ جہاں تک ہجوم کے رویے کا تعلق ہے، تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں نے غنڈہ گردی، لوٹ مار، آتشزدگی اور مسیحی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کے خلاف سخت ناراضگی کا اظہار کر کے شر پسند عناصر کی پُر زور مذمت کی ہے اور ہمیں یہ دیکھ کر کسی حد تک اطمینان ہوا ہے کہ شہری آبادی کے ہر طبقے نے اس مذموم اور ننگ انسانیت ہلڑبازی کے خلاف اپنے غم وغصے کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی یہ سوال اپنی جگہ پر قائم ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اور یہ سب کچھ کرنے والے کون تھے؟ ہمارے خیال میں ۷ جون کی ہنگامہ آرائی اور ہلڑبازی کے محرکات سیاسی نہیں، خالص نفسیاتی ہیں، اور ان کو اچھی طرح سے سمجھنے کے لئے اس ماحول کو سمجھنا ضروری ہے، جس نے اس قسم کے تخریبی رجحانات کی پرورش کی ہے۔ کشمیر میں لوگوں کو تنقید، احتجاج مسرت، اور ناراضگی کے اظہار کے وہ عام وسیلے میسر نہیں ہیں، جو ملک کے دیگر حصوں میں رہنے والوں کو حاصل ہیں۔ جلسہ تو یہاں ایک ایسی عیاشی ہے جو صرف حکمران جماعت ہی کر سکتی ہے۔ جلوس اپنے ہاں شجر ممنوعہ ہے اور حکام کے نزدیک جلوس کی اجازت دینا بغاوت اور لاقانونیت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اس شہر میں

صرف محرم الحرام اور یوم مئی کے جلوس نکلتے دیکھے گئے۔ ایک خالص مذہبی اور دوسرا نیم سرکاری۔

حکومت پر نکتہ چینی اور لیڈروں پر تنقید کے لئے اخبارات کو اگرچہ مقابلتاً زیادہ آزادی حاصل ہے لیکن اخبارات کبھی جلسوں جلوسوں کا بدل نہیں ہو سکتے۔ دفعہ ۱۴۴ کی مستقل چھاؤں تلے اظہار رائے اور صدائے احتجاج کا پودا کبھی اپنے فطری نشوونما کو نہیں پہنچ سکتا اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام کو جب بھی کوئی بہانہ مل جائے، وہ اس کا بھرپور استعمال کر کے کبھی کبھی مقررہ حدود سے تجاوز بھی کر جاتے ہیں۔ اسرائیل کی جارحیت کے خلاف احتجاجی مظاہرہ دراصل دبی ہوئی خواہشات اور دبائے ہوئے جذبات کا وہ لاوا تھا جس کے نکاس کے لئے عرصے سے کوئی مناسب وسیلہ میسر نہ تھا۔ جس طرح ۱۹۶۳ء میں موئے مقدس کی گمشدگی سے دبائے ہوئے جذبات ایک بپھرے ہوئے سیلاب کی صورت اختیار کر گئے، بالکل اسی طرح ۷ جون کو ایک بہانہ میسر ہوتے ہی دبے ہوئے جذبات کا لاوا کچھ اس طرح پھوٹ پڑا کہ اخلاق، انسانیت، تہذیب، شرافت اور ماضی کی ساری قدریں جھلُس کے رہ گئیں۔ اس نفسیاتی پسِ منظر کو ہم خدانخواستہ عذرِ گناہ کے طور پیش نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس گناہ عظیم کے اسباب، محرکات اور عناصر ترکیبی کو سمجھنے کے لئے۔۔۔ جب تک جذبے، خیال، اور اظہار کے فطری پیرایوں پر تعزیریں عاید رہیں گی، ہماری نفسیات پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی جائے گی اور ہمارے ردِ عمل اور رجحانات کی منطقی تعبیریں مشکل ہوتی جائیں گی۔

اس مسئلے کے دوسرے اہم پہلو کا تعلق حکومت کی ''غیر جانبدارانہ''

پالیسی سے ہے۔ حکومت اور حکومت کے ترجمان اخبارات نے عذرِ گناہ کے طور پر موقف پیش کیا ہے کہ اس روز حکومت نے انتہائی صبر وتحمل سے کام لے کر تشدد سے پرہیز کیا اور اس طرح صورت حال کو مزید خراب ہونے سے بچا لیا۔ حکومت نے اپنے دفاع میں ایک عیسائی رہنما کا وہ خط بھی پیش کیا ہے جس میں اس نے عدم تشدد کی پالیسی کو سراہتے ہوئے حکومت کو اعلیٰ کارکردگی کا سرٹفیکیٹ عطا کیا ہے۔ صادق صاحب نے گرجا گھروں کی تعمیر کے لئے ڈیڑھ لاکھ روپے کی رقم منظور فرما کر ان زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کی ہے جو ۷ جون کی لاقانونیت کی یادگار ہیں۔ ہمارے نزدیک ۷ جون کے شرمناک واقعات کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر ہے اور حکومت کا کوئی بڑے سے بڑا وکیل بھی اُسے اُس کی ذمہ داری سے بری الذمہ قرار نہیں دے سکتا۔ بعض اخبارات کے سرٹفکیٹ اور پادریوں کے سفارشی خطوط اس گھناؤنے داغ کو مٹا نہیں سکتے جو صادق سرکار کی پیشانی پر ۷ جون کو ثبت کر دیا گیا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ جو سرکار انتخابات میں ایک نشست جیتنے کے لئے ظلم وستم اور جبر تشدد کے ریکارڈ توڑ سکتی ہے وہ سکولوں، سیاحوں اور گرجا گھروں کی حفاظت کرتے وقت یک لخت عدمِ تشدد پر کیوں کر ایمان لائی۔ جو حکومت پُر امن شہریوں کی عزت اور ان کے جان ومال کی حفاظت نہیں کرسکتی، اسے اقتدار کے مسندوں پر رہنے کا کون سا اخلاقی حق حاصل ہے؟ آج سے صرف ایک سال قبل جب دلی میں گئو رکھشا اندولن کے سلسلے میں اس قسم کا مظاہرہ ہوا تھا، تو وزیر داخلہ شری گلزاری لال نندہ کو مستعفی ہونے پر مجبور کیا گیا تھا۔ سرینگر میں ۷ جون کو جو کچھ ہوا ہے وہ

دلی کے واقعات سے زیادہ سنجیدہ، افسوسناک اور شرمناک ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ وزیر داخلہ مستعفی ہو کر کم ازکم اپنے اخلاقی فرائض سے سبکدوش نہ ہوں۔

۷ جون کو ریاستی پولیس نے جس طور پر اپنی نا اہلیت اور نا قابلیت کا ثبوت فراہم کیا ہے، اس کے پیش نظر ریاستی حکومت پر ریاستی عوام کا رہا سہا اعتماد بھی ختم ہو گیا ہے۔ ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کے ساتھ جو زیادتیاں روا رکھی گئیں، اس سے حکومت کی شہرت اور عزت خاک میں مل گئی ہے اور اب حکومت اپنے دفاع میں جو گواہ پیش کر رہی ہے اس نے اس کی پوزیشن کو زیادہ مضحکہ خیز بنادیا ہے۔ بعض انگریزی روزناموں میں شری جے جے سنگھ کا وہ خط شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے عین مشاہدے کی بنا پر ۷ جون کے واقعات کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر ڈال دی ہے اور حکومت کے لئے فرار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے اور اگر اخباری اطلاعات صحیح ہیں تو ریاستی حکومت صرف ٹورسٹ سیزن کی عافیت کے لئے شیخ صاحب کی رہائی کے خلاف ہے۔ یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ ایک طرف ایک شہری کو ٹورسٹ سیزن کے نام پر اپنے بنیادی حقوق سے محروم کیا جارہا ہے اور دوسری طرف سیاحوں کی بے عزتی اور بے حرمتی کے لئے شرپسند عناصر کو چھٹی دی جاتی ہے۔ جب تک ۷ جون کے واقعات کی جوڈیشل تحقیقات نہ کی جائے، ہمارے خیال میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ باقی رہے گا۔ صرف اس لئے کہ بخشی غلام محمد نے بھی عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کیا ہے، ریاستی سرکار کو نامعقولیت اور ہٹ دھرمی کا روّیہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ ❁ ❁ ❁ ❁

۱۲ ستمبر ۱۹۶۷ء

فتح کس کی؟

شہر کے حالات اگرچہ معمول پر آگئے ہیں لیکن فضا میں ابھی پہلی سی خوشگواری پیدا نہیں ہوئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں حالات بدل گئے ہیں، لیکن ذہن ابھی تک نہیں بدلے ہیں۔ بادی النظر میں کشمیری پنڈت ایجی ٹیشن کے دوران ناگوار سانحات کی تعداد اتنی مختصر ہے کہ اسے فرقہ وارانہ گڑ بڑ کہنا بھی مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بگڑے ہوئے تیوروں نے ماحول میں ایک ایسی کشیدگی پیدا کر دی ہے کہ نفسیاتی سطح پر ابھی تک ذہنوں میں ہل چل موجود ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ کشمیری پنڈتوں نے صورتحال کی سنجیدگی کا صحیح اندازہ لگا کر ایجی ٹیشن ختم کر دی اور کشمیر رسوائی اور اہانت سے بچ گیا۔ اگر چہ اس کے صاف وشفاف نام پر کچھ چھینٹے پڑ ہی گئے۔ خطرناک اور سنجیدہ صورت حال کے تمام عناصر ترکیبی موجود ہوتے ہوئے بھی ایسا کوئی سانحہ رونما نہ ہوا، جو ہمارے ضمیر پر بوجھ بن کر ہمیں اپنی ذلت کا احساس دلاتا۔ جو کچھ ہوا ہے، اُس سے صرف ہماری شہرت پر حرف آیا ہے، ہماری عزت پر نہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہم اپنی شہرت بحال کرنے کے لئے اپنے دامن سے یہ چھینٹے بھی دھوڈالیں گے!

بعض شر پسند عناصر کی طرف سے جان بوجھ کر یہ کوششیں ہو رہی ہیں کہ امن، صلح اور آشتی کے موجودہ ماحول کو ایک فرقے کی فتح اور دوسرے کی شکست سے تعبیر کر کے فضا کر پھر مکدر بنایا جائے۔ بعض فتنہ پرور معمولی سے واقعہ کو اس درجہ بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں کہ تشکیک اور بدظنی کے رجحانات کو تقویت ملتی ہے۔ ایجی ٹیشن کے دوران جہاں کچھ ناگوار اور افسوسناک حادثات پیش آئے ہیں، وہاں انسان دوستی، رواداری اور باہمی اخوت کی وہ شاندار مثالیں بھی دیکھنے میں آئی ہیں کہ انسان کی عظمت اور کشمیر کے سیکولر کردار پر اعتماد بحال ہو جاتا ہے۔ کسی مسلم اکثریتی محلے میں کسی ہندو کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے اور کسی ہندو اکثریتی محلے میں کسی مسلمان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی ہے۔ بعض مسلمانوں نے جب خوف اور ڈر کی وجہ سے اپنے گھر چھوڑ دئے تو انہوں نے ہندو گھروں میں پناہ لی اور اسی طرح مسلم اکثریتی محلوں میں جب کسی ہندو کو تشویش پیدا ہوگئی، تو وہ اپنا سارا کنبہ لے کر اپنے پڑوسی مسلمان کے گھر میں پناہ گزین ہوا۔ مجھے اس بات پر فخر کرنے دیجئے کہ یہ صرف میرے کشمیر میں ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس قسم کے واقعات کو اہمیت دینے کی بجائے ایسی باتوں کو اہمیت دی جاتی ہے جن سے فرقہ وارانہ منافرت اور کشیدگی پیدا ہونے کا امکان ہے۔ بعض لیڈر اور صحیفہ نگار اپنی دکان چمکانے کے لئے ایسے ہی واقعات کی کھوج میں لگے رہتے ہیں اور پچھلے چند ہفتوں سے سیکولرازم کے نام پر فرقہ پرستی کا زہر بیچنے کی کئی مثالیں دیکھنے میں آئی ہیں۔ ان حضرات کا کام مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہندوؤں پر الزام تراشنا اور

ہندوؤں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں پر بہتان تراشتا ہے۔ وہ مسلمانوں سے یہ کہتے ہیں کہ اس جنگ میں کشمیری پنڈت جیت گئے اور پنڈتوں کو یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ ان کے لیڈروں نے اپنی شکست تسلیم کر کے حکومت کے سامنے ہتھیار ڈال دئے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس جنگ میں نہ کشمیری پنڈت جیتے ہیں اور نہ مسلمان۔ اس میں انسان جیت گیا۔ اس کی عقلیت، اس کا تدبر، اسکی دور اندیشی اور اس کا خلوص جیت گیا۔ آگ لگتی تو ہندو اور مسلمان دونوں کے گھر جلتے، یہ بجھ گئی تو دونوں ہی کے گھر بچ گئے۔ رادھا کی عزت بھی محفوظ ہوگئی اور فاطمہ کی عفت بھی، اس لئے اس پر کسی کو پشیمان نہیں ہونا چاہئے۔ ہم میں سے کچھ نادانوں نے ہمارے خرمنِ امن میں آگ لگائی تھی۔ ہم سب نے مل کر اسے بجھایا۔ اس میں ہم سب کی فتح ہوئی ہے لیکن بدقسمتی سے پنڈتوں اور مسلمانوں میں صحیح لیڈرشپ نہ ہونے کی وجہ سے برساتی قسم کے کچھ مینڈک نمودار ہو گئے ہیں، جن کا واحد مقصد اپنی شخصیت کو منوانا اور اپنی دکان چمکانا ہے۔ ہم سب کو ان لیڈر حضرات کی ریشہ دوانیوں سے خبردار رہنا ہوگا۔ شیخ محمد عبداللہ کی مسلسل نظر بندی نے مسلمانوں میں مختلف المقاصد لیڈروں کی ایک پوری فصل کو جنم دیا ہے، جو شیخ صاحب کا نام لے کر فرقہ پرستی، تعصب اور منافرت پھیلانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی فکر میں ہیں۔ شیخ صاحب کے لئے اس سے بڑھکر کیا المیہ ہوسکتا ہے کہ ان کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر انہی کے نام پر فرقہ پرستی کا پرچار کیا جائے۔ کون نہیں جانتا کہ شیخ صاحب کے ہوتے ہوئے یقیناً کشمیر کو یہ

روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوا ہوتا کہ فرقہ وارانہ اتحاد قائم رکھنے کے لئے ہمیں فوج اور پولیس کی مدد لینا پڑے۔ یہ امر باعث اطمینان ہے کہ ضلع اننت ناگ میں مرزا محمد افضل بیگ کی مساعی جمیلہ سے فرقہ وارانہ اتحاد، امن اور آشتی کی فضا برقرار رہی اور بیگ صاحب نے بے پناہ مجبوریوں اور معذوریوں کے باوجود فرقہ وارانہ امن قائم رکھنے میں مقدور بھر حصہ ادا کیا۔ بہرکیف یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ معمولی سے واقعات کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے والے لیڈروں کی نہ کشمیری پنڈتوں میں کمی ہے اور نہ مسلمانوں میں۔ اسلئے ہم سب کو چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں پر من حیثیت القوم یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے پنڈت بھائیوں کی دل جوئی کریں، ان کے دل میں کسی قسم کی غلط فہمی پیدا نہ ہونے دیں اور پنڈتوں پر لازم ہے کہ ایجی ٹیشن کی تلخ یادوں کو بھلانے کے لئے مسلمان بھائیوں کے اندیشوں کو دور کریں۔ جس طرح مسلمانوں کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرنا ہوگی کہ کشمیر میں لگی ہوئی آگ صرف کشمیر تک محدود نہیں رہ سکتی، اسی طرح پنڈت بھائیوں کو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اپنے مسلمان بھائیوں کو بدظن کر کے وہ امن وچین کی زندگی نہیں گذار سکتے۔ ہجرت کی دھمکیاں اور دعوے کسی کو مرعوب نہیں کرسکتے۔ کشمیر کی فضا میں کچھ ایسی تاثیر ہے کہ یہاں سے چلا جانا اتنا آسان نہیں، جتنا نظر آتا ہے۔

بعض دوستوں نے اپنی ناعاقبت اندیشی کے پیش نظر رانچی اور کشمیر کے حالیہ واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا شروع کرلیا ہے کہ سیکولرازم

کامیاب نہیں رہ سکتا یا یہ کہ سیکولرازم کا تصور ناقابل عمل ہے۔ کچھ دوستوں نے طعنے دئے کہ دیکھ لیا آپ نے سیکولرازم... ایسے احباب کی خدمت میں یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ وہ میرے دلائل سے اپنا مقدمہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ رانچی اور کشمیر میں جو کچھ ہوا ہے وہ سیکولرازم کی شکست نہیں، فرقہ پرستی کی فتح ہے اور اسی لئے ہم کو سیکولرازم کو مضبوط بنانے کے لئے پہلے سے زیادہ کوششیں کرنا ہوں گی۔ اگر آپ لوگ یقیناً رانچی اور کشمیر کے حالیہ واقعات کا اعادہ نہیں چاہتے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہم ملک میں سیکولر قوتوں کو مضبوط بنائیں۔ جو کچھ ہوا ہے وہ فرقہ پرستی کا مظاہرہ ہے اور اس سے یہ ثابت کرنا کہ سیکولرازم ہی ڈھونگ ہے، بڑی ٹیڑھی منطق ہے۔ اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہم ابھی تک سیکولرازم کی اہمیت، ضرورت اور افادیت کو اچھی طرح نہیں سمجھ پائے ہیں۔ ہر فرقہ وارانہ فساد سیکولرازم پر میرے وشواس کو اور زیادہ گہرا کر دیتا ہے اور جب تک سیکولرازم پر ہم سب کا وشواس گہرا نہ ہو، فرقہ وارانہ کشیدگی ختم نہیں ہوگی۔

۲۷ستمبر ۱۹۶۷ء

پنڈت بھائیوں سے گذارش

ہمارا خیال ہے کہ کشمیری پنڈت اس وقت ایک زبردست الجھن میں مبتلا ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ ان کی حالیہ ایجی ٹیشن نے مسائل کو حل کرنے کی بجائے الجھا دیا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ایک جائز شکایت کے ازالے کے لئے انہوں نے جو طریقِ کار روا رکھا، اس سے وہ ان لوگوں کی ہمدردی سے بھی محروم ہو گئے ہیں جو ان کو درپیش مسائل اور ان کی جائز شکایات کو دور کرنے میں ان کے ممد اور معاون ثابت ہو سکتے تھے۔ ان کا یہ اندازہ بھی غلط ثابت ہو گیا ہے، کہ اپنے ''حقوق'' کے لئے جدوجہد میں سارا ملک ان کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہو گا۔ مختصر یہ کہ پنڈت بھائیوں کی معلومات عامہ میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے اور اس اضافے سے یقیناً ان کی دانشمندی کا معیار بھی اونچا ہو گیا ہو گا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس الجھن میں ہیں کہ وہ اس بات کا اعتراف کیونکر کریں کہ ان کی ایجی ٹیشن خود ان کے لئے سود مند ثابت نہیں ہو سکی ہے۔ نیتا لوگوں نے جذبات کو اس درجہ بھڑکا دیا تھا کہ اب ان کو اپنی سطح پر لانا دشوار ثابت ہو رہا ہے۔ بازی گروں نے اپنی تقریروں سے وہ طلسم باندھا تھا کہ اب تماشائیوں کے لئے حقائق کی دنیا میں لوٹنا مشکل

معلوم ہو رہا ہے اور لیڈروں میں اتنی اخلاقی جرات نہیں کہ وہ حقائق کی ناگواری کو تسلیم کر کے صورت حال کو معمول پر لانے میں مدد دیں۔ نتیجہ یہ کہ عملی طور ایجی ٹیشن ختم ہونے کے باوجود ذہنی ایجی ٹیشن بدستور جاری ہے۔ جذباتی تقریروں اور مبالغہ آمیز بیانات کا سلسلہ جوں کا توں ہے اور فضا میں ہی سہی، کشیدگی کا احساس ابھی تک باقی ہے۔ ہندو ایکشن کمیٹی میں انتہا پسندوں اور حقیقت پسندوں کے درمیان ایک نئی کشمکش کا آغاز ہو گیا ہے اور آثار وقرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ناکامی، مایوسی اور محرومی کا احساس بعض انتہا پسندوں کو بے چین کئے ہوئے ہے اور وہ کسی طور اپنے وجود کو منوانے پر بضد نظر آتے ہیں۔ اس کے برعکس صائب الرائے اور سنجیدہ طبقے کو اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ شخصیات اور ذاتی مفادات کی سطح سے بلند ہونے کا وقت آ گیا ہے اور کسی قسم کی مہم پسندی سے کشمیری پنڈتوں کو مزید نقصان اٹھانا پڑے گا۔ ہمارے نزدیک مایوسی اور ناکامی کا احساس در اصل غلط اور غیر صحت مندانہ اندازِ فکر کی پیداوار ہے اور کشمیری پنڈتوں کو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ جھوٹے وقار اور مصنوعی غرور کی خاطر کسی غلط بات پر اڑ جانا دانشمندی، عاقبت اندیشی اور ترقی پسندی کے تقاضوں کے منافی ہے۔ ایجی ٹیشن سے اقدار، اتحاد اور اتفاق کو پہلے ہی اتنا نقصان پہنچ چکا ہے کہ اب مزید تجربوں کی گنجائش باقی نہیں۔ اسلئے ہم اپنے پنڈت بھائیوں سے یہ گذارش کریں گے کہ وہ صرف چند افراد کی مجروح انا کی تسکین کا سامان بننے سے گریز کریں اور جتنی جلد ممکن ہو سکے، حالات کو اعتدال پر لانے میں مدد دیں۔

❁❁❁

۲۴/ اکتوبر ۱۹۶۷ء

توہین قرآن کا مسئلہ

دینی اور مذہبی معاملوں مین علمائے دین کی رائے کو چراغ بیگ کے مقابلے میں ہمیشہ زیادہ مستند، قابل احترام اور قابل قبول سمجھا جائے گا۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ چراغ بیگ اپنی رائے دینے سے باز رہے اور وہ بھی اس وقت جبکہ علماء دین کی رائے کسی مسئلے کے بارے میں واضح نہ ہو۔ اب جبکہ طوفان تھم چکا ہے اور تلاطم کی لہریں تھک کر بیٹھ گئی ہیں، میں اہل اسلام اور علماء اسلام سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ کیا توہین قرآن کی اصطلاح صحیح ہے؟ دوسرے الفاظ میں کیا توہین قرآن ممکن ہے اور پھر اس ضمن میں ایک اور سوال بھی پوچھنا چاہوں گا کہ اس جرم کا ارتکاب کون کرسکتا ہے؟ مجھے معلوم نہیں کہ علمائے دین اس معنی خیز سوال کا کیا جواب دیں گے۔ لیکن پیدائشی مسلمان ہونے کے ناطے مجھ پر بھی اس سوال کا جواب دینا فرض نہ سہی تو سنت ضرور ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اہل اسلام اور علمائے دین میرے جواب کو مستند اور محترم نہ بھی مانیں، تب بھی اس پر ہمدردانہ غور ضرور فرمائیں۔

میرے نزدیک توہین قرآن کی اصطلاح لغوی، ادبی، معنوی اور

مذہبی اعتبار سے بالکل غلط اور گمراہ کن ہے اور قرآن پاک کی توہین کا جو عام تصّور ہے، وہ مسلمانوں کی جہالت، کم علمی اور قرآن شریف سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ قرآن شریف کسی کتاب یا صحیفے کا نام نہیں۔ ایک فلسفۂ زندگی، ایک نظام حیات، ایک راہِ عمل کا نام ہے، جسمیں سیاسی، اقتصادی، معاشی اور سماجی مسائل کو ایک خاص نقطہ نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ جن لوگوں نے اس نظام حیات اور راہ عمل کو اپنایا، وہ مسلمان کہلائے اور قدرتی بات ہے کہ ان کے دل میں اس نظام اور پیغام کے لئے بے پناہ احترام اور عقیدت موجود ہے، لیکن جو لوگ اس نظام پر ایمان نہیں لائے اور جن کے لئے قرآن شریف ایک مذہبی کتاب نہیں، وہ بھی اسلام کے سیاسی اور اقتصادی نظام کو سمجھنے کے لئے قرآن شریف کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو وہ اپنے ساتھ جو لائبریری لے گیا، اس میں قرآن شریف بھی شامل تھا اورروایت ہے کہ نپولین نے قرآن پاک کو پولیٹکل سائنس کے شیلف پر رکھا تھا، اس طرح سے بہت سے دانشوروں، عالموں اور محققوں کے لئے قرآن پاک ایک مذہبی کتاب ہی نہیں ایک جامع سیاسی اور اقتصادی نظام کا دوسرا نام ہے۔ ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قرآن شریف کو اسی تقدس، احترام اور عقیدت سے دیکھیں، جس سے مسلمان دیکھتا ہے، بڑی غلط بات ہوگی۔ ان کے لئے قرآن شریف ایک اہم تاریخی دستاویز ہے اور بس۔ اب رہی توہین کی بات تو جو آدمی ایک صحیفے سے کوئی تقدس یا عقیدت وابستہ ہی نہیں رکھتا، وہ توہین کا کیونکر مرتکب ہو سکتا ہے۔ ثابت ہوا کہ کوئی غیر مسلم قرآن کی توہین کا ارتکاب کر ہی نہیں

سکتا، کیونکہ قرآن شریف کسی انسان کی تصنیف نہیں ایک صحیفۂ آسمانی ہے۔ یہ خدا کا پیغام ہے، انسان کے نام۔ اب جس طرح توہین خدا ایک بے معنی اصطلاح ہے، اسی طرح اس کے پیغام کی توہین بھی ایک لغو تصور ہے۔ اگر عام معنوں میں قرآن شریف کی توہین ممکن ہو سکتی تو پھر صرف اسلامی ممالک میں ہی قران پاک کی عزت وتکریم کیجاتی اور دنیا کے باقی ممالک میں روز قرآن پاک کی توہین کی جاتی۔ لیکن مہذب دنیا جانتی ہے کہ کتابوں کی توہین کا یہ تصور صرف مسلمان ملکوں میں رائج ہے۔ اس مسئلے کا ایک سیاسی پہلو بھی ہے اور اب میں اس طرف آنا چاہتا ہوں۔ بعض اوقات قرآن پاک کے اوراق کی بے حرمتی کر کے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح اور مشتعل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ اس سے پہلے بھی ہوا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ آئیندہ بھی ہوگا۔ میرے نزدیک یہ شرانگیز کاروائی توہین قرآن کی حیثیت نہیں رکھتی کہ قرآن ایک نظام زندگی اور صحیفہ آسمانی ہونے کی حیثیت سے توہین یا تذلیل کا موضوع نہیں ہو سکتا۔ ہاں اس کاروائی سے مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کیا جا سکتا ہے اور مسلمانوں کے جذبات کتنے ہی مقدس کیوں نہ ہوں، انہیں قرآن کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے مسلمانوں کے جذبات کی توہین ہوئی ہے، قرآن کی توہین نہیں ہوئی ہے۔ یہ ایک بنیادی فرق ہے جسے سمجھنا بہت ضروری ہے۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کو سب سے پہلے یہ طے کرنا چاہئے کہ یہ فعل کس نے کیا ہے اور اس سے بھی زیادہ اہم بات کہ کیوں کیا ہے؟ اگر یہ فعل کسی غیر مسلم نے کیا ہے، تو یقیناً توہین کی نیت سے نہیں کیا ہے کیونکہ توہین سے پہلے تقدس،

احترام اور عقیدت کا تصور ضروری ہے اور وہ اس کے دل میں نہیں ہے۔
اس لئے اس نے ایسا مسلمانوں کے جذبات مشتعل کرنے کی غرض سے کیا ہوگا، اور مسلمانوں کو مشتعل کرنے میں اس کے سامنے کوئی واضح مقصد ہوگا۔ باالفاظِ دیگر ایک غیر مسلم نے مسلمانوں کو اپنے مخصوص مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی غرض سے ان کو مشتعل کرنا چاہا اور قرآن پاک کے تئیں ناشائستگی کا مظاہرہ کیا۔ اب اگر مسلمانوں نے جذبات میں آکر وہی کیا، جو ہمارے غیر مسلم دوست کا مقصد تھا، تو ایک لحاظ سے مسلمانوں نے اپنے غیر مسلم دوست پر بہت بڑا احسان کیا، کہ وہ ان کے اشارے پر ناچ اُٹھے۔ فرض کیجئے کہ یہ بے ہودہ حرکت کسی غیر مسلم نے نہیں بلکہ کسی مسلمان حضرت نے کی ہو (اور اس کا امکان بہت زیادہ ہے) تو پوچھا جا سکتا ہے کہ ان حضرت کو کیا سوجھی؟ ان حضرت کے سامنے بھی کوئی ٹھوس مقصد ہے اور وہ اپنے ہم مذہبوں کو مشتعل کر کے اس ٹھوس مقصد کی تکمیل چاہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ قرآن پاک کے تقدس، احترام، عقیدت اور وقار کو اپنے ذاتی یا سیاسی مفاد کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ ان حالات میں مسلمانوں کو اور زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے کہ کہیں قرآن شریف کسی سیاسی جادوگر کے سیاسی عزائم پورا ہونے کا ذریعہ تو نہیں بنتا۔ مجھے اس سلسلے میں ایک نیم تاریخی واقع یاد آرہا ہے۔

حضرت علیؑ کے مخالفین نے ایک جنگ کے دوران قرآن شریف کے نسخوں کو نیزوں پر چڑھا کر ہوا میں اُچھالا، مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو جذبات میں لاکر جنگ کو روکا جائے کیونکہ انہیں اپنی شکست کا پورا یقین

ہو چکا تھا۔ روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنی فوجوں سے کہا کہ یہ ایک سیاسی چال ہے، تم اس کی پرواہ نہ کرو کہ ہم اس وقت مجسم ہیں، کیونکہ ہم اس کتابی قرآن کی بجائے اصلی قرآن (یعنی فلسفۂ قرآن) کی حفاظت کے لئے یہ جنگ لڑ رہے ہیں۔ مجھے اس واقعے کی تاریخی صداقت کا علم نہیں ہے، لیکن اس میں پوشیدہ معقولیت اور استدلال سے میں بے حد متاثر ہوں۔

جو لوگ موئے مقدس کو چراتے ہیں، مسجدیں جلاتے ہیں اور قرآن پاک کی بے حرمتی کرتے ہیں، انہیں موئے مقدس، مسجد یا قرآن پاک سے کوئی دلچسپی نہیں، وہ ان حرکات سے مسلمانوں کے جذبات مشتعل کر کے کچھ سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی فکر میں ہیں اور یہ بہت بڑا المیہ ہوگا کہ اگر اس ملک کے مسلمان، غیر ارادی، غیر شعوری اور نا معلوم طریقے پر بدکردار اور بداطوار سیاسی شاطروں کی شطرنج کا مہرہ بن جائیں اور یہی بات میں اپنے ملک میں رہنے والے ہندو بھائیوں سے بھی کہونگا کہ جب بھی ان کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرنے کی کوشش کی جائے انہیں اس کوشش کے پیچھے ان خطرناک عزائم کا پتہ بھی لگانا چاہیئے جو دراصل اس کے محرک ہوتے ہیں۔

میں نے ایک اہم اور نازک دینی مسئلے پر قلم اٹھایا ہے۔ مجھے امید ہے کہ علمائے دین، بزرگان قوم اس گستاخی کے لئے مجھے معاف کریں گے!

❀❀❀

۵/نومبر ۱۹۶۷ء

اُف! یہ تذلیل کے داغ

بہت دنوں سے میرا دل و دماغ ایک عجیب کش مکش میں مبتلا ہے۔ میں کچھ باتیں بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہوں۔ لیکن یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ یہ باتیں مجھے کہنا چاہیئے یا نہیں؟ ان کے کہنے سے فائدہ ہوگا یا نقصان؟ دل کہتا ہے کہہ دو، میرا بوجھ ہلکا ہوگا۔ دماغ کہتا ہے کہ بعض باتیں صرف محسوس کی جاتی ہیں کہی نہیں جاتیں۔ دل کہتا ہے کہ جو کچھ تم کہنا چاہتے ہو، وہ سب جانتے ہیں، اس لئے کہہ ڈالو کہ تمہاری ''تقریر کی لذت'' کی تعریف ہوگی، دماغ کہتا ہے کہہ کر پچھتاؤ گے کہ تمہاری دنیا میں ابھی آئینہ دیکھنے کی ہمت اور صلاحیت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ دل و دماغ کی اس کشمکش سے تنگ آکر میں نے آج اپنے ضمیر سے سوال کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ جواب ملا، نتائج سے بے پرواہ ہوکر کہہ ڈالو جو کہنا چاہتے ہو کہ تم نے دنیا کی پرواہ ہی کب کی ہے جو آج کر رہے ہو۔ ضمیر کا فیصلہ سُن کر اب میں خونِ جگر سے اپنے دل کی دھڑکنوں کو صفحہ قرطاس پر اتارنے کی کوشش کروں گا۔

ہر حساس اور باشعور انسان کو اپنے ماحول اور اپنی دنیا سے کسی حد تک بے اطمینانی اور نا آسودگی کا احساس ہوتا ہے اور یہی احساس ماحول

کو بدلنے، دنیا کو سنوارنے اور معاشرے کو آگے بڑھانے کا محرک بن جاتا ہے۔ لیکن جب بے اطمینانی اور نا آسودگی کا یہ احساس بیزاری اور مایوسی کی سطح تک آکر انسان کو اس درجہ قنوطی بنا دے، کہ وہ اپنی دنیا کو بدلنے کی بجائے اس سے نفرت کرنا شروع کر دے، تو سمجھ لینا چاہئے کہ معاشرے کا بحران خطرے کے نشان تک پہنچ گیا ہے۔

میں جب اپنے گردوپیش کی دنیا پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے چاروں طرف ایک خوفناک دھواں اٹھتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ دھواں اس سیاسی، ذہنی اخلاقی اور سماجی انحطاط کی علامت ہے جو ہمارے معاشرے کو روز بروز قعرِ مذلت کی پستیوں میں دھکیلتا جا رہا ہے اور جس نے ہمارے قومی کردار اور ہماری شخصیت کو اپنی گرفت میں لے کر اس درجہ مسخ کر دیا ہے کہ اسے پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ ہم بحیثیت قوم اخلاق اور اقدار سے بے گانہ ہو کر ایک آبرومندانہ زندگی گذارنے کے حق سے دستبردار ہو گئے ہیں اور رفتہ رفتہ ہم نے ایک ایسا ضابطہ اخلاق اپنا لیا ہے، جس میں جھوٹ، دغا، فریب اور خوشامد کو نجات کا واحد ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ہم نہ صرف یہ کہ آگے نہیں بڑھ رہے ہیں، بلکہ پچھلی روایات کو بھی پامال کر رہے ہیں۔ کردار ہو یا گفتار، نیت ہو یا عمل ہماری کسی بات میں صداقت یا خلوص کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا، ہم میں سے ہر آدمی اپنے لئے اور زیادہ سے زیادہ اپنے کنبے کے لئے جیتا ہے اور اگر اُسے قوم یا سماج کے لئے کوئی حقیر سی قربانی دینا پڑے تو وہ کبھی بھی اس پر آمادگی ظاہر نہیں کرے گا۔ جھوٹ، بے ایمانی، دوغلا پن، جاہ پرستی اور جاہ طلبی ہمارے کردار کی نمایاں خصوصیات بن گئی ہیں۔ امیر

وغریب، حاکم ورعایا، شریف، رزیل، سبھی جھوٹ بولتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں کرتے۔ کوئی شخص محنت اور ریاضت پر یقین نہیں رکھتا، بلکہ کامیابی حاصل کرنے کے لئے short cuts کی تلاش میں رہتا ہے۔ ہر کوئی اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ اسے کم سے کم کام کے لئے زیادہ سے دام مل جائیں۔ ایسا کرتے ہوئے نہ اُسے اپنے ضمیر کا خوف ہوتا ہے نہ سماج کا ڈر۔ کیونکہ سماج میں ایسے ''ذہین'' لوگوں کو بڑا اونچا درجہ حاصل ہے۔ اگر کوئی خوش قسمت چور بازاری، بے ایمانی، دغابازی اور فریب سے دولت پیدا کرنے میں کامیاب ہو تو ہمارا سماج اس کی ہر خطا معاف کر کے اپنے ہاتھوں سے اس کے سر پر عزت اور شرافت کا تاج رکھ دیتا ہے۔ ہر جگہ قابلیت، اہلیت اور ریاضت کی بجائے سفارش کا جادو چلتا ہے اور پچھلے بیس برسوں میں اس کا اس درجہ رواج ہوا ہے کہ اس دیس میں اب بغیر سفارش کے کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔ ادب ہو یا صحافت، تعلیم ہو یا تہذیب ہر میدان میں کھوٹے سکوں کی قدر وقیمت بڑھ گئی ہے اور عزت وشرافت کی نئی قدریں وجود میں آگئی ہیں۔ ان اقدار کی رو سے صرف وہی قابل عزت واحترام ہے جو انسانیت، اخلاق اور ضابطے کی پرواہ کئے بغیر دوسرے کو پچھاڑ کر آگے بڑھ سکے۔ ذہنی سطح اتنی پست ہے کہ مسائل کا سمجھنا تو الگ رہا، ان کے وجود کا بھی احساس نہیں اور خود فریبی کا یہ عالم کہ ہر آدمی اپنے آپ کو افلاطون اور ارسطو سے کم نہیں سمجھتا۔ خودداری اور غیرت کو بیوقوفی اور ناعاقبت اندیشی کے مترادف سمجھا گیا ہے اور بڑے سے بڑا آدمی اپنا مطلب نکالنے کے لئے گدھے کو بھی مائی باپ کہنے میں کوئی جھجھک

محسوس نہیں کرتا۔ چھوٹی چھوٹی مراعات اور حقیر سے حقیر مفادات کے لئے میں نے بڑے بڑے ذی عزتوں کو اہل اقتدار کے پاؤں پکڑتے دیکھا ہے۔ چور بازاری اور ناجائز منافع خوری کو بزنس اور کاروبار کی مہذب اصطلاحوں کا جامہ پہنایا گیا ہے اور ہر انسان کی نگاہیں مستقبل کی بجائے حال پر جمی ہوئی ہیں۔ ہم صرف یہ سوچتے ہیں کہ آج کا دن کیوں کر گذرے گا۔ اس کی ہمیں پرواہ نہیں کہ کل ہمارے بچے کیسے جئیں گے، ملک خوشحال ہے یا بدحال، اس سے ہمیں کوئی بھی دلچسپی نہیں۔ ہم خوش حال ہوں، یہ ہمارا منتہائے مقصود ہے۔

ہمارے سامنے کوئی آئیڈیل، کوئی نظریہ یا کوئی بلند مقصد نہیں۔ ہم صرف اس لئے زندہ ہیں کہ ہم زندہ رہنے پر مجبور ہیں۔ ہم نے اپنے تعصّبات، تنگ نظری اور کم مائیگی کو اپنی زندگی کا فلسفہ بنا دیا ہے اور اپنی جہالت کو علم کا درجہ دے کر اپنی منزل متعین کی ہے۔ ہمارا المیہ ہے کہ ہم نہ ماضی پرست ہیں اور نہ مستقبل شناس۔ ہم اپنی کم ظرفی اور جہالت کے دھاگے سے بندھے ہوئے ماضی اور مستقبل کے درمیان لٹکے ہوئے ہیں اور افسوس اس بات کا ہے کہ ہمیں اپنی اس ذلت کا احساس بھی نہیں۔ اس صورتحال کا سب سے پریشان کن پہلو یہ ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اور ہماری نئی نسل اس ذہنی اور اخلاقی انحطاط کا سب سے زیادہ شکار ہے۔ غالباً اسی پود کے لئے شاعر مشرق نے کہا تھا۔

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسوں میں
نہ ادائے کافرانہ، نہ تراشِ آذرانہ

کالجوں اور یونیورسٹی میں تعلیم پانے والے ان معماروں سے

بات کر لیجئے تو معاشرے کے زوال اور مستقبل کی ویرانی کا اندازہ ہوگا۔ نہ انہیں مطالعے سے دلچسپی ہے نہ عمل سے۔ ان کی زندگی کا واحد مقصد جوں توں کر کے امتحان پاس کرنا اور پھر باقی زندگی نوکری کی تلاشی میں صرف کرنا ہے۔ بی، اے اور ایم، اے کے طالب علموں کا ذہنی معیار اتنا پست ہے کہ تعلیم کی اہمیت اور عظمت پر سے وشواس اٹھتا جا رہا ہے۔ میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہمارا تعلیم یافتہ یا تعلیم پانے والا طبقہ ان پڑھ لوگوں کے مقابلے میں زیادہ جاہل، متعصب اور تنگ نظر ہے۔ دو چار حرف پڑھکر یہ لوگ اپنی تنگ نظری اور تنگ دامنی کے لئے خوبصورت جواز تلاش کرتے پھرتے ہیں اور اس طرح ان کے ذہن کا نشوونما ایک سطح پر آکر رُک جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہمارے سماج نے کوئی قابل ذکر ذہن، شخصیت یا رہنما پیدا نہیں کیا۔ اچھا برا ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے، وہ تحریک آزادی کی پیداوار ہے، آزادی کی نہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ بحیثیت قوم کے ہمارا نشوونما رُک گیا ہے اور فکر واحساس کی دنیا پر ایک جمود چھایا ہوا ہے۔ قومی زندگی کے سوتے خشک پڑ گئے ہیں اور اس پر ستم ظریفی یہ کہ ہمیں اپنی ذلت اور محرومیوں کا احساس بھی نہیں۔ شاعر کے الفاظ ہیں ؎

"کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا"

اور زوال کا عمل چونکہ کسی ایک خاص جگہ پر آکر ٹھہر نہیں جاتا۔ اس لئے ہم بتدریج پستیوں کی جانب لڑھکتے جا رہے ہیں۔ سماج کا اونچا اور آسودہ حال طبقہ اپنے آپ کو مروجہ اخلاق کی ہر پابندی سے محفوظ سمجھتا ہے اور ان کے نزدیک ملک، قوم، معاشرہ محض ان کی آسودگی اور

تحفظ کا ایک ذریعہ ہے اور بس ہزاروں اور لاکھوں روپے کمانے والے کبھی کسی قومی مقصد کے لئے پھوٹی کوڑی خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن شراب اور جوئے میں لاکھوں روپے گنوانے کا ایک بھی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ خدمت خلق اور رفاہِ عامہ کا تصور اتنا فرسودہ ہو چکا ہے کہ اس سے دلچسپی رکھنے والے کو صحیح الدماغ سمجھنے میں تامل ہوتا ہے۔ مسجدوں اور مندروں کے نام پر لاکھوں روپے کی جائیداد جمع کی جاتی ہے، لیکن سکولوں اور شفاخانوں کے لئے کسی کے پاس پیسہ نہیں اور عبادت گاہوں کے نام پر جمع کئے جانے والے اس روپے کا کیا مصرف ہوتا ہے؟ اس سوال پر حکم کفر تو دیا جاسکتا ہے، لیکن اس کا جواب نہیں دیا جا سکتا۔ ہمارے ہاں ڈاکٹر، معلم، وکیل، انجینئر اور پیشہ ور لیڈروں کی افراط ہے لیکن یہ سب لوگ اپنی اپنی نجات ڈھونڈ رہے ہیں۔ کوئی ایسا نہیں جو قوم نہ سہی، اپنے محلے کی نجات سے دلچسپی رکھتا ہو۔ اسی لئے ڈاکٹر کو اپنے فن کی تجارت کر کے زیادہ سے زیادہ مریضوں کا خون چوسنے میں، معلم کو اپنے تیس دن پورے کر کے اپنی تنخواہ وصول کرنے میں، وکیل کو اپنے موکل کی اور انجینئر کو قوم کی جیب کاٹنے میں اپنی نجات نظر آتی ہے اور سیاسی لیڈر؟ یہ حضرت دو وقت کی روٹی کے لئے پوری قوم کو فروخت کرنے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ مولوی اور پنڈت اس فکر میں ہیں کہ کسی طور ذہن کے اندھیروں میں روشنی کا گذر نہ ہونے پائے۔ اس لئے وہ مذہب کو بیداری کا ذریعہ بنانے کی بجائے اسے افیم کی پُڑیاں بنا کر پیش کرتے ہیں۔ حکمران اس کوشش میں ہیں کہ لوگوں کو اپنی ذلت اور رسوائی کا احساس نہ ہونے پائے، اس لئے وہ

خیرات بانٹنے میں مصروف ہیں اور جب بھی یہ بدقسمت قوم کروٹ بدلنے لگتی ہے، اسے خیرات کی تھپکیاں دے دے کر سلا دیا جاتا ہے اور نتیجہ یہ کہ عادات اور اطوار کے اعتبار سے ہم بھکاریوں کی ایک قوم بن کر رہ گئے ہیں، جو صرف بھیک مانگ کر ہی زندہ رہ سکتی ہے اور ہم ہر بات کے لیئے بھیک مانگتے ہیں اور بھیک مانگنے کے ساتھ ساتھ شرم، ذلت اور رسوائی کا جو تصور وابستہ تھا وہ اس درجہ محترم بن گیا ہے کہ اعلیٰ اور ادنیٰ کسی کو بھیک مانگتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی، حتیٰ کہ جب کبھی ہمیں اپنے حقوق کا مطالبہ کرنا ہو تو ہم اپنے حقوق کی بھیک مانگتے ہیں۔ غرض قوم کا ہر فرد کسی نہ کسی چوکھٹ پر بھیک مانگتا ہوا نظر آئے گا۔ اُسے اپنی صلاحیت، اپنی جدوجہد اور اپنے زور بازو پر کوئی اعتماد نہیں۔ وہ رحم اور مروت کے ٹکڑوں پر جینے میں ہی اپنی عافیت سمجھتا ہے۔

میں نے جو کچھ کہا ہے یہ کہتے ہوئے مجھے شدید ذہنی کرب اور جذباتی اذیت سے دوچار ہونا پڑا ہے، لیکن میرے خیال میں کسی نہ کسی کو یہ کہنا ہی چاہئے تھا اور اسی لئے میں نے بڑی بے رحمی کے ساتھ کچھ دکھتی رگوں کو چھیڑا ہے۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ اس چھیڑ سے صرف درد کی شدت کا احساس بڑھ جائے گا۔ درد کا مداوا نہیں ہو گا۔ لیکن مداوا میرا مقصد بھی نہیں۔ میں تو زخموں کو چھیڑ چھیڑ کر اپنی جاگتی ہوئی قوم کے سوئے ہوئے احساس کو جگانا چاہتا ہوں۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے جو میرے علاوہ کوئی اور محسوس نہ کرتا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ میری ہی طرح بہت سے اور لوگ بھی اس نتیجے پر پہنچے ہوں کہ ہم سیاسی، سماجی، ذہنی اور تہذیبی اعتبار سے

آگے بڑھنے کی بجائے روز بروز پیچھے کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ لیکن میں اس انفرادی احساس کو ایک اجتماعی جذبہ بنا کر اس جمود کو اور بے حسی کو ختم کرنا چاہتا ہوں جو ہماری کائنات پر مسلط ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ جس انحطاط اور بحران سے ہم گذر رہے ہیں اس سے پورا ملک بلکہ بہت سے دوسرے ممالک بھی دوچار ہیں۔ لیکن میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ ہر ملک میں ایسی قومیں موجود ہیں، جنہیں انحطاط اور زوال کی تاریکیوں میں بھی روشنی کی ایک کرن کا درجہ حاصل ہے لیکن میرے وطن، میرے کشمیر میں مجھے روشنی کی ایک بھی کرن نظر نہیں آتی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے یہ تاریکی اور تذلیل کے داغ ہمارے مقدر کا ایک حصہ بن گئے ہوں۔ جیسے اب کبھی ان اندھیروں میں روشنی کا گذر ممکن نہ ہو۔ خوش قسمتی سے میری اس مایوسی میں میرے بہت سے دوست، احباب میرے شریک نہیں ہیں اور خدا کرے کہ میری قنوطیت میرے وہم کے سوا کچھ نہ ہو۔ لیکن کچھ بے رحم حقیقتیں بار بار اپنے وجود کا احساس دلا کر مجھے اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا کرتی رہتی ہیں اور ان ہی اندیشوں سے میری قنوطیت کو غذا ملتی رہتی ہے۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ ہمارے موجودہ بحران، انحطاط، زوال اور جمود کے لئے کچھ تاریخی اور سیاسی اسباب موجود ہیں اور آئندہ اشاعت میں ان اسباب کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کرونگا۔

۱۲ر نومبر ۱۹۶۷ء

شب گزیدہ سحر

پچھلے ہفتے میں نے اس ذہنی انحطاط اور اخلاقی بحران کی طرف توجہ دلائی تھی جو بڑی تیزی کے ساتھ ہمیں ذلت، زوال اور پستیوں کی طرف لے جا رہا ہے اور جن کی وجہ سے ہمارا قومی کردار مسخ ہو کر رہ گیا ہے۔ آج میں اُن تاریخی اور سیاسی اسباب کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرونگا، جو اس صورتحال کے لئے بالواسطہ یا براہ راست ذمہ دار ہیں۔

سماجیات اور نفسیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ کردار کی تشکیل اور شخصیت کی تعمیر ایک انتہائی پیچیدہ عمل ہے اور اس میں عصرِ رواں کے علاوہ کچھ ایسے زمانے بھی حصہ لیتے ہیں، جن کا تعلق ماضی قریب سے ہی نہیں ماضی بعید سے بھی ہوتا ہے۔ اسی لئے موجودہ صورتحال کو بہتر طور سمجھنے کے لئے ہمیں اپنی تاریخ کے اُس دور پر بھی نظر رکھنا ہوگی، جو بہت حد تک ہماری قومی شخصیت پر اثر انداز رہا ہے اور یہ وہ دور ہے جب اغیار کے تسلط اور صدیوں کی مسلسل غلامی نے رفتہ رفتہ ہمیں اتنا محکوم اور مجبور بنا دیا تھا کہ مستقبل سے ہمارا اعتماد اُٹھ گیا اور ہم نے ظلم و تشدد اور جبر واکبراہ کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی شکست کا اعلان کر دیا۔ غلامی یوں بھی انسان کو بے دست وپا بنا دیتی ہے اور جب اس کے ساتھ اپنی بے کسی اور بے بسی کا احساس بھی شامل ہو جائے تو انسان رفتہ رفتہ ذلت اور رسوائی کو اپنا مقدر سمجھ کر اس کا خوگر ہو جاتا ہے۔ جس قوم نے پٹھانوں کا ظلم، سکھوں کا تشدّد اور ڈوگروں کی بے رحمی دیکھی

ہو، اس کے لئے کسی ضابطہ اخلاق یا فلسفہ اقدار پر ایمان لانا کیوں کر ممکن ہوسکتا تھا؟ اور جن غیر ملکی سیاحوں نے اپنے سفر ناموں میں اہل کشمیر کی اخلاقی پستی، قدامت پرستی اور سماجی برائیوں کا بالتفصیل ذکر کیا ہے ان میں سے صرف لارنس نے اس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ظلم وتشدد اور بہیمیت کے جو صدمات کشمیر کو اٹھانا پڑے ہیں، وہ دنیا کی کسی قوم کو بھی اٹھانا پڑتے تو اس میں وہی برائیاں پیدا ہوتیں جو کشمیریوں میں من حیثیت الاقوام موجود ہیں۔ اس طرح ہمارے کردار اور ہماری شخصیت پر اس دور کی گہری چھاپ موجود ہے، جب ہم اجنبیوں کا گرانبار ستم سہتے سہتے اپنی دنیا سے بیزار اور اپنی عاقبت سے مایوس ہو گئے تھے، جب ہم اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے جیتے تھے، جب ہم زندہ رہنے کو ہی زندگی کا مقصد سمجھ بیٹھے تھے، جب ہماری کوئی عزت وآبرو نہیں تھی اور جب زندگی ایک ایسا بوجھ تھی، جسے اٹھانے کے لئے جھوٹ فریب، دھوکہ اور خوشامد سب کچھ جائز تھا۔ پھر فضا بدلنے لگی، زنجیریں اتنی بھاری ہوگئیں کہ ان کا وزن محسوس ہونے لگا، پھر یہ زنجیریں توڑنے کی آرزو جوان ہونے لگی اور بالآخر ایک نئی سحر کا طلوع ہوا۔ یہ ہماری امیدوں، آرزؤں اور خوابوں کی سحر تھی اور اسے ہم نے اپنے خونِ جگر سے سنوارا۔ ہمارے سامنے ایک منزل تھی۔ ایک مقصد تھا۔ ہم اپنی گردنوں سے غلامی کا طوق اتار کر ایک جہانِ تازہ آباد کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے ہم نے خونِ صد ہزار نجم کی قربانی دے کر ایک نئی سحر کا خواب دیکھا۔ سحر نمودار ہوگئی۔ آزادی کا سورج بھی طلوع ہوا، لیکن جلد ہی ہمیں اس بات کا احساس ہونے لگا، کہ یہ وہ سحر نہیں

جس کا ہم نے خواب دیکھا تھا۔ یہ وہ سورج بھی نہیں تھا جس کی ہم نے تمنا کی تھی۔ یہ سحر شب گزیدہ سحر تھی اور یہ سورج نظر کا دھوکا تھا۔ یہیں سے ہمارے موجودہ انحطاط کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ ۱۹۴۷ء سے ہماری آزادی ہی نہیں، ہمارے disillusion ment کی تاریخ بھی شروع ہوتی ہے۔ جدوجہد آزادی کے دوران جن اقدار کی خاطر ہم نے قربانیاں دی تھیں، آزادی کے فوراً ہی بعد ان کو پاؤں تلے روندنے کا عمل شروع ہو گیا اور عوام کو یہ محسوس ہونے لگا کہ آزادی کی نیلم پری صرف چند افراد یا زیادہ سے زیادہ ایک مخصوص طبقے کی تقدیر بدلنے کیلئے جلوہ گر ہوئی ہے۔ مخصوص سیاسی حالات کی بناء پر کشمیر میں آزادی کے ساتھ ہی داروگیر ظلم وتشدد اور قید وبند کا ایک نیا دور شروع ہو گیا اور عام لوگ یہ سوچنے لگے کہ اس آزادی سے غلامی بدرجہا بہتر تھی کہ اس میں ایک نظم، ایک ترتیب اور ایک ضابطہ تو تھا۔ سمجھدار لوگوں نے یہ کہکر اپنے آپ کو تسلی دی کہ ہر نئے انقلاب کے آغاز میں کچھ بے راہ روی، بے ترتیبی اور بے ضابطگیاں ناگزیر ہوتی ہیں، اس لئے رفتہ رفتہ صورتحال سدھر جائے گی اور نئے حکمرانوں میں اقتدار کے صحیح استعمال کا سلیقہ پیدا ہو جائے گا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ توقع پوری نہیں ہو سکی اور دن گزرنے کے ساتھ ساتھ بے انصافیوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ستم ایجاد حکمرانوں نے حصولِ اقتدار کو ہی اپنی منزل سمجھ کر اپنی کم ظرفی اور تہی مائیگی کا ثبوت دینا شروع کر دیا۔ ردِ عمل کے طور پر عوام میں بیزاری اور غم وغصے کی لہر دوڑ گئی اور یہ بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر رہنماؤں نے اپنا راستہ بدلنے کی کوشش کی، لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ انہوں نے جس مشین کو چالو کر

کے اپنے حریفوں کو ٹھکانے لگا دیا تھا، وہ خود اس کی زد میں آ کر کچلے گئے اور کشمیر کی تقدیر پر ایک بہت ہی گہرا اندھیرا چھانے لگا۔

۱۹۵۳ء کے بعد ہمارے زوال، ذلت اور انحطاط کا عمل تیز تر ہو گیا۔ نئے نئے خداؤں نے نئے نئے ستم ایجاد کئے اور ایک وسیع پیمانے پر قومی کردار کو مسخ کر کے عوام کی قوت مزاحمت کو ختم کرنے کی سبیلیں کی گئیں۔ اقتدار اور دولت کی دیوقامت مشینری کے سہارے پوری قوم کو کورپٹ کرنے کی کوششوں کا آغاز ہوا۔ اور جیلاس کے الفاظ میں ایک نیا طبقہ new class وجود میں آیا یا یوں کہئے کہ وجود میں لایا گیا۔ یہ طبقہ بلا شرکت غیرے مراعات اور نوازشات اور عنایات کا مستحق قرار پایا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس طبقے کی دنیا بدل گئی، بے ایمانی، بے غیرتی اور بے اصولی کو کامیابی اور کامرانی کی پہلی سیڑھی قرار دیا گیا۔ زندہ رہنے کے لئے حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری بن گیا۔ جن لوگوں نے مزاحمت کی، ان پر عزت تحفظ اور آبرو کی زندگی حرام کر دی گئی۔ پٹھانوں، سکھوں اور ڈوگروں کی ستائی ہوئی قوم نے جب آزادی کے نام پر اپنے ہی بھائی بندوں کو ظلم و ستم کی صلیب اٹھاتے ہوئے دیکھا تو اعتقادات کی دنیا میں ایک زلزلہ آ گیا اور عام آدمی محسوس کرنے لگا کہ جیسے عزت، شرافت اور اخلاق کی تعریف بدل گئی ہو۔ یہی وہ نفسیاتی لمحہ تھا جب ہم نے مِن حیث الاقوام ہتھیار ڈال دیئے اور اس نئے نظام کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا، جو ہماری تضحیک اور تذلیل کے لئے قائم ہوا تھا۔

محنت، ریاضت، اور قابلیت سے ہمارا اعتبار اٹھ گیا ہم نے

آگے بڑھنے کے لئے اقتدار کی چوکھٹوں پر سر جھکانا سیکھ لیا اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے نئے نئے نسخے آزمانا شروع کر دئے۔ ادھر نت نئی ترغیبیں سمندِ شوق کو تازیانہ دیتی رہیں اور ہم پورے اہتمام کے ساتھ اخلاقی، ذہنی اور سماجی انحطاط کی منزل کی جانب بڑھتے گئے۔ دو ایک مثالوں سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ جب رشوت خوری، کنبہ پروری اور ناانصافیوں کو قانون کی حمایت اور اخلاق کا درجہ حاصل ہو تو انسان کی نفسیات اور اس کی اقدار کس درجہ متاثر ہوں گی۔ ایک ہی محلے میں دو کلرک سال ہا سال سے پڑوسیوں کی حیثیت سے رہتے آئے ہیں۔ دونوں کی تنخواہ برابر ہے اور دونوں کے پاس دو چھوٹے چھوٹے آبائی مکان ہیں۔ پھر دیکھتے دیکھتے ایک کلرک کا مکان ایک عظیم الشان عمارت میں بدل جاتا ہے اور دوسرے کلرک کا جھونپڑی نما مکان اپنے مالک کی ناقابلیت اور نااہلیت پر ماتم کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جھونپڑی کو محل میں بدلنے والے کلرک کی عزت اور اس کے سماجی رتبے میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اب وہ اپنے افسروں کو اپنے گھر بلانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا، سب لوگ اس کی قابلیت کی تعریف کرتے ہیں اور اس قابلیت کی بنا پر اس کی ترقی ہو جاتی ہے اور وہ کلرک سے سپرنٹنڈنٹ بن جاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے ہاتھ کی صفائی سے زندگی کی دوڑ میں اپنے پڑوسی کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ اب غور کیجئے کہ اس کے کلرک ساتھی اور محلے کے لوگوں پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ آپ تمام عمر پائی پائی بچانے کے بعد بھی اس قابل نہیں کہ اپنے گرتے ہوئے مکان کی مرمت کر سکیں۔

❀❀❀❀ (یہ مضمون اتنا ہی دستیاب ہو سکا)

۱۵/ مئی ۱۹۷۰ء

فرقہ وارانہ فسادات اور مرکز

احمد آباد کے زخموں سے ابھی خون بہہ رہا تھا، کہ چائباسہ (بہار) اور بھیونڈی (مہاراشٹر) میں خون کے سوداگروں نے اپنی پیاس بجھانے کیلئے بے گناہ مسلمانوں کو بے دریغ قتل کرنا شروع کر دیا۔ سرکاری اندازے کے مطابق بہیمت اور بربریت کے اس رقص میں ابھی تک دو سو سے زائد جانیں تلف ہو چکی ہیں۔ لیکن غیر سرکاری ذرائع سے موصول شدہ اطلاعات کے مطابق یہ تعداد ایک ہزار سے بھی زیادہ ہے اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مرنے والے کس مذہب اور فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اس وقت بھی جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ بھیونڈی، جلگاؤں اور ماہم کے علاوہ تھانہ اور کلیان کے ضلعوں پر بھی موت اور تباہی کے سائے گہرے ہوتے جارہے ہیں اور یہ کہنا مشکل ہے کہ بھیونڈی سے شروع ہونے والی آگ کہاں جا کر بجھے گی۔

احمد آباد کے قتلِ عام کے بعد یہ اُمید پیدا ہوگئی تھی کہ شاید کچھ دنوں کے لئے موت کے تاجر اور خون کے سوداگر اپنی تھکن دور کرنے کے لئے ''اپنی سرگرمیاں'' بند کر دیں گے۔ لیکن چائباسہ اور بھیونڈی کے

واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ احمد آباد کے ’’ہدایت کاروں‘‘ نے اپنے قیمتی وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور وہ اُسی وقت سے نئے فسادات کی تیاریوں میں لگ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ چائباسہ اور بھیونڈی کے فسادات میں بھی وہی تنظیم، طریقہ اور تجربہ کارفرما نظر آتا ہے کہ جس نے احمد آباد کو ہندوستان کی ذلت اور رسوائی کی علامت بنا دیا ہے۔

ہندوستانی فلموں کی طرح ہر فرقہ وارانہ فساد کی کہانی ایک جیسی ہوتی ہے۔ اور جس طرح آپ فلم کا اشتہار پڑھتے ہی کہانی کے آغاز اور انجام کا اشارہ کر سکتے ہیں، بالکل اسی طرح فرقہ وارانہ فساد کی خبر سُنتے ہی آپ اس کے فوری اسباب اور پھیلاؤ کے متعلق اپنا فیصلہ صادر کر سکتے ہیں۔ ہر فساد کی ابتدا گائے، مسجد، مندر یا کسی جلوس سے ہوتی ہے اور انتہا تک پہنچتے پہنچتے سینکڑوں جانیں، ہزاروں مکان اور لاکھوں روپے کی جائداد تلف ہو کر ایک نئے فساد کے بیج بو دیتے ہیں۔ پچھلے بیس بائیس برسوں میں یہ کہانی اتنی بار دہرائی جا چکی ہے کہ اب فرقہ وارانہ فساد کی خبر سُن کر نہ حیرت ہوتی ہے اور نہ کوئی گہرا صدمہ، کچھ دنوں کے لئے ارباب حکومت اور اہل سیاست رسمی طور پر افسوس اور ہمدردی کا اظہار کر کے اپنے اپنے کام میں لگ جاتے ہیں اور فساد سے متاثرہ لوگ اپنی بے بسی اور بے کسی پر آنسو بہا کر غم غلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

موسموں کے تغیرو تبدل، آفاتِ سماوی اور ٹریفک کے حادثوں کی طرح فرقہ وارانہ فسادات کو بھی ایک ناگزیر مصیبت سمجھ کر گوارا کر لیا جاتا ہے اور گذشتہ بائیس برس کی تاریخ میں ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ جہاں فرقہ وارانہ فسادات کے دوران قتل لوٹ مار اور غارتگری کرنے والے کسی مجرم

کو کوئی سزا دی گئی ہو اور اب یہ حالت ہے کہ بڑے سے بڑا فساد بھی ہمیں چونکا دینے میں ناکام رہتا ہے۔ ہمارا ضمیر بھی کُند ہو چکا ہے اور ہم نے احمد آباد اور مہا راشٹر جیسے خونیں فسادات پر آنسو بہانے کو بھی ایک رسم بنا کر رکھ دیا ہے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ ملک کی سالمیت، عزت اور آبرو کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے والے فسادات کا تدارک نہ ہو سکے۔ چائباسہ، بھونڈی، جلگاؤں اور ماہم کے حالیہ واقعات نے ایک بار پھر اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات ایک منظّم منصوبے اور پروگرام کے تحت رونما ہو جاتے ہیں اور فسادات سے قبل فرقہ پرست جماعتیں باقاعدہ طور پر لوگوں کو فساد کی تحریک اور ترغیب دیتی ہیں۔ مسلمانوں کے مکانات اور ان کی دُکانوں پر نشانات لگا کر انہیں "ضروری کاروائی" کے لئے مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ چھُرا گھونپے، آگ لگانے اور لوٹ مار کی تربیت دی جاتی ہے اور پھر جب "سب انتظامات" مکمل ہو جاتے ہیں۔ تو کسی معمولی واقعے کو بنیاد بنا کر فساد شروع کر دیا جاتا ہے۔ اور پھر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق بے چارے مسلمانوں کو تہہ تیغ کرنے کا کام انجام پاتا ہے۔ سرکاری مشنری فساد سے پہلے خاموش تماشائی کی طرح یہ سب کچھ دیکھتی رہتی ہے اور جب فساد شروع ہو جاتا ہے تو مظلوموں اور بے گناہوں کو تحفظ دینے کی بجائے غنڈوں اور بدمعاشوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ احمد آباد کے قتلِ عام کے دوران سرکاری افسروں کے شرمناک رویئے کی کئی مثالیں سامنے آچکی ہیں۔ اور ہم یہ سمجھے میں حق بجانب ہیں، کہ جہاں جہاں بھی فرقہ وارانہ فسادات منظّم کئے جاتے ہیں وہاں فسادیوں کو

سرکاری افسروں کی اعانت اور ان کا تعاون حاصل ہوتا ہے۔ ورنہ ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ پولیس کی موجودگی اور سرکاری افسروں کی نگہداشت کے باوجود اس وسیع پیمانے پر گڑ بڑ کیوں کر ممکن ہو سکتی ہے؟ بھیونڈی کے فسادات کے متعلق موصول شدہ اطلاعات کے مطابق فساد شروع ہونے سے کئی دن پہلے جن سنگھ اور آر۔ ایس ایس کے کارکن وہاں انتہائی شر انگیز پروپا گنڈا میں مصروف تھے۔ فسادات کا بیک وقت کئی دیہات میں پھیل جانا اس بات کی شہادت ہے، کہ ان کے لئے پہلے سے زمین ہموار کی گئی تھی اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ مقامی ایڈمنسٹر یشن کی اعانت اور تعاون کے بغیر ممکن نہ تھا۔ ان حالات میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فسادات کی ذمہ داری صرف جن سنگھ اور آر، ایس، ایس پر ہی نہیں مہاراشٹر کی حکومت پر بھی عائد ہوتی ہے اور اربابِ حکومت کا جرم فرقہ پرستوں کے گناہ سے زیادہ سنگین اور قابلِ مواخذہ ہے۔ مصیبت زدوں کو امداد اور مرنے والوں کے لواحقین کو معاوضہ دینے سے وہ ریاستی حکومتیں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا نہیں کر سکتیں کہ جن کے تغافل اور تعاون سے فرقہ وارانہ فسادات رونما ہو جاتے ہیں۔ مصیبت زدوں کے زخموں پر مرہم رکھنے سے فسادات کا تدارک نہیں ہو سکتا اور اگر مرکزی حکومت دیانت داری سے فرقہ وارانہ فسادات کی بڑھتی ہوئی آگ کو روکنے کے لیے کوشاں ہے، تو اُسے اظہار افسوس اور عدالتی تحقیقات سے آگے بڑھ کر فرقہ پرستی کے ان بڑے بڑے قلعوں پر یلغار کرنا ہوگی کہ جنہیں ریاستی حکومتوں اور بڑے بڑے سیاسی لیڈروں کا تحفظ حاصل ہے۔ کون نہیں جانتا کہ فرقہ پرست عناصر سیاسی جماعتوں اور تنظیموں میں ہی نہیں

، سرکاری ایڈمنسٹریشن میں اونچے اونچے منصبوں پر بھی جلوہ گر ہیں اور جب ساری ایڈمنسٹریشن ہی فرقہ واریت سے ملوث ہو، تو فرقہ وارانہ زہر کو انتظامی سطح پر روکنا یقیناً ناممکن ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ آئے دن فرقہ وارانہ فسادات کی تعداد اور شدت میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر فرقہ وارانہ فساد کے لیے وہاں کی ریاستی حکومت کی ذمہ دار قرار دیا جائے اور اگر کسی فساد میں ایک درجن سے زیادہ لوگ مارے جائیں تو وہاں کی حکومت کے لیے مستعفیٰ ہونا ضروری قرار دیا جائے تاکہ ہر ریاستی حکومت اپنی ذمہ داریوں کو زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرے۔ اسی طرح اُس ریاست میں جہاں فرقہ دارانہ فساد رونما ہو، ریاستی حکومت متعلقہ ضلعے کے افسروں پر یہ بات واضح کر دے، کہ فساد کی تمام تر ذمہ داری انہیں پر عائد ہوگی اور اس کے ساتھ ہی اس علاقے پر تعزیزی ٹیکس عائد کر دے۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ نہ فساد کی ذمہ داری کا تعین ہوتا ہے اور نہ تغافل برتنے والے افسروں سے کوئی باز پرس ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ ریاستی حکومتیں فرقہ وارنہ فسادات کو ایک معمول کا واقعہ سمجھ کر گوارا کر لیتی ہیں، اور مرکزی حکومت اسے ریاستی حکومت کی ذمہ داری سمجھ کر نظر انداز کر دیتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ جب تک فسادات میں قتل، لوٹ مار، اور آگ لگانے والے ایک فسادی کو اس بات کا احساس نہ ہو کہ اُسے اپنے جرم کی سزا ملے گی، فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام ناممکن ہے۔ ہر چھرا گھونپنے والے کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اُسے اس جرم کے لیے پھانسی کے تختے پر لٹکنا ہوگا، ہر آگ لگانے والے کو احساس ہونا چاہیے

کہ اُسے دس سے چودہ برس تک جیل میں سڑنا ہوگا۔

اسی طرح ہر بلوائی کو یہ یقین ہونا چاہیے کہ وہ قانون کی زد سے کہیں بچ کر نہیں جا سکتا۔ صرف یہی احساس فسادیوں کو شرارت اور شر انگیزی سے روک سکتا ہے۔ ورنہ ہر چھُرا گھونپنے والا، آگ لگانے والا اور بلوہ کرنے والا یہی سمجھتا ہے کہ بہت سے لوگوں کے ساتھ مل کر جرم کا ارتکاب کرنے سے اس کی اپنی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وہ احساس ہے جس نے فسادیوں کے حوصلے بلند اور مظلوموں کے حوصلے پست کر دیے ہیں۔

احمد آباد کے فسادات کے متعلق مشہور سرودیہ لیڈر جے پرکاش نرائن نے اس بات پر حیرت اور افسوس کا اظہار کیا تھا کہ اکثر فسادات کی ابتدا مسلمانوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ چاپٹاسہ اور بھونڈی کے تازہ ترین حادثات سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ کچھ لوگوں کو فساد شروع کرنے کے لیے ایک بہانے کی ضرورت ہوتی ہے اور بہانہ اگر مسلمان ہو تو فساد شروع کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جے پرکاش جی کو مسلمانوں کی بے وقوفی پر حیرت اور افسوس ہوا تھا۔ ورنہ مسلمان اتنا بیوقوف اور بے ہودہ نہیں کہ اپنی حیثیت کو بھول کر سانپ کے منہ میں انگلی دیدے۔ ہمارے کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مسلمان فرقہ پرست نہیں یا یہ کہ وہ کبھی کوئی شرارت نہیں کر سکتا۔ لیکن احمد آباد کے خونی ڈرامے کے بعد وہ مہاراشٹر میں بھی اکثریتی فرقے کے خلاف شرانگیزی کریگا، یہ قطعی ناممکن ہے۔ اور اس کے خلاف فسادات بھڑکانے کا الزام محض بہتان ہے اور کچھ نہیں، ہندوستانی مسلمانوں کو قومی دھارے کے

ساتھ ہم آہنگ ہونے کا مشورہ دینے والے قوم پرست لیڈروں کو بھی سوچنا ہوگا کہ احمد آباد، چائباسہ اور بھونڈی کے واقعات کے بعد مسلمان ہندوستان کے کس قومی دھارے کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہندوستانی مسلمانوں کا مسئلہ اب صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں رہا ہے یہ اب پورے ہندوستان کا مسئلہ ہے اور پورے ہندوستان کو اس بات کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ ساڑھے پانچ کروڑ مسلمانوں کو اس ملک میں باعزت زندگی گزارنے کا حق دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اگر جواب میں یہ کہا جائے، کہ مسلمانوں کو یہ حق ہندوستانی آئین نے دیا ہے اور ان سے یہ حق کوئی چھین نہیں سکتا تو اس سے مسلمانوں کو تسلی نہیں ہوسکتی، کیونکہ آئینی ضمانت اور بنیادی حقوق کے ہوتے ہوئے بھی ان کی زندگی، ان کے وجود اور ان کی سلامتی کو ایک مستقل خطرہ لاحق ہے آئین سے دی گئی ضمانتوں اور بنیادی حقوق کا کوئی مطلب ہے، تو ان تمام سیاسی، مذہبی اور نیم مذہبی جماعتوں پر پابندی عائد کر کے اس زہر کو پھیلنے سے روک دینا ہوگا کہ جو پوری فضا کو مسموم بنا رہا ہے۔ ضرورت ہو تو آئین میں ترمیم کر کے ہر اُس شخص، تنظیم یا جماعت کو کچلنے کے لیے اختیارات دیے جانے چاہئیں، کہ جو کسی اقلیتی فرقے کے خلاف سرگرم عمل ہے۔ ایسے اخبارات رسائل اور کتابوں کی اشاعت پر پابندی عائد ہونا چاہئے کہ جو بالواسطہ طور پر کسی دوسرے طبقے کے خلاف منافرت پھیلانے کا سبب بن سکیں۔

جن سنگھ اور آر، ایس، ایس جیسی فرقہ پرست تنظیموں کو ہمارے سیاسی نظام نے جو عزت بخشی ہے اس نے سیکولر قوتوں کی مشکلات میں

اور اضافہ کر دیا ہے۔ فرقہ پرستی کے ان قلعوں کو مسمار کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم انہیں اپنے سیاسی نظام میں حصہ لینے کے نا اہل بنائیں۔ ان جماعتوں پر پابندی عائد کرنا، اس منزل کی طرف ہمارا پہلا قدم ہونا چاہیے۔ لیکن ہم نے انہیں خلاف قانون قرار دینے کے بجائے قومی یک جہتی کانفرنسوں میں مدعو کر کے ان کی توقیر میں اضافہ کر دیا ہے اور جب تک ہماری یہ منافقانہ روش قائم رہے گی فرقہ واریت کے خلاف کوئی فیصلہ کن جنگ نہیں لڑی جا سکتی۔

ہندوستان میں آئے دن رونما ہونے والے فسادات کی براہ راست زد تو ہندوستانی مسلمانوں پر پڑتی ہے، لیکن کشمیری مسلمان کی نفسیات بھی اس سے بُری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ اور اگر آج کشمیر کا مسلمان پاکستان کو اپنی عافیت اور سلامتی کی آخری منزل سمجھتا ہے تو اس پر برہم ہونے کے بجائے اس کے دُکھ درد کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

۸/اگست ۱۹۷۰ء

آمدورفت کا مسئلہ

ملک کی تقسیم نے جن ہزاروں مسائل کو جنم دیا ہے، اُن میں سب سے زیادہ تکلیف دہ اور پیچیدہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان آمدورفت کا مسئلہ ہے اور بدقسمتی یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ انسانی مسلہ سلجھنے کی بجائے اُلجھتا جا رہا ہے۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ امرتسر سے لندن تک ہزاروں میل کا سفر ایک دن میں طے ہو سکتا ہے۔ لیکن امرتسر سے لاہور تک چالیس پچاس میل کا فاصلہ طے کرنے میں مہینے نہیں، کئی سال لگ جاتے ہیں ۔ اور سالہا سال کی زحمت اور ذلت برداشت کرنے کے بعد جو لوگ چالیس بچاس میل کا یہ سفر طے کر پاتے ہیں ، وہ اپنے آپ کو خوش قسمت اور خوش نصیب سمجھتے ہیں۔ دونوں حکومتوں نے عام لوگوں کی آمدورفت پر اتنی سخت اور ناروا پابندیاں عائد کی ہیں، کہ دونوں طرف سینکڑوں نہیں، ہزاروں لوگ گزشتہ بیس بائیس برس میں انتظار کی صعوبتیں برداشت کرتے کرتے سفر آخرت کے لئے روانہ ہو گئے۔ آزادی کے ۲۳ برس بعد بھی ہندوستان اور پاکستان

کے حکمرانوں کو ابھی تک اس بات کا احساس نہیں ہوا ہے، کہ دونوں ملکوں کے درمیان نفرت، شک، اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کا سب سے موثر اور مفید طریقہ یہ ہے، کہ عام لوگوں کو ایک دوسرے سے ملنے ملانے، ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنے اور آپس کے دُکھ درد میں شریک ہونے کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم کیے جائیں، مگر سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستان اور پاکستان کا حکمران طبقہ عوامی سطح پر اس مفاہمت اور مکالمے کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتا ہے؟

گذشتہ بیس بائیس برس کے حالات اور واقعات کی روشنی میں یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ دونوں ملکوں میں مفاد خصوصی اس قسم کے ڈائیلاگ اور باہمی میل جول کو سخت ناپسند کرتا ہے اور جب بھی ان دو ہمسایوں کے تعلقات میں خوشگواری اور استواری پیدا ہونے لگتی ہے، دونوں ملکوں میں کچھ لوگوں کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں اور وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے، کہ جب تک ماحول میں تلخی اور فضا میں زہر نہ گھل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ۲۴ برس کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان آمدورفت کی وہ سہولتیں بھی معدوم ہوگئی ہیں کہ جو آج سے دس بارہ سال قبل مہیا تھیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ نے رہی سہی کسر پوری کر دی اور اس کے بعد ریلوے اور ہوائی سروس کا رابطہ بھی ختم ہو گیا۔ آج ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان کے لئے ویزا اور پاسپورٹ حاصل کرنا سب سے مشکل، صبر آزما اور پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے اور لاکھوں کروڑوں لوگوں میں ایسے خوش بخت لوگوں کی تعداد اُنگلیوں پر گنی جاسکتی ہے، کہ جو اس 'شجر ممنوعہ' کے حقدار اور سزاوار قرار

پائے ہیں۔ عام طور پر پاسپورٹ اور ویزا کی درخواست کرنے والوں کو عادی مجرموں اور پیشہ وروں جاسوسوں کی طرح شک وشبہ کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور ان کے چال چلن، گردوپیش، عادات واطوار اور ماضی وحال کے بارے میں اتنی تحقیقات کی جاتی ہے، کہ درخواست دہندہ اپنی حماقت پر پشیماں ہونے لگتا ہے کہ بیٹھے بٹھائے کس مصیبت کو دعوت دی مسئلے کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ تخریب کار، جاسوس، سمگلر اور دوسرے مشکوک کردار کے لوگ کبھی پاسپورٹ اور دنیا کی نزاکتوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے، وہ پرندوں کی طرح ایک ملک سے دوسرے ملک میں پرواز کرتے رہتے ہیں اور عام طور پر ان سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کرتا۔

دونوں ملکوں کے درمیان آمدورفت پر کچھ جائز اور مسلمہ پابندیاں عائد کرنے میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے لیکن ان کا تعلق کسی قاعدے اور ضابطے کی بجائے چند افراد کی مرضی اور منشا کے تابع ہو، تو وہ اُلجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ جن کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان آمدورفت کا سلسلہ تقریباً ختم ہو گیا ہے اور مسئلے کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان جانے کے خواہشمند عام سیاح نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جن کے بھائی بند، عزیز واقارب اور دوست احباب تقسیم ملک کی اتھل پتھل میں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے اور جو بیس بائیس برس سے ایک دوسرے سے ملنے کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ ان میں سے 99% لوگ وہ ہیں کہ جو کسی سیاسی جماعت نظرئے یا تحریک سے وابستہ نہیں رہے ہیں؛

جنہیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ مُلک کی تقسیم کیوں ہوئی تھی اور اس کی ذمہ داری کس پر ہے۔ یہ معصوم اور بھولے بھالے لوگ صرف یہ جانتے ہیں، کہ اس تقسیم نے بھائی کو بہن سے، ماں کو بیٹے سے اور شوہر کو اپنی بیوی سے جدا کر دیا ہے اور اس جدائی نے محبت اور مروت کے انسانی رشتے کو ختم کرنے کی بجائے اسے زیادہ شدید اور مستحکم بنا دیا ہے۔ انسانی تعلقات کی اسی معصومیت نے حکمرانوں کی بیدردی اور بے رحمی کو افسوسناک اور المناک بنادیا ہے اور یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ دونوں طرف کی حکومتوں نے اس خالص انسانی مسلے کو توقیر اور تجارت کا مسئلہ بنا کر لاکھوں غم نصیب ماؤں بیٹوں، بھائی بہنوں اور دوست احباب کو ایک دائمی مصیبت میں کیوں کر مُبتلا کر دیا ہے، ملک کی تقسیم نے ہزاروں ایسے زخم دئے ہیں، جو ابھی بہت دنوں تک رستے رہیں گے، لیکن جدائی اور غریب الوطنی کا زخم ذراسی توجہ سے بھر سکتا ہے اور ہم ہندوستان اور پاکستان کے اربابِ اقتدار سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ اگر ان زخموں پر نمک چھڑکنے کی بجائے ان پر اپنی وسعت قلبی، دریادلی اور دور اندیشی کا مرہم رکھیں تو ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے مسائل بہت جلد حل ہو جائیں گے۔

آمدورفت پر بے جا پابندیوں کے اذیت ناک رجحان کا سب سے زیادہ اثر ان بدنصیب کشمیری تارکان وطن پر پڑ رہا ہے کہ جو ۱۹۴۷ء کے بعد کسی وجہ سے اپنے وطن نہ لوٹ سکے۔ ان میں کچھ لوگ اپنے خوابوں کی جنت پانے کے لئے پاکستان چلے گئے، کچھ ایسے بھی ہیں کہ جن کو اس وقت کی حکومت نے اپنے وجود کے لئے خطرہ سمجھ کر ریاست

بدر کر کے پاکستان بھیج دیا۔ کچھ ایسے بھی ہیں کہ جو قبائلی حملے کی زد میں آکر جنگ بندی سرحد کے اُس پار رہ گئے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ تقسیم ملک کے غیر متوقع حادثے سے پہلے کاروبار اور تجارت کے سلسلے میں ان علاقوں میں تھے کہ جو بعد میں پاکستان کا حصہ بن گئے۔ ان میں سے اکثر لوگ اپنے وطن لوٹنا چاہتے تھے لیکن کسی مجبوری کی وجہ سے نہ آسکے۔ کل ملا کر سترہ ہزار ایسے کشمیری، پاکستان اور آزاد کشمیر میں غریب الوطنی ، بے کسی اور بے بسی کے دن گذار رہے ہیں۔ ان لوگوں کے تئیں مرکزی حکومت کا رویہ اتنا سخت اور بے رحمانہ ہے، کہ انہیں مستقل طور لوٹنے کی اجازت تو کجا، عارضی طور پر اپنے عزیز واقارب سے ملنے کی اجازت بھی نہیں دی جاتی۔ ان بدنصیب بھائیوں کی مصیبت اور وطن لوٹ آنے کی بے پناہ خواہش کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ پاکستان میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر یہاں آنے کیلئے بے قرار ہیں۔ قریشی محمد یوسف، غلام نبی گلکار، عبدالسلام یتو، ایم۔ اے صابر، میر مقبول گیلانی، میر عبدالعزیز اور دوسرے سرکردہ کشمیریوں کے علاوہ ہزاروں تارکانِ وطن اپنے وطن کو صرف ایک نظر دیکھنے کے لئے مضطرب اور بے قرار ہیں۔ یہ سب لوگ آج بیس برس سے ہندوستان کی حکومت سے رجوع کئے ہوئے ہیں کہ انہیں اگر مستقل طور اپنے گھر لوٹنے کی اجازت نہیں مل سکتی، تو اپنے گھر کے درودیوار کو ایک بار، صرف ایک بار، دیکھنے کی سہولت بہم پہنچائی جائے۔ لیکن ان کی آواز مرکزی حکومت کے بہرے کانوں سے ٹکرا ٹکرا کر صدا بصحرا ثابت ہوئی ہے۔ اس شمارے میں میر عبدالعزیز ایڈیٹر 'انصاف' کا وزیر اعظم کے نام

ایک خط شائع ہو رہا ہے کہ جس میں انہوں نے اپنے مرحوم باپ کی فاتحہ پڑھنے کے لئے کشمیر آنے کی اجازت طلب کی ہے، لیکن چوہدری محمد شفیع جیسے پکے کانگریسی کو اپنے بھائی کے جنازے میں شامل ہونے کی اجازت نہ دینے والی وزیر اعظم، میر عبدالعزیز جیسے ''خطرناک'' کشمیری کو سرینگر آنے کی اجازت دیں گی اسکی کوئی توقع نہیں۔ اسی طرح سے قریشی محمد یوسف، عبدالسلام ایتو، غلام نبی گلکار اور میر مقبول گیلانی ریاستی حکومت اور مرکزی حکومت سے کئی بار یہ درخواست کر چکے ہیں کہ وہ اب ضعیف العمر ہو چکے ہیں اور مرنے سے پہلے ایک بار اپنے آباد واجداد کی سرزمین کو سلام، آخری سلام کرنا چاہتے ہیں لیکن اس معصوم انسانی خواہش کا احترام کرنے والے، معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا سے اٹھ گئے ہیں۔ ادھر تارکانِ وطن کی جائداد پر کچھ بے مروت اور بے حیا لوگ قابض ہوئے ہیں کہ جو اس جائداد کو اپنے پاس ایک مقدس امانت سمجھنے کی بجائے مال غنیمت سمجھ کر اس کا استحصال کر رہے ہیں یہ لوگ دن رات یہ دعائیں مانگتے رہتے ہیں کہ پاکستان اور آزاد کشمیر میں پھنسے ہوئے وہ بدنصیب کبھی اپنے وطن نہ لوٹ سکیں کہ جن کی جائدادیں ان کے تصرف میں ہیں۔

اس قسم کے بہت سے بدقماش لوگوں نے اپنے بھائی بندوں کے خلاف بے بنیاد اور شر انگیز بہتان تراش کر انکے وطن لوٹنے کی راہ میں بہت سی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ محکمہ جائداد مہاجرین کے اکثر افسروں نے جائداد متروکہ کی حفاظت اور دیکھ بھال کرنے کی بجائے اسے اپنی تجارت اور منفعت کا ایک ذریعہ بنا دیا ہے اور اس طرح بدنیت رشتہ

داروں اور بدکردار افسروں کی سازش سے جائداد مہاجرین کا اکثر حصہ تباہ و برباد ہو گیا ہے یا غلط آدمیوں کی تحویل میں چلا گیا ہے۔ پاسپورٹ اور ویزا کے سلسلے میں مرکزی حکومت کی سخت گیر پالیسی نے ان خائنوں کے حوصلے اور بلند کر دئے ہیں اور وہ جائداد متروکہ کا ستیاناس کر رہے ہیں۔ وہ مرکزی حکومت اور ریاستی حکومت دونوں ہی کے مشکور ہیں کہ انکی مشترکہ مساعی سے تارکان وطن کو عارضی طور پر بھی اپنے گھر لوٹنے کی اجازت حاصل نہیں!

قطع نظر اس کے کہ مہاجروں کو اپنے وطن لوٹنے یا عارضی طور پر یہاں آنے کی اجازت دینے کا مسئلہ ایک خالص انسانی مسئلہ ہے، اس مسئلے کا ایک اہم سیاسی پہلو بھی ہے۔ جیسا کہ ہم نے ابھی کہا ہے، کہ تارکان وطن میں اچھی خاصی تعداد ان لوگوں کی بھی ہے کہ جو کسی خیالی جنت کی تلاش میں پاکستان کی طرف بھٹک گئے تھے۔ ان میں سے اکثر لوگ جنت کی حقیقت سے واقف ہوکر اب اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کو وطن لوٹنے کی اجازت دیکر ان بہت لوگوں کی غلط فہمی دو ہو سکتی ہے کہ جو آج چوبیس برس بعد بھی اس جنت کی ہوس میں بیٹھے ہیں کہ جس کی حقیقت نے بہت سے ہوشمندوں کے ہوش ٹھکانے لگا دئے ہیں۔ اسطرح بہت لوگ گھر بیٹھے ان تجربات سے استفادہ کر سکتے تھے کہ جن کو حاصل کرنے کے لئے ان بدنصیبوں کو پردیس کی خاک چھاننا پڑی۔

مسئلے کا ایک آئینی پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر ہم پوری ریاست کو ہندوستان کا حصہ سمجھتے ہیں، تو ریاست کے ایک حصے میں رہنے

والے لوگوں کو اپنے گھر لوٹنے کی اجازت نہ دینا یا عارضی طور پر بھی انہیں گھر آنے کی سعادت سے محروم کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہمیں خود بھی اپنے دعویٰ پر اعتبار نہیں!۔ اخلاقی نکتہ نظر سے ان لوگوں کو واپس لانا بھی ہمارے لئے ضروری ہے کہ جنہیں ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیان یا اسکے بعد ریاستی حکومتوں نے ان کی مرضی کے خلاف ریاست بدر کر کے پاکستان بھیجدیا ہے۔ مہذب دنیا میں اس قسم کی جلاوطنی کی مثالیں ۱۹۴۵ء کے بعد شاذونادر ہی ملیں گی۔ ہاں ہٹلر کے دور میں اہل وطن کو بے وطن کرنے کا چلن ہٹلر کی حکمت عملی کا حصہ تھا اور ہمیں یقین ہے کہ مرکزی اور ریاستی حکومت اپنے آپ کو ہٹلر کا جانشین کہنے میں فخر محسوس نہیں کرے گی۔

۲/اگست ۱۹۷۱ء

محکمہ سُراغ رسانی یا متوازی حکومت؟

کشمیر کی موجودہ سیاسی پیچیدگیوں اور بے اطمینانی کو سمجھنے کے لئے ماضی قریب ہی نہیں، ماضی بعید کے کچھ اہم واقعات کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا اور جن لوگوں نے ابھی تک مرکزی محکمہ سراغ رسانی کے سابق سربراہ مسٹر بی، این ملک کی کتاب نہرو کے ساتھ چند سال.. کشمیر' نہیں پڑھی ہے۔ انہیں میں مشورہ دوں گا کہ وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔ یہ کتاب بہت سے سوالات کا جواب مہیا کرتی ہے اور کسی حد تک کشمیر کی موجودہ الجھنوں کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ مسٹر ملک نے خودستائی اور خودنمائی کے جوش میں کچھ اہم واقعات سے پردہ اٹھانے کے علاوہ غیر ارادی طور پر اس اندازِ فکر کو بھی بے نقاب کردیا ہے کہ جس نے جواہرلال نہرو جیسے عظیم المرتبت رہنما کو بھی کشمیر کے معاملے میں گناہگار، خطاکار اور سزاوار ثابت کردیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ۱۹۴۹ء میں پاکستان سے جنگ بندی کے فوراً ہی بعد مرکزی حکومت نے کشمیر کو محکمہ سراغ رسانی کی تحویل میں دے دیا اور مرکز اور ریاست کے درمیان تعلقات اور

رابطے کا سب سے معتبر ذریعہ محکمۂ سراغرسانی کے افسر ہی قرار پائے، ۱۹۴۹ء میں جبکہ پاکستان نے شیخ محمد عبداللہ کے سر کی قیمت مقرر کر رکھی تھی، ہندوستان کے وزیر داخلہ سردار پٹیل کو شیخ صاحب کی نیت پر شک تھا اور انہوں نے مرکزی محکمہ سراغرسانی کو ہدایت کی تھی کہ وہ ان پر کڑی نگاہ رکھیں۔ بدقسمتی سے ''کڑی نگاہ'' رکھنے والے یہ افسر مسٹر ملک جیسے تنگ نظر، ناعاقبت اندیش اور خودغرض انسان تھے اور ان کی نگاہوں میں ہر خود دار، قوم پرست اور باضمیر کشمیری ہندوستان کی سالمیت کے لئے خطرناک قرار پایا، اس طرح کشمیری قومیت اور ہندوستانی قوم پرستی کے درمیان ہمنوائی اور ہم آہنگی کی بجائے تصادم کی وہ فضا پیدا ہوگئی کہ جس میں ۱۹۵۳ء کا شب خون ناگزیر بن گیا۔ یہ بات دلچسپ بھی ہے اور قابلِ غور بھی کہ شیخ محمد عبداللہ اور مرکز کے درمیان پہلی ''ناچاقی'' مرکزی محکمہ سراغرسانی کے ایک افسر کے تقرر کے سلسلے میں ہوئی اور شروع میں اگرچہ شیخ صاحب جواہرلال نہرو کی مداخلت سے محکمہ سراغرسانی کی بڑھتی ہوئی ریشہ دوانیوں کو روکنے میں کسی حد تک کامیاب ہوگئے لیکن بالآخر سراغرسانی کے محکمے نے اپنی طاقت اور اہمیت کو منوا کر ہی دم لیا اور کشمیر کے مسائل کے متعلق ہندوستانی رہنماؤں اور مرکزی سراغرسانی کے افسروں کی سوچ میں حیرت انگیز مماثلت پائی جانے لگی۔ مسٹر ملک اور دوسرے افسروں نے بخشی صاحب اور ان کے دوسرے ساتھیوں سے براہ راست تعلقات پیدا کر کے مرکزی لیڈروں کو شیخ عبداللہ کی ''خطرناک'' اور ''قابل اعتراض'' سرگرمیوں کی خفیہ رپورٹیں بھیجنا شروع کر دیں۔ بخشی صاحب کھلانے پلانے والے آدمی

تھے اور مسٹر ملک اور اس قبیل کے دوسرے افسر کھانے پینے والے لوگ، اس لئے دونوں کی بہت اچھی طرح نبھنے لگی، پھر جواہر لال نہرو، سردار پٹیل اور رفیع قدوائی کشمیر کو مسٹر ملک اور محکمہ سراغرسانی کے دوسرے افسروں کی نگاہوں سے ہی دیکھنے لگے اور انہیں وہی کچھ نظر آنے لگا جو مسٹر ملک اور ان کے ساتھی انہیں دکھانا چاہتے تھے۔ شیخ عبداللہ مغرور ہونے کی حد تک خود دار اور بے حد جذباتی واقع ہوئے ہیں۔ انہیں اپنی حب الوطنی، قوم پرستی اور جواہر لال نہرو سے اپنی دوستی پر اس درجہ ناز تھا کہ انہوں نے محکمہ سراغرسانی کے ''ملکوں'' کو خاطر میں ہی نہ لایا۔ ان کی عزت نفس نے انہیں کبھی مرکزی سرکار کے ان ملازموں سے ذاتی رابطہ قائم کرنے کی اجازت ہی نہیں دی اور انہیں اس بے نیازی اور عدم توجہی کی بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑی!

۱۹۵۳ء میں شیخ صاحب کی گرفتاری پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر بی۔ این ملک یوں اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔ ''شیخ عبداللہ کے راستے سے ہٹ جانے کے بعد ہماری ساری دشواریاں ختم ہوگئی تھیں۔ بخشی صاحب اور ڈی، پی صاحب سے ہمارے تعلقات پہلے ہی استوار تھے، اس لئے اب ہم زیادہ اپنے کام میں لگ گئے۔'' ۱۹۵۳ء کے بعد یہ کام زیادہ وسیع اور مختلف المقاصد ہو گیا ہے اور اب کشمیر کے معاملات میں مرکزی محکمہ سراغرسانی کو وہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے کہ جو پہلے کبھی نہ تھی۔ اس کی تنظیم، اس کے دائرہ کار اور اس کے اختیارات اتنے وسیع ہو گئے ہیں کہ اسے باقاعدہ متوازی حکومت کہنا غلط نہ ہو گا۔ مرکزی لیڈروں کی غلط کاریوں اور مقامی رہنماؤں کی خود غرضیوں سے جو مسائل اور الجھنیں

پیدا ہوگئی ہیں، ان کو سیاسی سطح پر حل کرنے کی بجائے ناجائز، زمیندوز اور نفرت انگیز طریقوں سے نپٹانے کی کوشش کی جارہی ہے اور لوگوں کے ذہن بدلنے کی بجائے ان کے ضمیر خریدے جا رہے ہیں۔ نوجوانوں، سیاسی کارکنوں، لیڈروں صحافیوں اور طالب علموں کو ''کورپٹ'' کرنے کے لئے لاکھوں روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے اور یہ سب کچھ اس امید پر کہ یہ لوگ سیاسی بے اطمینانی، ذہنی نا آسودگی اور جذباتی ناہمواری کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے میں کامیاب ہوسکیں گے۔ گزشتہ بیس سال کے تجربے سے سبق حاصل کرنے کی بجائے مرکزی محکمہ سراغرسانی کے ماہر اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ شراب، دولت اور اسی نوعیت کی دوسری ترغیبات کے سہارے ایک پوری نسل کی زبان، ذہن اور ضمیر خرید سکیں گے اور یہی وجہ ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں محکمہ سراغرسانی کی سرگرمیوں میں کمی کی بجائے روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ عام لوگوں کی اقتصادی بدحالی، سیاسی لیڈروں کے حرص، تھکے ہوئے سیاسی کارکنوں کی درماندگی، صحافیوں کی سرمایہ پرستی اور نوجوانوں کی کمزوریاں محکمہ سراغرسانی کے کام کو آسان بنا رہی ہیں اور بہت سے عزت مآب رہنما، بڑے بڑے پارسا، پاک دامن، شہری اور معزز صحافی باقاعدہ محکمے سے تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ ان میں محل بے محل اٹوٹ انگ کا نعرہ بلند کرنے والے بھی شامل ہیں اور وقتاً فوقتاً 'لیڈر ہمارا ایحیٰ خان ہم کیا چاہتے پاکستان کی آوازیں بلند کرنے والے بھی۔ یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ بہت سے انتہا پسند اور جوشیلے پاکستان نواز بوڑھوں اور نوجوانوں کو مرکزی محکمہ سراغرسانی کی حفاظت، حمایت اور

اعانت حاصل ہے اور انہیں صرف اس لئے زندہ رکھا جارہا ہے کہ وہ شیخ محمد عبداللہ کی اہمیت، مقبولیت اور ان کے اثر ورسوخ کو کم کرنے کا ایک ذریعہ ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح بعض اوقات گمنام اور مشکوک کردار کے سیاسی چنڈالوں سے الحاق کو حتمی قرار دلوا کر شیخ محمد عبداللہ کو گالیاں دلوائی جاتی ہیں اور بزعم خود محکمے کے افسران یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ہندوستان کی بہت بڑی خدمت انجام دی۔ وہ اپنی ان سرگرمیوں سے مرکزی سرکار کو یہ اطمینان دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کشمیر میں علیٰحدگی پسندوں کا اثر بھی ختم ہو گیا ہے اور شیخ محمد عبداللہ کا قد بھی گھٹ گیا ہے اور چوں کہ اس محکمے کے اخراجات کا کوئی حساب وکتاب نہیں، اس لئے ہزار کی جگہ لاکھ کا خرچہ دکھانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ محکمہ سراغرسانی اور ریاستی حکومت کے درمیان کوئی رابطہ یا تال میل ضروری نہیں سمجھا جاتا اور محکمے کے اعلیٰ وادنیٰ سبھی افسر اس خبط میں مبتلا ہیں کہ وہ بجائے خود ایک حکومت ہیں۔ میرے سامنے بہت سی ایسی مثالیں ہیں کہ جہاں آئی، بی کے افسروں نے ریاست کے اعلیٰ سے اعلیٰ افسروں کی رائے کو نظر انداز کر کے وہی کچھ کیا کہ جو ان کے من میں آیا۔ میں اگر کسی راز کا انکشاف نہیں کر رہا ہوں تو مجھے یہی کہنے کی اجازت دیجئے کہ خود ریاست کے وزیر اعلیٰ اور ان کے دوسرے ساتھی بھی آئی، بی کی کڑی نگاہ اور نگرانی کے مرکز ہیں اور اس میں تو کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ سابق وزیر اعلیٰ مرحوم غلام محمد صادق اور محکمہ سراغرسانی کے تعلقات بہت خوشگوار نہ تھے اور آئی، بی کے اکثر افسران صادق صاحب کے مخالفوں کی پیٹھ ٹھونکا کرتے

تھے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ موجودہ وزیر اعلیٰ سید میر قاسم کو اس بات کا علم اور احساس ہے یا نہیں کہ ان کی حب الوطنی، قوم پرستی، الحاق نوازی اور ان کا سیکولرازم اس وقت تک قابل اعتبار ہے کہ جب تک اس پر مرکزی محکمہ سراغرسانی کی مہر ثبت ہے اور اگر خدانخواستہ سراغرسانی کے آفسروں کو ان پر اعتبار اور اعتقاد اٹھ گیا تو وہ شیخ عبداللہ کی ہی طرح معتوب اور مطعون قرار پائیں گے۔ صادق مرحوم نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ ریاستی کابینہ کے ایک سابق وزیر کو بہت دنوں تک مرکزی محکمہ سراغرسانی سے بھی مشاہرہ ملتا رہا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ قاسم صاحب کے ارد گرد ایسے لوگ نہ ہوں گے کہ جو ان سے زیادہ محکمہ سراغرسانی کے وفادار ہوں۔

ریاست کی سیاست اور انتظامیہ میں مرکزی محکمہ سراغرسانی کے بڑھتے ہوئے اثر رسوخ اور پھیلتی ہوئی سرگرمیوں سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی حکومت نے اس ریاست میں سیاسی اصولوں اور آدرشوں کی لڑائی ہار کر اسے صرف جغرافیائی سالمیت کی جنگ بنا دیا ہے اور اس جنگ میں چوں کہ عوام سے زیادہ فوجی اور جاسوسی عملے کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے، اس لئے مرکزی محکمہ سراغرسانی کو غیر معمولی اہمیت دی جارہی ہے اور اسے ریاستی عوام پر ہی نہیں ریاستی حکومت پر بھی نوقیت حاصل ہے۔ یہ صورتحال تشویشناک ہی نہیں، خطرناک بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے ملک کی موجودہ قیادت کی نااہلیت اور ناعاقبت اندیشی ظاہر ہوتی ہے۔ محکمہ سراغرسانی کی کامیابیاں اور فتوحات کسی حالت میں بھی ایک صحت مند انتظامیہ اور ایک جاندار سیاسی تحریک کا نعم

البدل نہیں ہوسکتیں اور جو لوگ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ آبادی کے ایک حقیر سے حصے کو خرید کر وہ دلوں اور ذہنوں کو بدل سکتے ہیں وہ یقناً احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ محکمہ سراغرسانی جن ''باعزت'' معتبر اور محترم لوگوں کو خریدنے پر لاکھوں روپیہ صرف کر رہا ہے ان کی مفروضہ ساکھ اسی دن ختم ہو جاتی ہے کہ جس دن ان کی قیمت طے پاتی ہے اور سرینگر ایک ایسی جگہ ہے کہ جہاں دنیا کا کوئی راز 'راز نہیں رہ سکتا۔ آج سے ٹھیک چودہ ماہ قبل کی بات ہے کہ دلی میں ایک نجی ملاقات کے دوران مرحوم خواجہ غلام محمد صادق نے مجھے اس راز سے آشنا کیا تھا کہ ریاست کے ایک سرکردہ اور سربرآوردہ لیڈر کو محکمہ سراغرسانی سے ہر ماہ بارہ سو روپیہ شاہرہ ملتا ہے اور اس کے بعد بہت سے دوستوں نے اس بات کی تصدیق کی۔ جن نوجوانوں کو محکمے نے خفیہ طور اپنی تحویل میں لے رکھا ہے، ان کے بارے میں یہ بات زبان زدِ عام ہے کہ وہ محکمہ سراغرسانی کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں۔ آج سے چندہ ماہ قبل دلی میں مقیم ایک غیر ملکی اخبار کے نمائندے نے سرینگر کے کافی ہوس میں مجھ سے یہ پوچھا تھا کہ میں کشمیر کے کچھ باغی نوجوان لیڈروں سے ملنا چاہتا ہوں، کہاں مل سکتا ہوں۔

''محکمہ سراغرسانی کے دفتر پر'' میں نے جواب دیا تھا۔ اس نے میری بات کا اعتبار نہیں کیا۔ لیکن ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے بہت سے مقامی دوستوں نے مجھ سے اتفاق کیا۔

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جتنا روپیہ مرکزی حکومت سراغرسانی اور جاسوسی کے محکموں پر خرچ کرتا ہے، اس کا نصف حصہ بھی

نوجوانوں میں جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرازم کی صحیح تبلیغ کرنے پر خرچ کیا جاتا، تو گزشتہ بیس سالوں میں ہم نے اصولوں اور آدرشوں کی جنگ بھی جیتی ہوتی اور ملک کی وحدت اور سالمیت کو ہر خطرے سے محفوظ کر دیا ہوتا۔ جیبوں کو سکوں کے وزن سے بوجھل کر دینے کی بجائے ذہنوں میں فکر اور سوچ کے بیج بونا زیادہ دیرپا اور دوررس نتائج کا حامل ہو سکتا ہے اور مجھے امید ہے کہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کشمیر میں ''خرید و فروخت'' کی سامراجی روش کو ترک کر کے نوجوانوں کے دل اور ذہن بدلنے کی طرف متوجہ ہوں گی اور اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ مرکزی محکمہ سراغرسانی کو متوازی حکومت کا درجہ دینے کی بجائے اسے صرف خاص مقاصد کے لئے محدود کیا جائے۔

۷ جولائی ۱۹۷۲ء

عہد آفرین سمجھوتہ

شملہ کانفرنس سے کسی کو معجزوں کی توقع نہیں تھی لیکن اس کے باوجود معجزہ ہو گیا۔ عین اس وقت کہ جب اختلافات کی چٹانوں سے ٹکرا کر امیدوں اور آرزوں کا سفینہ ڈوبنے ہی والا تھا، مسز گاندھی اور مسٹر بھٹو نے غیر معمولی سیاسی تدبر اور عالی ظرفی کا ثبوت دے کر مفاہمت اور مصالحت کا وہ چراغ روشن کر دیا کہ جس نے بجھے ہوئے دلوں میں ایک بار پھر زندگی کی حرارت پیدا کر دی اور ڈوبتا ہوا سفینہ ڈوبنے سے بچ گیا۔ شملہ میں ہندوستان اور پاکستان کے لیڈروں کی بات چیت جس پسِ منظر میں ہو رہی تھی، اس کے پیش نظر کوئی اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا کہ اس بات چیت سے کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد ہو گا۔ لیکن خلوصِ نیت اور سعئی پیہم، نفرت، دشمنی اور باہمی تشکیک کی خلیجوں کو پاٹ کر مفاہمت کے نئے پُل تعمیر کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور دونوں ملکوں کے درمیان ایک ایسا معاہدہ طے پایا ہے کہ جس سے صرف مسز گاندھی اور مسٹر بھٹو کا ہی نہیں، برصغیر کے ۷۰ کروڑ عوام کا وقار بلند ہو گیا ہے۔ ۲۵ برس کی خوں ریزی، مخاصمت، باہمی نفرت اور عداوت کے بعد شملہ کی بلندیوں سے انسانیت، شرافت اور باہمی محبت کی ایک نئی

فصل نے جنم لیا ہے۔ اس خوش کُن اور خوشگوار خبر پر جتنی بھی مسرت کا اظہار کیا جائے کم ہے اور اس کے لئے مسز اندرا گاندھی اور مسٹر بھٹو دونوں ہی ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان مخاصمت کی اصل بنیاد کشمیر پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکا ہے اور آخری مرحلے پر اسی مسئلے نے کانفرنس کو ناکامی اور نامرادی کے بالکل قریب کر دیا تھا۔ لیکن مسز گاندھی اور مسٹر بھٹو کی سیاسی بصیرت آڑے آئی اور کشمیر کے مسئلے کو آئیندہ کے لئے اٹھا کر بعض اہم مسائل پر ایک باعزت اور با مقصد سمجھوتہ ہو گیا۔ سفارتی تعلقات کی بحالی، باہمی تنازعات کو سلجھانے میں طاقت کے استعمال کو ترک کرنا، ثقافتی اور تجارتی تبادلے کے امکانات کا جائزہ لے کر آمدورفت کو آسان بنانے کا ارادہ، ایک دوسرے کی علاقائی سالمیت کا احترام کر کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے گریز اور متنازعہ مسائل کو حل کرنے کے لئے باہمی گفت وشنید کو جاری رکھنے کا عزم، یہ سب ایسی باتیں ہیں کہ ان کی سیاسی اہمیت اور افادیت کا صحیح اندازہ کرنے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ لیکن سب سے اہم یہ بات یہ ہے کہ دونوں ملکوں کے عوام میں پائدار امن اور دوستی کی خواہش جھوٹے غرور اور باہمی تشکیک پر غالب آ گئی ہے اور مسز گاندھی اور بھٹو نے ثابت کر دیا کہ برصغیر کے عوام میں تاریخ سے سبق لینے کی صلاحیت بالکل ختم نہیں ہوئی ہے۔ شملہ کانفرنس میں ہندوستان اور پاکستان کے تاریخی سمجھوتے کی یہی شان نزول ہے۔ ۲۵ برس تک نفرت اور عداوت کا کاروبار کرنے کے بعد دونوں ملکوں کے عوام کو اس بات کا احساس اور اندازہ ہو گیا ہے

کہ اس آگ نے ایک پوری نسل کے ارمانوں کو جلا کر راکھ کر دیا ہے۔
جو وسائل اور ذرائع انسانوں کے معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے استعمال ہو سکتے تھے، انہیں انسانیت اور انسانوں کو مجروح کرنے کیلئے استعمال کیا گیا۔ جس دولت سے دریاؤں کے رُخ موڑے جا سکتے تھے، اسی دولت سے خون کے دریا بہائے گئے اور جس محنت سے بنجر زمینوں میں فصلیں اگائی جا سکتی تھیں، وہ محنت ایک دوسرے کو تباہ کرنے میں صرف ہوئی۔ اس طرح آزادی کے ۲۵ سال تباہی اور بربادی کی نئی نئی فصلیں اگانے میں ضائع ہو گئے۔ اس تلخ حقیقت کا احساس اور ادراک یقیناً شملہ کانفرنس کی کامیابی کی اساس بن گیا اور ۳ جولائی کی صبح کو ساری دنیا نے یہ مژدہ جانفزا سنا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مفاہمت مصالحت اور تعاون کا ایک نیا دور شروع ہونے والا ہے۔ ڈوبتی نبضیں، اکھڑی سانسیں، اور ٹوٹے ہوئے خواب، ایک بار پھر سنبھلے اور امیدوں کا قافلہ ایک نئے سفر پر روانہ ہوا۔ اس غیر متوقع اور غیر معمولی کامیابی نے جہاں برصغیر کے کروڑوں عوام کے دل امید اور مسرت کی روشنی سے بھر دیئے ہیں، وہاں نفرت اور عداوت کی ہڈیوں پر پلنے والے کچھ کُتے اس تاریخی سمجھوتے سے بدحواس ہو گئے ہیں اور انہوں نے اس عہد آفریں اور تاریخ ساز سمجھوتے کے خلاف بھونکنا شروع کر دیا ہے۔
ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی ممالک میں ان کتوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے کہ جن کے لئے مصالحت، محبت اور شفقت کے الفاظ موت کا پیغام رکھتے ہیں اور جب کبھی دونوں ملکوں میں ایسی فضا قائم ہونے کا امکان پیدا ہوتا ہے کہ جس میں نفرت کی بجائے محبت کی فرماں

روائی ہو، تو یہ کُتے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھاتے ہیں اور شملہ کانفرنس کا سمجھوتہ یقیناً ایک ایسا باعزت، باوقار اور بامقصد تاریخی کارنامہ ہے کہ اس سے نفرت کا کاروبار کرنے والے مفادِ خصوصی کو گہری چوٹ پہونچنے کا زبردست امکان ہے۔ اس لئے ان کی طرف سے اس کی غلط تاویلیں اور تعبیریں کرنے کا سلسلہ روز بروز بڑھتا جائے گا۔ اگر چہ دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان امن، دوستی اور بھائی چارے کا جذبہ اتنا شدید ہے کہ کتوں کے بھونکنے کے باوجود صلح و آشتی کا کارواں آگے بڑھتا جائے گا۔ تاہم دونوں ملکوں کے دانشوروں، فنکاروں اور مخلص سیاسی کارکنوں کا فرض ہے کہ وہ ان شرپسندوں کے خلاف منظّم ہو کر ان کا ہر سطح پر مقابلہ کریں۔ ہندوستان میں جن سنگھ اور پاکستان میں جماعت اسلامی کی فسطائی قوتیں خاص طور پر اس عہد آفریں سمجھوتے سے پریشان ہوں گی اور برصغیر کی ترقی پسند قوتوں کو ان کی ریشہ دوانیوں سے خبردار رہنا چاہیئے۔

یہ انتہائی خوشی کی بات ہے کہ کشمیر کا مسئلہ پہلی بار دو ملکوں کے درمیان دائمی امن اور تعاون کے سلسلے میں دیوار بن کر حائل نہیں ہوا اور سمجھوتے کی رو سے اس مسئلے کے حتمی حل کے لئے بات چیت کا سلسلہ جاری رہے گا۔ توقع ہے کہ ذاتی، ثقافتی اور سفارتی تعلقات کی بحالی کے بعد دونوں ملکوں کو اس بات کا اندازہ ہوجائے گا کہ کشمیر اپنی تمام ترخوبصورتی اور جغرافیائی اہمیت کے باوجود ہندوستان اور پاکستان کے ۷۰ کروڑ عوام کی سچی دوستی سے زیادہ بیش قیمت نہیں اور اسے وقار کا مسئلہ بنا کر اس تاریخی موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیئے کہ جس نے

خوشگوار مستقبل اور پائدار امن کے لامحدود امکانات اجاگر کیۓ ہیں۔
ہمیں یقین ہے کہ جب ہندوستان اور پاکستان کے عوام ایک دوسرے کے قریب آ کر دوستی اور محبت کے رشتے میں بندھ جائیں گے، تو کشمیر کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ اس وقت دونوں ہی ممالک اسے اپنے جھوٹے وقار کا سوال بنائے ہوئے ہیں۔ ایک بار جب تصادم Confrontation کا احساس ختم ہو جائے گا تو پھر اشتراک اور تعاون کا احساس غالب رہے گا۔ نئے سمجھوتے کی رو سے سفارتی نمائندوں کے علاوہ ثقافتی وفود اور صحافتی نمائندوں کا بھی تبادلہ ہوگا اور آمدورفت کی پابندیوں کو نرم کرنے کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔ یہ ہمارے خیال میں سمجھوتے کا سب سے اہم اور مفید جز ہے اور اس سے یقیناً بہتر اور خوشگوار تعلقات قائم ہونے میں مدد ملے گی۔ دونوں ملکوں کے درمیان صرف سیاسی لیڈروں کی سطح پر ہی مکالمہ بہتر تعلقات کی ضمانت نہیں ہوسکتا۔ یہ مکالمہ عوامی سطح پر جاری رہنا چاہیئے تاکہ عوام کو اپنے مشترک مسائل اور وسائل کا اندازہ ہو۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ دونوں ممالک کے لیڈر صدقدلی کے ساتھ اس سمجھوتے پر عمل درآمد کر کے پچیس برس کے زخموں پر مرہم رکھنے کی سعی کریں گے، تاکہ ان کروڑوں خانماں برباد لوگوں کو امن، سکون اور اطمینان کا سانس نصیب ہو سکے کہ جن کے گھر نفرت اور تعصب کی آگ میں جل کر خاک ہوئے ہیں۔

شملہ کانفرنس کی کامیابی کا سہرا مسز گاندھی اور مسٹر بھٹو دونوں ہی کے سر رہے گا لیکن وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کانفرنس کی کامیابی کیلئے خصوصی طور پر تعریف اور توصیف کی مستحق ہیں۔ کانفرنس کا انعقاد بھی ان

ہی کے ایماء پر ہوا اور اس کی کامیابی میں انہوں نے بے پناہ سیاسی تدّبر، عالی ظرفی اور دوراندیشی کا ثبوت دیا۔ مسٹر بھٹو جنگ ہار چکے تھے اور ان کے لئے رعائتیں دینا ممکن نہ تھا۔ مسز گاندھی فاتح تھی اور وہ وسعت قلبی کا مظاہرہ کرسکتی تھیں اور یہ قابل اعتراف بات ہے کہ انہوں نے مسٹر بھٹو کی مشکلات کو مدنظر رکھے ہوئے وسعت قلبی اور عالی ظرفی کا مظاہرہ کیا۔ جنگ کے میدان میں شجاعت کا مظاہرہ قابل دادِ ضرور ہے لیکن صلح کی میز پر وسعت قلبی اور دریادِلی میدانِ جنگ کی شجاعت سے بھی زیادہ حوصلہ اور جرأت چاہتی ہے اور مسز گاندھی نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ان میں اخلاقی جرأت اور عالی حوصلگی دونوں ہی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ دائمی امن کی تلاش اور پاکستان سے دوستی کو مستحکم بنانے کی اس جدوجہد میں ہم سب کو ان کے ہاتھ مظبوط کرنا چاہئیں۔

۱۵/ جنوری ۱۹۷۳ء

مذاکرات... پسِ منظر اور پیش رفت

گذشتہ سال مئی کے دوسرے ہفتے میں وزیر اعظم اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان بات چیت کا جو سلسلہ شروع ہو تھا، وہ جس سُست رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اس کے پیش نظر ان مذاکرات سے کسی فوری یا ڈرامائی نتائج کی توقع رکھنا غلط ہوگا، لیکن گفت وشنید کا یہ سلسلہ جاری ہے، یہ بات بجائے خود بڑی حوصلہ افزا ہے۔ گزشتہ بیس بلکہ چھبیس برسوں سے کشمیری رہنماؤں اور مرکزی لیڈروں کے درمیان بدظنی، بے اعتمادی، باہمی تشکیک اور بیزاری کی اتنی اونچی دیواریں حائل ہوگئی ہیں کہ ایک دوسرے کے نکتہ نظر کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ان دیواروں کو ڈھا دینا ضروری ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ دونوں جانب سے یہ پہلا قدم اٹھانے کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کیا جارہا ہے اور اس مقصد کے لئے مرزا محمّد افضل بیگ اور مسٹر پارتھا سارتھی کے درمیان مذاکرات جاری ہیں۔

مارچ ۱۹۷۱ء میں سرینگر کے پارلیمانی حلقہ انتخاب سے منتخب ہو کر جب میں پہلی بار وزیر اعظم سے ملا تھا، تو میں نے انہیں شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ بامقصد بات چیت کا آغاز کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری تجویز کا خیر مقدم کرتے ہوئے مسز اندرا گاندھی نے یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ شیخ صاحب چاہتے کیا ہیں؟ انہوں نے زیر لب یہ شکایت بھی کی تھی کہ شیخ صاحب بیک وقت اتنی

متضاد باتیں کہتے ہیں کہ اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ دراصل ان کے من میں کیا ہے؟ تقریباً یہی بات مسز گاندھی کے علاوہ بھی بہت سے ہندوستانی رہنماؤں نے مجھ سے کہی اور یہ بات کہنے والوں میں شیخ صاحب کے کچھ سچے دوست اور کشمیری عوام کے صحیح بہی خواہ بھی شامل تھے، مسز گاندھی اور دوسرے رہنماؤں کی یہ شکایت بجا تھی یا بے جا، مجھے اس سے بحث نہیں لیکن شیخ صاحب کے مقصد اور موقف کے متعلق یہ عام تاثر یقیناً میرے لئے تکلیف اور تشویش کا باعث بنا۔ یہ بات بنگلہ دیش میں پاکستان کی فوجی کاروائی سے پہلے کی ہے!

بنگلہ دیش میں پاکستانی فوج کی پسپائی اور تحریکِ آزادی کی کامیابی نے جہاں برصغیر میں طاقت کا ایک نیا توازن قائم کیا، وہاں کشمیری عوام اور لیڈروں کے ذہن بھی اس غیر معمولی سیاسی تبدیلی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، ۱۹۷۲ء کے آغاز میں رائے شماری محاذ کے صدر مرزا محمّد افضل بیگ نے دہلی میں ایک اخباری کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ہندوستان سے کشمیر کے الحاق کی حقیقت کو تسلیم کر کے رائے شماری محاذ کا نام بدلنے پر بھی آمادگی ظاہر کی، بیگ صاحب نے الحاق کی مقدار (quantum of accession) کی اصطلاح وضع کر کے اپنے بدلے ہوئے ذہنی رویے کی تشریح اور توجیہہ کی اور یہ دعویٰ کیا کہ مرکز سے ہمارا جھگڑا الحاق کی حقیقت کے متعلق نہیں بلکہ اس کی ''مقدار'' کے سلسلے میں ہے۔

لگ بھگ ان ہی دنوں لنڈن ٹائمز میں شیخ صاحب کا ایک انٹرویو شائع ہوا، جس میں انہوں نے Quantum of Accession کا استعمال کر کے اس بات پر زور دیا تھا، کہ ہندوستان سے ان کا اصل جھگڑا

الحاق کی مقدار ہے، الحاق کی حقیقت نہیں۔ ظاہر ہے کہ شیخ صاحب کا انٹرویو اور بیگ صاحب کا بیان دونوں ہی اس بدلے ہوئے روّیے کی ترجمانی کرتے تھے، کہ جو نئے حقائق کے اعتراف اور ادراک سے پیدا ہوا تھا۔ قطع نظر اس کے کہ دونوں رہنما اس بات پر زور دیتے رہے کہ ان کے موقف میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے، یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ آزادی، حق خودارادیت اور خود مختاری کا خواب، اندرونی خود مختاری کی تعبیر سے مختلف ہے اور میں ذاتی طور اس بات سے خوش ہوں کہ ہمارے رہنما تخیل کی رعنائیوں اور خوابوں کی دنیا سے حقیقت اور اصلیت کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ زندگی ایک مسلسل تجربے کا نام ہے اور تجربات سے سبق حاصل کرنا زندگی میں کامیابی کا پہلا زینہ ہے۔ گزشتہ ۲۶ برسوں کی تاریخ برصغیر میں رونما ہونے والے انقلابات، خوابوں کی شکست وریخت اور تیزی سے بدلتے ہوئے حقائق یہ سب ایسے تجربات Experiences ہیں کہ ان سے آنکھیں موڑنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ اس پس منظر میں اگر شیخ صاحب اور ان کے ساتھیوں نے اپنا آہنگ، اپنا لب ولہجہ اور ڈکشن بدل دیا ہے، تو انہیں اس پر شرمندہ ہونے کی بجائے اس کا کھُل کر اعتراف کرنا چاہیئے۔

جن دوستوں کو یہ شکایت تھی کہ شیخ صاحب کا موقف واضح نہیں یا ان کے من کا بھید کسی پر واضح نہیں، ان کی شکایت اب رفع ہو جانی چاہیئے۔ گزشتہ کئی ماہ کے دوران انہوں نے اپنا مقصد اور موقف بالکل اچھی طرح واضح کر دیا ہے (بلکہ مجھے ان سے یہ شکایت ہے کہ ضرورت سے زیادہ واضح کیا ہے) کہ وہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کو چیلنج

کرنے کی بجائے اسے زیادہ مضبوط اور پائدار بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان کی حکومت نے پچھلے بیس بائیس برسوں میں ان اصولوں اور بنیادوں کو کمزور بلکہ ختم کرنے کی کوشش کی ہے کہ جن پر کشمیر اور ہندوستان کا یہ رشتہ قائم ہو تھا۔ انہیں جائز طور پر یہ شکایت ہے کہ ہندوستان نے اپنے وعدوں اور یقین دہانیوں سے انحراف کر کے ریاست کی اندرونی خودمختاری میں نہ صرف بے جا مداخلت کی ہے بلکہ اسے کلیتاً ختم کرنے کے لئے اقدامات کئے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ کشمیری عوام کے کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کئے بغیر ہندوستان اور کشمیر کے درمیان اخلاص، اقدار، اخلاق اور محبت کا وہ رشتہ قائم نہیں ہوسکتا کہ جس کی خاطر کشمیری عوام نے پاکستان کے خلاف جنگ لڑکر ہندوستان کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ الحاق کی دستاویز کو بنیاد مان کر کشمیر کی وہ خصوصی حیثیت بحال کرنا چاہتے ہیں کہ جس کی رو سے مرکز کو صرف دفاع خارجی امور اور رسل اور رسائل کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ ہندوستان ٹائمز اور امرت بازار پتریکا کی حالیہ اشاعتوں میں انہوں نے اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بات بھی صاف کر دی ہے کہ اندرونی خودمختاری ان کی نگاہوں میں ایک ایک ساکت وجامد نظریہ نہیں بلکہ ایک جان وار، متحرک اور فعال تصور ہے۔ ۱۹۵۳ء کے بعد مرکز نے ریاست پر آئین ہند کی جتنی دفعات اور قوانین لاگو کئے ہیں، ان میں اگرچہ ریاستی عوام کی منشاء اور رضامندی شامل نہیں ہے، تاہم اس بات کا امکان ہے کہ ریاستی عوام اپنی بہتری اور بھلائی کے لئے ان قوانین کو برقرار رکھنا چاہیں گے۔ لیکن

زور زبردستی سے انہیں اپنی اندرونی خودمختاری اور خصوصی حیثیت سے دست بردار ہونے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ بیگ صاحب نے اپنے ۵فروری ۱۹۷۲ء کے بیان اور شیخ صاحب نے اپنے متعدد بیانات میں اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ کشمیر کے معاملے میں پاکستان کوئی فریق نہیں ہے اور یہ کشمیری عوام اور مرکزی لیڈروں کا باہمی مسلہ ہے۔ ان تمام وضاحتوں اور صراحتوں کے بعد بھی اگر کوئی یہ شکایت کرے کہ شیخ صاحب کا مقصد اور موقف واضح نہیں، تو سمجھ لینا چاہیے کہ شکایت کرنے والے کی نیت صاف نہیں۔

اندرونی خود مختاری کا مطالبہ دراصل مرکز اور ریاستوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کو نئے سرے سے ترتیب دینے کا مطالبہ ہے، اور کشمیر کے علاوہ بھی کئی ریاستیں زیادہ سے زیادہ اندرونی خودمختاری کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ کشمیر کے مخصوص سیاسی پس منظر میں اس مطالبے کی اہمیت اور معقولیت کو اب زیادہ دیر تک نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ پچھلے ۲۶۔۲۷ برس میں غالباً پہلی بار کشمیر کی سیاسی الجھن کو حل کرنے کے لئے فضا سازگار ہوئی ہے اور کشمیر کے اندر اور باہر ایک خوشگوار ماحول قائم ہوا ہے۔ شیخ محمد اللہ نے اپنے سارے کارڈ میز پر رکھ کر مسز گاندھی پر ایک بھاری ذمہ داری عائد کی ہے۔ ایسے تاریخی مواقع بار بار نہیں آتے اور میں امید کروں گا کہ وزیر اعظم مفاد خصوصی کی دیوار پھاند کر اس تاریخی تبدیلی کا نہ صرف خیر مقدم کریں گی بلکہ کشمیر اور ہندوستان کے درمیان تعلقات کا ایک نیا باب شروع کرنے میں ہمت اور حوصلے سے کام لیں گی۔ کشمیر ہندوستان کا حصہ بنا رہے، یہ اہم بات ہے اور

اس کے لئے ملک نے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔ لیکن دونوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا ہو اور یہ ملک کی دوسری ریاستوں سے کس درجہ مختلف ہو، یہ اہم نہیں ہے اور کشمیر کو ملک کی وسعتوں میں سمانے کے لئے اگر ملک کے آئین میں ترمیم بھی کرنا پڑے، تو کوئی مضائقہ نہیں۔ آیندہ چند ماہ مسز گاندھی اور شیخ محمد عبداللہ دونوں کی سیاسی بصیرت اور دانش مندی کا معیار پرکھنے کے لئے بہت اہم ثابت ہوں گے۔ شیخ صاحب کے لئے سب سے اہم اور نازک مرحلہ یہ ہوگا کہ وہ کشمیری عوام کی خواہشات اور امنگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش میں جموں کو اپنے ساتھ رکھ سکیں گے یا نہیں؟ انہوں نے ابھی تک جموں پر وہ توجہ صرف نہیں کی ہے جسکا جموں مستحق ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جموں کے بعض حلقوں میں مرکزی لیڈروں سے ان کی مذاکرات نے کچھ بے چینی پیدا کر دی ہے۔ ریاست کی وحدت کو برقرار رکھنا ہو تو جموں کے بغیر کشمیر کے مسئلے کا کوئی مناسب حل ممکن نہیں ہو سکتا۔ مجھے امید ہے کہ شیخ صاحب اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کریں گے!

باوجود اس بات کے کہ شیخ صاحب اور مسز گاندھی کے درمیان بات چیت میں ابھی کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی ہے، دلی، کشمیر اور جموں میں مفادِ خصوصی کے ایک طبقے نے اس نئے ماحول اور نئی فضا کو بگاڑنے کی کوششیں شروع کر دی ہیں کہ جس نے تبادلۂ خیال کی موجودہ شروعات ممکن بنادی ہیں۔ مقامی طور پر پمفلٹ سازی اور مختلف عناصر کی طرف سے بیان بازی ان ہی کوششوں کا حصہ ہیں۔ تمام مخلص اور محبِ وطن لوگوں کو اس سازش سے باخبر رہنا چاہئے۔ ❀❀❀

۸/ جولائی ۱۹۷۳ء

بنیادی حقوق کا فریب

ریاست جموں و کشمیر کو ملک بھر میں یہ امتیاز اور خصوصیت حاصل ہے کہ جتنے کالے اور بیہمانہ قوانین یہاں لاگو ہیں، ملک کے کسی دوسری حصے میں نافذ نہیں ہیں۔ سیاسی مکالموں، نظریاتی مناظروں اور قانونی مباحثوں کی دھول میں اکثر وہ چھوٹی چھوٹی حقیقتیں کھو جاتی ہیں، جو نہ صرف بڑی حقیقتوں کو جنم دیتی ہیں بلکہ بعض اوقات اپنی مخلوق سے بھی زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ کشمیر کو ملک کے آئین میں خصوصی درجہ دینے کے پیچھے جو تحریک اور جذبہ کام کر رہا تھا اس کا مقصد ریاستی عوام کی ان خواہشات اور امنگوں کا احترام اور تحفظ تھا کہ جو نیا کشمیر کی تاریخی دستاویز کے نام سے موسوم تھیں۔ اس آئینی تحفظ کو کس طرح ریاستی عوام کی فکر پر تعزیریں عائد کرنے اور ان کے پاؤں میں زنجیریں پہنانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے، یہ داستان شرمناک بھی ہے اور عبرتناک بھی، اور اس کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ کشمیری عوام کو بنیادی حقوق سے محروم کرنے کی اس سازش میں ہماری جنگ آزادی کے کچھ جیالے فرزند بھی شامل ہیں!

ہندوستان کے ساتھ کشمیر کی آئینی تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں کہ آئین ہند کی دفعہ ۳۷۰ کی رُو سے کشمیر پر دستورِ ہند کا اطلاق صرف تین مضامین دفاع، مواصلات اور خارجی امور پر ہوتا ہے اور اس دفعہ کی رو سے کشمیر کو اپنا آئین بنانے کا حق بھی دیا گیا ہے، لیکن ۱۹۵۳ء میں شیخ محمد عبداللہ کی برطرفی کے بعد سے اب تک آئین ہند کی جتنی دفعات ریاست پر لاگو کی گئی ہیں، ان کے پیش نظر دفعہ ۳۷۰ کی تاریخی عظمت اور سیاسی اہمیت دونوں ہی ختم ہو گئی ہیں اور مرکزی حکومت کا یہ دعویٰ بالکل بجا ہے کہ ''ہم اس دفعہ کو منسوخ کرنے کی بجائے اسے کھوکھلا کر رہے ہیں۔'' اب تک کے تجربات اور مشاہدات سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اس خصوصی حیثیت کو ریاستی عوام کی آزادی پر کاری ضربیں لگانے کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے اور آئینی موشگافیوں کا سہارا لے کر کشمیر کو کالے قوانین کی ایک نرسری میں تبدیل کیا گیا ہے۔ دفعہ ۳۷۰ کی رُو سے کشمیر پر دستور ہند کی مزید دفعات نافذ کرنے کیلئے بعض معاملات میں ریاستی حکومت سے مشورہ اور کچھ معاملات میں اس کی منظوری ضروری قرار دی گئی ہے لیکن شیخ صاحب کی گرفتاری کے بعد ریاست پر جو حکومتیں مسلط ہو گئیں، وہ مرکزی حکومت کی اس درجہ منظور نظر تھیں کہ دستور ہند کی نئی نئی دفعات کو ریاست پر لاگو کرنے کے لئے ان کی منظوری حاصل کرنا محض ایک رسم تھی! دستاویز الحاق میں متذکرہ مضامین سے متعلق دفعات کو ریاست پر لاگو کرنے کے لئے ان کی منظوری حاصل کرنا محض ایک رسم تھی! دستاویز الحاق میں متذکرہ مضامین سے متعلق دفعات صدر جمہوریہ کے حکم اور ریاستی حکومت کے مشورے

سے نافذ ہوسکتی تھیں۔ لیکن ان حدود سے تجاوز کرنے والی دفعات کیلئے ریاستی حکومت کی منظوری ہی نہیں، ریاست کی دستور ساز اسمبلی کی تصدیق بھی لازم قرار دی گئی ہے۔ یہ ایک خالص آئینی بحث ہے کہ دستور ساز اسمبلی کے خاتمے کے بعد صدرِ جمہوریہ کے نافذ کردہ احکامات کی کیا حیثیت ہے اور اسوقت میں اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتا۔ میں جس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ دفعہ ۳۷۰ کی آڑ میں ریاستی عوام کو کس طرح ان حقوق اور اس آزادی سے محروم کر دیا گیا ہے کہ جو ملک کے دوسرے حصوں حتیٰ کہ ناگالینڈ کو بھی حاصل ہیں۔

۱۹۵۰ء میں ہندوستانی آئین کے نفاذ کے فوراً بعد صدر جمہوریہ نے دفعہ ۳۷۰ کے تحت ایک فرمان جاری کرتے ہوئے دستور کی بعض دفعات کو کشمیر پر لاگو کر دیا۔ اس فرمان میں آئین ہند کا تیسرا باب ''بنیادی حقوق'' شامل نہ تھا اور یہیں سے ہماری بدقسمتی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس وقت ریاست پر بنیادی حقوق کا باب لاگو نہ کرنے کے لئے بڑی معقول اور وزن دار دلیلیں دی گئیں اور مرکز اور ریاست کے مقتدّر رہنما اس بات پر متفق تھے۔ بنیادی حقوق کی پابندیاں اور مجبوریاں کشمیر کی ترقی پسند تحریک کو اس کے منطقی انجام کی طرف بڑھنے میں سدراہ ثابت ہوں گی۔ خاص طور پر زرعی اصلاحات کے پروگرام میں رخنہ اندازی کا اندیشہ تھا۔ اسکے علاوہ کشمیر اس وقت ایک ہنگامی دور سے گذر رہا تھا اور پاکستان کی طرف سے اندرونی گڑ بڑ پیدا کرنے کی کوششیں جاری تھیں۔ ان حالات میں بنیادی حقوق اور آئینی ضمانتوں کے مقابلے میں ریاست کی سالمیت اور سلامتی کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی اور

معاہدہ دہلی کی رو سے دونوں فریق، ریاست اور مرکز اس بات پر متفق ہو گئے کہ دستور ہند میں مندرج بنیادی حقوق کا ریاست پر مکمل نہیں بلکہ محدود نفاذ ہوگا۔ اس فیصلے کی وضاحت ۱۱ اگست ۱۹۵۲ء کو شیخ محمد عبداللہ نے کشمیر کی دستور ساز اسمبلی میں ان لفظاظ میں کی:

اس میں شک نہیں کہ اسوقت جبکہ ہمارا آئین مرتب ہورہا ہے، شہریوں کے حقوق اور ان کے فرائض کی تعریف اور تشریح ہونی چاہیئے۔ لیکن اس بات سے سبھی لوگ متفق ہو گئے ہیں کہ ہندوستانی آئین میں دئے گئے بنیادی حقوق کا اطلاق مکمل طور پر اس ریاست میں رہنے والے لوگوں پر نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ایسا کرنا ہماری اس تحریک کے معاشی، سماجی اور سیاسی کردار کے منافی ہوگا کہ جس کو نیا کشمیر کے منصوبے میں پیش کیا گیا ہے۔ ان دفعات کو ہماری تحریک کے بنیادی مقاصد سے ہم آہنگ کرنے کے لئے ان میں ترمیمیں، تبدیلیاں اور اضافے کی ضرورت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ خاص طور پر زرعی زمینوں کے معاوضے اور کسانوں کو زمین منتقل کرنے کے اس اہم فیصلے کو مدنظر رکھا جائیگا کہ جو اس ایوان نے اتفاق رائے سے کیا ہے۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ ہمارے بنیادی حقوق ہمارے آئین کا حصہ ہونا چاہیں یا ہندوستانی آئین کا...''

اس اہم نکتے پر اپنی رائے ظاہر کرنے سے پہلے شیخ محمد عبداللہ گرفتار کئے گئے اور اس کے بعد دستور ساز اسمبلی نے ۱۹۵۶ء میں جو آئین پاس کیا، اسمیں بنیادی حقوق کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ بادی النظر میں یہ محرومی بہت بڑی رحمت دکھائی دیتی ہے کیونکہ ریاستی آئین میں بنیادی حقوق کی عدم موجودگی سے یہ نتیجہ اخذ ہوگا کہ اس ریاست پر مرکزی

دستور میں دیئے گئے بنیادی حقوق کا اطلاق ہوگا، افسوس کہ اس رحمت کو اس طرح نازل کر دیا گیا ہے کہ یہ ہمارے لئے سب سے بڑی زحمت بن گئی ہے۔ ۱۴ مئی ۱۹۵۴ء صدر جمہوریہ نے دفعہ ۳۷۰ کے تحت حاصل اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے جو فرمان جاری کیا اسکی رو سے دستورِ ہند کے تیسرے باب یعنی بنیادی حقوق کو ریاست پر لاگو کر دیا گیا۔ لیکن ایک ہاتھ سے یہ نعمت عطا کر کے صدر جمہوریہ نے دوسرے ہاتھ سے اسے چھین بھی لیا اور ریاستی عوام کے لیئے بنیادی حقوق کا تحفہ ایک کھلونے سے زیادہ ثابت نہ ہوا۔ صدر جمہوریہ کے اس فرمان میں بنیادی حقوق کا باب لاگو تو ہوا، لیکن اس باب کی اہم ترین دفعات، دفعہ ۱۹ اور دفعہ ۲۲ کو گلے کا ہار بنانے کی بجائے پاؤں کی زنجیر بنا کر، دفعہ ۱۹ کی رو سے ایک عام شہری کو تقریر اور اظہار، پرامن اجتماع، نقل و حرکت، رہائش، پیشے اور تجارت کی آزادی حاصل ہے لیکن اس آزادی کو مطلق بنانے کی بجائے اسے کچھ معقول پابندیوں Reasonable Restrictions کے تابع کر دیا گیا ہے۔ ان پابندیوں کی معقولیت یا عدم معقولیت کے متعلق فیصلہ صادر کرنے کا حق عدلیہ کو دیا گیا ہے۔ لیکن صدر جمہوریہ کے اس فرمان کی رو سے اس ریاست میں ''معقول پابندیوں کی معقولیت یا بیہودگی کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق عدلیہ کو نہیں، ریاستی قانون سازیہ کو دیا گیا ہے۔ یعنی ریاستی قانون سازیہ کے نوشیروان خود ہی قاتل ہوں گے اور منصف بھی۔ وہ دفعہ ۱۹ کے تحت دی گئی آزادیوں پر نا معقول سے نامعقول پابندی بھی کیوں عائد نہ کریں، عدلیہ کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ عدلیہ پر اس قسم کی بے اعتمادی اور بدظنی کا مظاہرہ

ناگالینڈ میں نہیں کیا گیا ہے کہ جہاں فوجی کاروائی کے دوران بھی لوگوں کو بنیادی حقوق حاصل رہے ہیں!

دفعہ ۲۲ ایک نظر بند کو بعض اہم آئینی تحفظات عطا کرتا ہے اور اسکی رو سے اسکو نظر بندی کی وجوہات جاننے اور اسکے خلاف عذرداری کرنے کے بنیادی حقوق حاصل ہیں۔ اس دفعہ کا اطلاق کرتے ہوئے صدر جمہوریہ کے فرمان نے ان اہم حقوق کو کچھ اسطرح چھین لیا ہے کہ نظر بند کے ہاتھ میں صرف بنیادی حقوق کا چھلکا رہتا ہے، میوہ نہیں، اس فرمان کی رو سے ریاستی حکومت کا بنایا ہوا کوئی قانون اس وجہ سے کالعدم قرار نہیں پائیگا کہ یہ اس باب (باب سوئم) میں مندرج دوسرے قوانین سے متصادم ہوتا ہے۔ لیکن ایسا قانون اس فرمان کے جارے ہونے کے پانچ سال بعد ہی ختم سمجھا جائیگا۔ دوسرے الفاظ میں ریاستی حکومت پانچ سال کے لئے نظر بندی کا کوئی بھی وحشیانہ قانون بنا سکتی ہے اور وہ بنیادی حقوق سے متصادم ہونے کے باوجود جائز اور صحیح تصور ہوگا۔ اس رعایت سے فائدہ اٹھا کر ریاستی حکومت نے پچھلے بیس بائیس برسوں میں احتیاطی نظر بندی قانون کو دہشت، خوف، سراسیمگی کا ماحول پیدا کر کے انتقام گیری کے لئے استعمال کیا ہے۔ ۱۹۵۴ء میں جاری شدہ صدارتی فرمان کی رو سے دفعہ ۱۹ اور ۲۲ پر پابندیاں صرف پانچ سال کے لئے عائد ہوئی تھیں، لیکن اسکے بعد سے اب تک ہر پانچ سال کے بعد ان میں مزید پانچ سال کی توسیع ہوتی رہتی ہے اور تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ان زنجیروں میں توسیع کرنے کا سہرا صرف بخشی غلام محمد کے ہی نہیں، مرحوم غلام محمد صادق کے سر بھی ہے کہ جو اس ریاست میں نرم

روی، جمہور نوازی اور اصولی سیاست کے بہت بڑے علمبردار تھے۔
صادق صاحب کے دورِ اقتدار میں بنیادی حقوق پر ان پابندیوں میں
ایک بار نہیں، دوبار توسیع ہوئی اور اب ۱۹۷۴ء میں ان کی میعاد ختم ہو رہی
ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سیکولرازم کے ایک اور مدح خواں سید میر قاسم ان
جان لیوا، روح فرسا او بہیمانہ پابندیوں کو ختم کر دیں گے، یا صدر
جمہوریہ سے ۱۹۵۴ء کے فرمان میں مزید توسیع کی درخواست کریں گے۔
پچیس برس تک کالے قوانین کے اندھیروں میں سانس لیتے لیتے اب
ہمارا دم گھٹ رہا ہے۔ بنیادی حقوق کے نام ہر پیدائشی حقوق پر ڈاکہ
ڈالنے کے اس ناٹک سے اب ہمارا جی بھر گیا ہے اور ہماری نگاہیں
۱۹۷۴ء پر لگی ہوئی ہیں کہ جب ہماری آزادی کو غصب کرنے والی ان
پابندیوں کی مدت ختم ہو جائیگی۔ ۱۴مئی ۱۹۷۴ء کو قاسم صاحب کا امتحان
ہے۔ خدا کرے کہ وہ اس امتحان میں کامیاب اور ہم اس مصیبت سے
آزاد ہو جائیں۔

۷ر اگست ۱۹۷۳ء

غلام نبی گلکار......شہید آرزو

مارا دیارِ غیر میں اپنے وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی لاج

تحریک حریت کشمیر کے ایک اور معمار غلام نبی گلکار بھی غریب الوطنی میں چل بسے۔ اِنَّاللّٰہِ وَ اِنَّااِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ.

گلکار صاحب کی تاریخی عظمت ، ان کی سیاسی اہمیت، اولوالعزمی، راست گوئی، جرأت رندانہ اور بے خطر آتش نمرود میں کود پڑنے کی عادت اور صلاحیت کے سب سے معتبر گواہ جناب شیخ محمد عبداللہ ہیں۔ اور اُن کی موت پر انہوں نے جس دل گداز اور جذباتی لہجے میں اپنے رنج وغم کا اظہار کیا ہے اس سے نہ صرف بہت سی پرانی یادیں تازہ ہو گئی ہیں، بلکہ محرومی اور مجبوری کا احساس بھی شدید ہو گیا ہے۔ گلکار صاحب پورے ۲۶ برس تک ایک اجنبی دیار میں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتے رہے، آہنی دیواروں سے سر ٹکراتے رہے، خوابوں کے سہارے حقائق سے لڑتے رہے اور اپنے زخموں پر حُب وطن کا مرہم لگا کر جیتے رہے۔ وہ کشمیر کے سچے عاشق تھے اور انہوں نے اپنی زندگی کی ایک ایک سانس کشمیر کی محبت، اس کے فراق اور اس کے تصور میں گزار دی۔ افسوس کہ اس عاشق صادق کو موت کے بعد بھی کشمیر کی مٹی نصیب نہ ہو سکی۔

گلکار صاحب، مولوی عبدالرحیم اور شیخ محمد عبداللہ تحریک حریت

کشمیر کے ان اولیس معماروں میں سے ہیں کہ جنہوں نے ۱۹۳۱ء کے بھیانک اندھیرے میں اپنا لہو جلا کر آزادی کی شمع روشن کی۔ ۱۴ر جولائی ۱۹۳۱ء کو جب ان تینوں باغیوں کو ہتھکڑیاں پہنا کر رات کے سناٹے میں قلعہ ہاری پربت کے اندر لے جایا گیا تو انہیں اس بات کا یقین تھا کہ اس قلعے کے کسی تہہ خانے میں ان کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل کر دیا جانے والا ہے، شیخ صاحب کا کہنا ہے کہ جب ڈوگرہ سپاہیوں نے اپنی سنگینیں تان کر ہمیں ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں داخل ہونے کا حکم دیا تو جوان، خوبرو اور جوشیلے غلام نبی گلکار نے بڑی جرأت، ہمت اور حوصلے کا ثبوت دیا۔ انہوں نے ڈوگروہ سپاہیوں کی موجودگی کی پرواہ کئے بغیر، آزادی کی عظمت تحریک حریت کے اعلیٰ مقاصد اور فلسفۂ شہادت پر ایک بصیرت افروز تقریر کی اور اس کے بعد یہ ضد کی کہ سب سے پہلے انہیں اس موت کے کنوئیں میں کود جانے کا حق دیا جائے۔ مولوی عبدالرحیم نے مطالبہ کیا کہ سب سے پہلے انہیں جامِ شہادت نوش کرنے کا موقع دیا جائے۔ شیخ صاحب نے اصرار کیا کہ سعادت حاصل کرنے کا پہلے اُنہیں موقع دیا جائے اور کچھ دیر بعد تینوں نے اس بات پر اتفاق کر لیا کہ اس سفر کی رہ نمائی بھی شیخ صاحب ہی کریں گے، خدا کی قدرت کہ موت کی جانب یہ تاریخی سفر کشمیر کے لئے ایک نئی زندگی اور ایک نئے افق کا پیغام ثابت ہوا۔

غلام نبی گلکار کی موت پر شیخ صاحب نے انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ "گلکار کشمیر کے عاشق تھے، اور انہوں نے ایک پروانے کی طرح اپنی زندگی کشمیر پر نچھاور کر دی وہ غریب بھی تھے

اور غریب الوطن بھی، لیکن ان کا دل حب وطن سے معمور تھا اور ان کی ہر سانس کشمیر اور کشمیریوں کے لئے وقف تھی، یہ غلام نبی گلکار کی موت کا مرثیہ نہیں، ان کی زندگی کا نچوڑ ہے۔ وہ ساری زندگی پروانے کی طرح کشمیر پر نثار ہوتے رہے اور بالآخر اسی آگ میں جل کر خاک ہو گئے۔ یوں تو ان کی ساری زندگی غربت اور حکومت کے خلاف جدوجہد میں گزری۔ لیکن زندگی کے آخری ایام میں انہیں جن مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، اس سے ان کی کمر دوہری ہو گئی تھی میں نے ۱۹۶۹ء میں جب انہیں بیس بائیس برس کے بعد پاکستان میں دیکھا تو ان کے چہرے کی بشاشت، ان کے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ اور ان کی آنکھوں کی چمک وادیٔ غربت میں اجنبی ہاتھوں کے گراں بار ستم سہتے سہتے کھو گئی تھی، خوش پوش نفاست پسند اور وضع دار گلکار چیتھڑوں میں ملبوس، ایک پھٹی پرانی چادر اوڑھے شکل صورت سے ایک قیدی ہی لگ رہا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ وہ پاکستان کے وسیع زنداں خانے میں ایک لحاظ سے قیدی لگ رہا تھا۔ وہ کشمیر سے دور، ایک اجنبی سرزمین پر ایک لمحہ گزارنے کے لئے بھی تیار نہ تھا، لیکن تاریخ کی ستم ظریفی اور حالات کی سازش نے اُسے نہ صرف اپنی زندگی کے ۲۷ سال دیار غیر میں گزارنے پر مجبور کیا، بلکہ اس کے وجود خاکی کو بھی وطن کی خاک سے محروم رکھا وہ اپنے آپ کو ”آزاد کشمیر“ کا بانی صدر کہلانے پر مُصّر تھا اور اپنے لاتعداد مضامین ”غلام نبی گلکار انور بانی صدر آزاد کشمیر“ کے نام سے شائع کیا کرتا تھا۔ لیکن ”آزاد کشمیر“ کے بانی صدر کو خودمختار کشمیر کا مطالبہ کرنے کی پاداش میں ایک بار نہیں کئی بار پابند سلاسل کر دیا گیا۔ وہ ابھی چند ماہ

قبل ہی جیل سے چھوٹے تھے، اب زندگی کی جیل سے چھوٹ کر ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گئے۔ مجھے یقین ہے کہ غلام نبی گلکار کی بے چین روح محشر میں بھی خود مختار کشمیر کا مطالبہ کرنے سے باز نہیں آئے گی! خود مختار کشمیر، ان کا مذہب ان کا دین، ان کا ایمان اور ان کی سیاست تھا وہ ساری عمر اس خواب کی تعبیر ڈھونڈتے رہے اور یہی آرزو لے کر مر گئے۔ ان کے درد، ان کے عشق اور ان کے جنوں کو بہت کم لوگ سمجھتے تھے اور اس لئے بہت سے فرزا نے اس دیوانے کا مذاق اڑایا کرتے تھے، لیکن زمانے کی بے ثباتی، دوستوں کی بے مروتی، نامساعد حالات کی یلغار اور پے در پے شکستوں کے باوجود گلکار صاحب کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی وہ آخری دم تک اپنے خوابوں کے سہارے تلخ حقائق سے لڑتے رہے اور اسی کشمکش میں مارے گئے حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا۔

گلکار صاحب مومن پورہ، روالپنڈی میں ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں رہ رہے تھے اور چار سال قبل جنوری ۱۹۶۹ء میں میری یہیں ان سے ملاقات ہوئی تھی، پاکستان سے واپسی پر میں نے ایک سلسلۂ مضامین میں گلکار صاحب سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے اس اخبار کی ۱۰ر مئی کو اشاعت میں جو کچھ لکھا تھا وہ گلکار صاحب کی شخصیت اور ان کی عظمت پر ایک بھرپور تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے ان کی موت پر میں اس چار سالہ پرانی تحریر سے ایک اقتباس پیش کر رہا ہوں تاکہ جو لوگ مرحوم کے نام اور کام سے متعارف نہیں، انہیں اس سیماب صفت، نڈر اور آتش بیان مجاہد کی شخصیت کا کچھ اندازہ ہو جائے۔

"گلکار صاحب ان معدودے چند کشمیریوں میں سے ہیں جنہوں

نے دولت، جائداد، عزت حشمت اور حکومت سب کچھ ٹھکرا کر صرف کشمیر کے درد کو سینے سے لگایا ہے۔ انہوں نے کشمیر کی عزت و آبرو کو وظیفوں اور کلیموں کی نذر چڑھانے سے انکار کر دیا۔ انہیں جنونی، مخبوط الحواس کہہ کر پکارنے والوں کی پاکستان میں کمی نہیں۔ لیکن کوئی انکا دشمن بھی ان پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ اس نے کبھی لالچ یا دباؤ میں آکر اپنے موقف سے انحراف کیا ہو۔ وہ شروع سے لے کر اب تک آزاد اور خود مختار کشمیر کے حامی ہیں اور پاکستانی حکومت سے برسرِ پیکار۔ ان کے عزم کو جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریاں بھی پامال نہ کرسکیں۔ حتیٰ کہ جیل کی آہنی سلاخوں سے بھی انہوں نے آزاد اور خود مختار کشمیر کا نعرہ بلند کیا۔ گلکار صاحب نے اخبارات میں ایک طویل سلسلہ مضامین شائع کر کے "خود مختار کشمیر" کی سیاسی اقتصادی اور جغرافیائی اہمیت کو واضح کیا ہے اور خود مختار کشمیر کے مخالفین کے ہر اعتراض کا مسکت جواب دیا ہے انہیں اپنے وطن سے عشق ہے اور وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر کی عزت اور آبرو اسی میں ہے کہ وہ ہندوستان اور پاکستان دونوں سے دوستانہ تعلقات قائم کر کے آزاد اور خود مختار رہے۔ انہیں اپنے موقف کی صحت اور سلامتی کا اس درجہ یقین ہے کہ وہ اس کے خلاف کوئی دلیل سننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ کے ایچ خورشید کے خلاف صدارتی امید وار کی حیثیت سے انتخاب لڑتے وقت بھی انہوں نے اپنا نصب العین " آزاد اور خود مختار کشمیر" قرار دیا تھا۔ وہ انتخاب ہار گئے لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری ہے۔ کشمیر کے مستقبل پر گلکار صاحب کا غیر متزلزل اعتماد ایک ایسے عاشق کی یاد دلاتا ہے جو اپنے محبوب کی بے

وفائی کے بعد بھی اُسی کے نام کی مالا جپتا ہے۔ گلکار صاحب اپنے وطن سے سینکڑوں میل دور مومن پورہ کے ایک خستہ و شکستہ مکان میں پناہ گزیں ہیں۔ لیکن انہوں نے سرینگر کی خوبصورتی کے لئے ایک جامع اسکیم تیار کی ہے وہ بہ ظاہر اپنے وطن لوٹنے تک کے مختار نہیں۔ لیکن وہ ریاست جموں وکشمیر کو خود مختار بنانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان کے اکثر دوست ان کے جذب وجنون پر ہنستے رہتے ہیں، لیکن انہیں اس کی پرواہ نہیں۔ مجھ سے کہنے لگے ''میں شاید اپنے خواب کی تعبیر دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہ سکوں، لیکن مجھے یقین ہے کہ تم ضرور دیکھو گے''

غلام نبی گلکار بڑا ہی غریب آدمی ہے لیکن اُسے اپنی غربت کا نہیں، غریب الوطنی کا شدید احساس ہے۔ صابر صاحب نے مجھے بتایا کہ گلکار چاہتے تو انہیں بھی کوٹھیاں اور درآمدی لائنس مل سکتے تھے لیکن اس نے کبھی...... پاکستان کی حکومت کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے' وہ پاکستان میں سیکولرازم، فرقہ وارانہ بھائی چارے اور باہمی یگانگت کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ اُس نے سیکولرازم اور نیشنلزم پر پاکستانی اخبارات میں بڑے عالمانہ مضامین لکھے ہیں اور ان کے بعض مضامین پڑھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی!

راولپنڈی میں قیام کے دوران گلکار صاحب سے کئی بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ جب بھی ملے انہوں نے مجھے'' آزاد اور خود مختار کشمیر'' کی بین الاقوامی اہمیت، اقتصادی خوش حالی اور برآمدی تجارت کے بے پناہ امکانات پر لیکچر پلائے۔ وہ پاکستانی حکمرانوں سے صرف بدظن ہی نہیں، سخت متنفر بھی تھے، اور میرے راولپنڈی سے روانہ ہونے سے ایک دن قبل انہوں نے ایک بہت بڑی فائل میرے حوالے کر دی، کہنے لگے

کہ ''اس میں میرے تمام مضامین ہیں کہ جو میں نے آزاد اور خود مختار کشمیر کی سیاست، معیشت، آبادی، آئین اور اقوام عالم کی برادری میں اس کے منصب کے متعلق لکھے ہیں۔ یہ یہاں پاکستانی اخبارات میں شائع ہوئے ہیں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم انہیں اپنے اخبار میں بھی چھاپ دو تاکہ کسی کشمیری کو یہ اندیشہ نہ رہے کہ آزاد اور خود مختار کشمیر محض ایک خواب ہے جو کبھی حقیقت نہیں بن سکتا۔ ان مضامین میں، میں نے جذبات سے نہیں تاریخ اور دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ کشمیر کے مسئلے کا صرف ایک ہی باوقار حل ہے اور وہ ہے خود مختار کشمیر، مجھے یقین ہے کہ انکو پڑھنے کے بعد تمہارے دل میں بھی کوئی شک و شبہ نہیں رہے گا!'' فائل میں اخباروں کے تراشے، کچھ پمفلٹ، گلکار صاحب کے صدارتی انتخاب میں ان کا منشور، جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں سے پاکستانی حاکموں کے نام لکھے گئے خطوط اور بہت سی دوسری تحریریں بھی شامل تھیں میرے چچا صابر صاحب نے احتجاج کیا کہ ''بے چارے پر اتنا سارا بوجھ کیوں لاد رہے ہو'' تو گلکار صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ یہ بوجھ نہیں علم ہے اور اہل بصیرت پر علم کبھی بوجھ نہیں بن سکتا'' اور یہ کہہ کر وہ بڑے زور سے ہنس دیئے۔

اخبارات میں شائع شدہ ان درجنوں مضامین کا تعلق براہِ راست اور بالواسطہ ان کے خواب، '' آزاد کشمیر'' سے ہے اور ان میں گلکار مرحوم نے ہر اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ جو آزاد کشمیر کے معاشی استحکام یا اقتصادی نظام پر کیا گیا ہے۔ ان کے دلائل میں کتنی معقولیت اور صداقت ہے، اس پر بحث کی گنجائش ہے لیکن گلکار کے عشق اس کے

خلوص اور اس کی نیت پر شک کی کوئی گنجائش نہیں، وہ دیانتداری سے اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ کشمیر اپنی اصلی تقدیر مکمل آزادی کے بعد ہی پاسکتا ہے۔

گلکار مرحوم کی عنایت کردہ اس فائل میں سے میں نے ایک مضمون'' سرینگر کو خوبصورت بنانے کا منصوبہ'' سال ۱۹۷۰ء کے سالنامے میں شائع کیا تھا۔ اس مضمون کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس طرح اقبالؔ کے اس شعر کی مجسم تفسیر تھے ؎

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں

ابھی چند دن قبل جب ان کے سفر آخرت پر روانہ ہونے کی خبر ملی، تو میں نے اپنے کاغذات میں سے گلکار صاحب کی دی ہوئی فائل نکال کر اس میں شامل تمام مضامین کا ایک بار پھر مطالعہ کیا۔ فائل کے آخری صفحے پر گلکار صاحب نے اپنے ہاتھ سے یہ الفاظ لکھے ہیں'' ریاست کشمیر کی اقتصادی ترقی کے امکانات سے متعلق مضامین...... جو صدر پاکستان کے یہ کہنے پر لکھے گئے تھے کہ کشمیریوں کے پاس کیا ہے کہ وہ آزاد اور خود مختار رہ سکتے ہیں''

ان مضامین کے عنوانات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ گلکار مرحوم نے کس محنت اور ریاضت سے خود مختار کشمیر کا خاکہ تیار کیا تھا۔ افسوس کہ بے رحم حقائق نے اُن کے خوابوں کا ساتھ نہ دیا اور ان کی سارے کشمیر کو تو کیا'' آزاد کشمیر'' کو بھی آزاد دیکھنے کی حسرت نہ پوری ہوسکی۔ گلکار صاحب کے ان مضامین کا مفصل ذکر اور ان میں سے کچھ اہم اقتباسات آئندہ اشاعتوں میں پیش کئے جائیں گے! ❁ ❁ ❁

۱۵ر ستمبر ۱۹۷۳ء

در مدحِ لونؔ

تعلیم، صحت اور سیاحت کے وزیر عبدالغنی لونؔ نے وزیر اعلیٰ سید میر قاسم کو اپنا استعفیٰ پیش کر دیا ہے اور استعفیٰ کی منظوری کا انتظار کئے بغیر، اپنی سرکاری قیام گاہ بھی خالی کر دی ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار مستعفی ہونے کا ارادہ کر چکے ہیں، لیکن اب کی بار ان کا ارادہ اٹل اور ان کا فیصلہ حتمی معلوم ہوتا ہے (حالانکہ سیاست میں 'اٹل' اور 'حتمی' جیسے الفاظ اپنے لغوی معنوں میں استعمال نہیں ہوتے)

لونؔ صاحب میرے دوست ہیں اور ان کے استعفیٰ سے مجھے بیک وقت خوشی اور دکھ ہوا ہے۔ خوشی اس لئے کہ اس دور میں جبکہ وزارت کا منصب حاصل کرنے کے لئے لوگ بڑی بڑی ذلتیں برداشت کرنے اور اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کے لئے تیار ہیں، لونؔ صاحب نے وزیرانہ شان و شوکت اور حکومتی جاہ و جلال کو ٹھکرا کر بڑی ہمت اور اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا ہے۔ وہ چاہتے تو خاموشی سے سب کچھ سہہ کر اپنی کرسی سے چمٹے رہتے اور اپنے ذہن اور ضمیر کے ہر فیصلے کو وقت کی مصلحتوں اور سیاست کی نزاکتوں کا تابع بنا کر اپنے دوسرے

ساتھیوں کی طرح اپنی ''سرخروئی'' کا سامان کرتے لیکن انہیں اپنے ضمیر کے خون سے اپنے چہرے کی زیبائش کا طریقہ راس نہیں آیا اور وہ اپنے گلے سے طوق وزارت اتار کر آزاد ہو گئے ۔ خود غرضی ، ریا کاری ، خوشامد اور بے ضمیری کے اس نفرت انگیز ماحول میں لون صاحب کا استعفیٰ ایک اچھی خبر ہے اور مجھے اس سے خوشی ہوئی ہے لیکن خوشی کے ان جذبات میں دکھ کے احساسات بھی شامل ہیں ، کیونکہ عبدالغنی لون کے استعفیٰ سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ رشوت ستانی ، کنبہ پروری ، بے ایمانی اور بد اعتدالی کے اس ماحول میں کسی غیرت مند، ایمان دار ، خود دار اور اصول پرست انسان کا سیاسی یا سماجی طور زندہ رہنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے اور باضمیر لوگوں کے لئے سیاست اور حکومت کا کاروبار بہرحال گھاٹے کا سودا ثابت ہو رہا ہے لون صاحب کا استعفیٰ اس اعتبار سے ہماری سیاسی زندگی کی صحت اور سلامتی کی اچھی علامت نہیں ہے۔ مجھے اس بات کا ذاتی علم ہے کہ وزارت میں شامل ہونے کے فوراً ہی بعد لون صاحب کو اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ وہ اس فضا میں زیادہ دیر تک پرواز نہیں کر سکیں گے۔ انہیں قدم قدم پر اپنے ضمیر کو اپنے وزیر ہونے کا احساس دلانا پڑتا تھا اور بارہا ایسا ہوا کہ وہ اپنے وزارتی منصب کو بھول کر اخلاق، انصاف اور ایمانداری کے چکر میں پڑ گئے، سیاست کی لغت اور حکومت کی شریعت میں ایسے گناہ نا قابل عفو ہوتے ہیں اور اس لئے انہیں وزارت سے مستعفی ہو کر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا پڑا۔

عبدالغنی لون کا استعفیٰ، سیاسی اعتبار سے ایک دانش مندانہ قدم

ہے یا نہیں اس پر دو رائیں ہو سکتی ہیں کیونکہ ہماری سیاست کے بوچڑ خانے میں حلال و حرام کی تمیز مٹ چکی ہے اور حرام خوروں نے تہذیب ، شائستگی اور فہم و فراست کے نئے نئے معیار قائم ہیں۔ ان معیاروں کی رُو سے وہی شخص کامیاب اور کامران ہے کہ جو زیادہ سے زیادہ مدت کے لئے اقتدار سے وابستہ رہنے کی صورت پیدا کرے، چاہے ایسا کرنے میں اُسے دُنیا بھر کی ذلت اور رسوائی اٹھانا پڑے۔ اپنے ضمیر کا خون اور اپنی انسانیت کا گلا ہی گھونٹنا پڑے، اس لحاظ سے لون صاحب نے مستعفی ہو کر نہ صرف اپنے سیاسی وجود اور مستقبل کو خطرے میں ڈال دیا ہے بلکہ اصطلاح عام میں گھر آئی لکشمی کو ٹھکرایا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ انہوں نے نتائج و عواقب سے پوری طرح باخبر ہو کر اپنے فیصلے کا اعلان کیا ہے اور وہ اپنے فیصلے کے ردعمل اور امکانات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ بات باعثِ اطمینان ہے کہ ابھی تک اس شہر میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ جو اصول کو اقتدار پر ،قومی مفاد کو ذاتی مفاد اور ضمیر کی آواز کو مصلحت کے تقاضوں پر ترجیح دیتے ہیں ان کا یہ قدم یقیناً ان کے لئے مصیبت کا باعث ہوگا راحت کا نہیں ۔ لیکن انہوں نے اقتدار کو پائے حقارت سے ٹھکرا کر نوجوانوں کے لئے ایک اچھی مثال قائم کی ہے اور میں انہیں اس جرأت رندانہ اور ہمت مردانہ کے لئے مبارکباد دیتا ہوں۔

لون صاحب ایک نزاعی شخصیت ہیں اور انہوں نے اپنے عہدِ وزارت میں کئی محاذوں پر جنگیں لڑیں۔ ان پر طالب علموں کو گمراہ اور نوجوانوں کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کا الزم بھی عائد ہوا

ہے اور پچھلے ایک ڈیڑھ سال کے دوران وہ خاص طور پر اپنے ذاتی اور سیاسی مخالفوں کی تنقید کا موضوع اور مرکز بنے رہے۔ ان کے خلاف یونیورسٹی اور ہسپتالوں میں مظاہرے ہوئے اور وہ اپنے ساتھیوں کیلئے بھی دردِ سر بنے رہے، ان کے سیاسی حلیف اور رقیب اُن کے وجود سے بیزار اور اُن کے بزرگ ان کی اصول پسندی سے پریشان تھے، انہوں نے بار ہا اپنے ساتھیوں کی دُکھتی رگوں کو چھیڑ کر انہیں ناراض کر دیا اور یہی وجہ ہے کہ وہ بڑے لوگوں کو Isolate کرنے کی بجائے خود isolate ہو گئے۔

لون صاحب نہ اچھے منتظم ہیں اور نہ مقرر۔ انہیں دانش ور بھی نہیں کہا جا سکتا۔ وہ ایک سچے، کھرے اور ایمان دار دیہاتی ہیں اور یہی ان کی سب سے بڑی خوبی اور سب سے بڑی خامی ہے۔ سچا آدمی بے خوف، بے لاگ اور بے صبر ہوتا ہے۔ اس کی سچائی اسے جرأت اور حوصلہ عطا کرتی ہے اور وہ مصلحتوں کی پرواہ کئے بغیر حق بات کہہ دیتا ہے۔ لیکن شہر اور دیہات میں شرافت اور صداقت کے معیار مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے لونؔ صاحب کو قدم قدم پر مخالفت اور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور بالآخر اداکاری اور ریاکاری کے ماحول سے گھبرا کر انہوں نے اپنی نجات کا سامان کر لیا۔ یہ بات قابلِ تقلید ہو نہ ہو، قابل تعریف ضرور ہے۔

بحیثیت وزیر کے لونؔ صاحب نے کوئی ایسا قابل ذکر کارنامہ سر انجام نہیں دیا کہ جسے ان کی سیاسی زندگی کا حاصل یا ان کی ذاتی صلاحیتوں کا پیمانہ قرار دیا جائے۔ وہ جس ماحول اور جس فضا میں کام کر

رہے تھے اُس میں اپنے ضمیر کی پاکیزگی اور روح کی بالیدگی کو برقرار رکھنا ہی بہت بڑا کارنامہ ہے اور میرا خیال ہے کہ ان کا استعفٰی اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ تین سال تک اقتدار کے سیاہ خانوں میں رہنے کے باوجود نہ ان کے ضمیر کو زنگ لگا ہے اور نہ ان کی روح کو مستعفی ہونے کے بعد انہوں نے جس بے خوفی کے ساتھ ریاستی حکومت کی بدعنوانیوں اور بے اعتدالیوں کا ذکر کیا ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اور زیادہ دیر تک خاموش رہنا ان کے بس کی بات نہیں تھی، لیکن کابینہ میں رہتے ہوئے چونکہ زبان کھولنا مشکل تھا، اس لئے ان کے لئے کابینہ سے مستعفی ہونا ضروری بن گیا۔ خوش قسمتی سے لون صاحب کا اپنا ریکارڈ بالکل صاف اور بے داغ ہے اور ان کے بد سے بدترین دشمن بھی ان پر رشوت ستانی یا کنبہ پروری کا کوئی الزام ثابت نہیں کر سکتے، اس لئے مستقبل قریب میں وہ جو کچھ کہیں گے اُسے بڑی توجہ اور دلچسپی سے سُنا جائے گا۔ یہ بات لونؔ صاحب کے حق میں کہی جا سکتی ہے کہ کابینہ کے ایک وزیر کی حثییت سے جب کچھ صحافیوں نے انہیں بلیک میل کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے اس دباؤ کے آگے جھکنے کی بجائے اس کا مردانہ دار مقابلہ کیا اور آئے دن اخبارات کے کارٹونوں اور سرخیوں کا موضوع بنتے رہے۔ طرح طرح کے الزامات اور اتہامات کے تیر سہتے رہے۔ لیکن انہوں نے ایک بار بھی اس بلیک میل کے آگے ہتھیار ڈال کر ان برخود غلط صحافیوں کی انا کو تسکین پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اس محاذ پر بھی لڑے اور بڑی بے جگری سے لڑے، ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس نے

امن خریدنے کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا کی ہوتی، لونؔ صاحب کی اس جرأت اور بیباکی نے میرے دل میں ان کے تئیں عزت، احترام اور محبت کا جذبہ پیدا کیا ہے اور باوجود اس کے کہ میرے اور ان کے درمیان ایک سیاسی، ذہنی اور فکری خلیج حائل ہے، میں انہیں دوسروں کے مقابلے میں اپنے قریب تر پاتا ہوں، وہ حکومت اور حکمراں جماعت کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اس ماحول میں اجنبی لگ رہے تھے۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ رہی سہی زنجیروں کو توڑ کر اس بے نام اکثریت کا حصہ بنیں گے کہ جو اس حکومت کے نہیں، اُس نظام کے مخالف ہیں کہ جو ایسی حکومتوں کو جنم دے کر زندہ رکھتا ہے۔ جب تک یہ نظام قائم ہے ایمانداری اور دیانت داری کے ''مجرموں'' کو تختۂ دار پر لٹکایا جاتا رہے گا۔

عبدالغنی لون کو یقیناً اس بات کا اندازہ ہوگا کہ ان کا استعفیٰ اگرچہ ان کا ذاتی فیصلہ ہے لیکن سیاسی امکانات کے اعتبار سے یہ موجودہ حکومت کے خلاف ایک اعلان جنگ کی حیثیت رکھتا ہے اور انہیں قدم قدم پر سخت مزاحمت اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس ریاست میں سیاسی مخالفوں اور نکتہ چینیوں کے ساتھ ماضی بعید اور قریب میں جو سلوک روا رکھا گیا ہے، اس کے پیش نظر انہیں اس بات کے لئے تیار رہنا چاہیے کہ ان کا قافیہ تنگ کرنے، ان کی زندگی کو اجیرن بنانے، انہیں جسمانی اور روحانی اذیت پہنچانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جائے گا۔ یہاں سیاسی مخالفوں سے نمٹنے کے لئے جو روایات قائم ہوئی ہیں ان میں ناجائز سے ناجائز اور مکروہ سے مکروہ ہتھکنڈے بھی شامل ہیں اور عنقریب ہی کردار کشی کے اسلحہ خانوں کو لون صاحب کے خلاف

مہلک سے مہلک ہتھیار تیار کرنے کے احکامات دیئے جائیں گے۔ لیکن مجھے لون صاحب کی ذات سے یہ توقع ہے کہ استعفیٰ پیش کرنے سے پہلے انہوں نے ان تمام امکانات پر غور کیا ہوگا اور وہ اسی جرأت اور ہمت کے ساتھ آنے والے مسائل اور مصائب کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہوں گے کہ جس حوصلے کے ساتھ وہ گزشتہ کئی سال سے ظلم اور جبر اور نا انصافی کے خلاف برسر پیکار ہیں۔ انہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ان کے استعفیٰ نے عوام میں ان کا وقار اور اعتبار بلند کر دیا ہے اور وہ اس وقت Eslablishment کے خلاف عوامی بیزری کی ایک بہت بڑی علامت بن گئے ہیں۔ ان کے نکتہ چیں پریشان ہیں کہ اپنے منصب کی بلندی سے نیچے آنے کے بعد ان کا قد اور بھی بڑھ گیا ہے۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدّعی کے واسطے دارورسن کہاں

۲۳ر ستمبر ۱۹۷۳ء

رفتارِ زمانہ

دُنیا بڑی تیزی کے ساتھ بدل رہی ہے اس کا سبھی کو احساس ہے۔ لیکن تبدیلی اور ترقی کی رفتار کتنی تیز ہے، اس کا اندازہ بہت کم لوگوں کو ہے، جدید علوم اور سائنسی ایجادات نے پچھلے بیس پچیس برسوں میں ترقی اور تغیر کے عمل کو وہ برق رفتاری عطا کی ہے کہ بدلتی ہوئی دُنیا کا ساتھ دینا تو الگ، ان تبدیلیوں کے اثرات اور امکانات کو اچھی طرح سمجھنا بھی ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ ہم دنیا کے جس حصے میں رہ رہے ہیں وہاں نسبتاً تبدیلی کا عمل خاموش، سُست رفتار اور کسی حد تک ناہموار ہے۔ اس لئے ہم اس انقلاب عظیم کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ جو غیر محسوس طریقے پر ہماری زندگی کے ڈھانچے، اس کی بنیادی قدروں اور خیر وشر کے متعلق ہمارے صدیوں پرانے تصورات اور توہمات کو بدل کر ایک نئی انسانیت اور نئی اخلاقیات کو جنم دے رہا ہے۔ ہم میں سے اکثر لوگ نئی معلومات اور ایجادات کا خیر مقدم کرنے کے باوجود، نئی اخلاقیات کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں اور اس طرح انقلاب کے

عمل اور اثر کو اپنی روایات اور خواہشات کا تابع بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تہذیب اور تمدن کی تاریخ گواہ ہے کہ اس قسم کی کوششوں سے ترقی اور تبدیلی کا قانون بدل نہیں سکتا۔ اس مختصر سی تمہید کا مقصد کشمیر میں اس خاموش اور عہد آفریں انقلاب کی نشاندہی کرنا ہے کہ جس نے محدود پیمانے پر ہماری زندگی ہمارے معاشرے، ہمارے تعصّبات اور تصورات کو متاثر کرنا شروع کر دیا ہے اور جو آئندہ بیس برسوں میں ہماری سخت مزاحمت کے باوجود ہمیں ایک نئ اخلاقیات کا ''تحفہ'' قبول کرنے پر مجبور کر دے گا۔ میرا اشارہ سرینگر میں ٹیلی ویژن سنٹر کے قیام اور اس کی توسیع کے ان منصوبوں کی طرف ہے کہ جن پر عمل کرنے سے پوری ریاست میں ٹی وی پروگرام دیکھے جا سکیں گے۔ ٹیلی ویژن سنٹر قائم ہوئے چھ ماہ کا عرصہ بھی نہیں گزرا ہے کہ اس عجوبے نے اپنے حیرتناک امکانات سے اہل نظر کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے اور سرینگر کے پسماندہ ترین شہر میں کچھ لوگوں کو یہ احساس اور اندازہ ہونے لگا ہے کہ بیس پچیس برسوں میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے!

یہ صرف ۲۶ سال پہلے کی بات ہے کہ میں شوپیان میں چھٹی یا ساتویں جماعت کا طالب علم تھا اور میں نے پہلی بار ریڈیو کا نام سنا۔ جب مجھے یہ بتایا گیا، کہ ایک بکس نما مشین سے انسانی آوازیں برآمد ہوتی ہیں تو میں نے اسے گراموفون کی ایک بہتر صورت متصور کر کے اسے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن اس وقت علاقہ شوپیاں میں صرف دو رئیسوں کے پاس ریڈیو سیٹ تھے۔ اور ریڈیو دیکھنے اور سُننے کے لئے مجھے ایک شام پورے تین میل پیدل سفر طے کرنا پڑا اُن دنوں اس

علاقے میں بجلی کی خواہش بھی دیوانے کا خواب معلوم ہوتی تھی۔ اسلئے ریڈیو بیٹری پر چلتا تھا اور بیٹری بھی وہ کہ جسے چوبیس گھنٹے مسلسل چلانے کے بعد دوبارہ چارج کرنا پڑتا تھا۔ ریڈیو کی ندرت اور قدرت سے محظوظ اور مستفید ہونے کے لئے مجھے اور میرے کئی دوستوں کو ہر شام شوپیان سے پنجورہ جانا پڑتا، جہاں اُس وقت کے ایک رئیس کے پاس ایک عدد ریڈیو تھا اور جسے دیکھنے کے لئے دُور دراز سے لوگ آتے تھے۔ ۲۶؍ برس پُرانے اس تجربے کو ذہن میں رکھ کر سوچئے کہ ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ میں پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج اس ریاست میں مشکل سے کوئی ایسا گھر موجود ہوگا کہ جہاں ایک ٹرانسسٹر سیٹ موجود نہ ہو۔ آواز کی دنیا میں اس حیرت انگیز انقلاب نے غیر محسوس طریقے پر ہماری عادات، روایات، تصورات اور تعصّبات کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں، اور ہم نے رفتہ رفتہ اپنی فکر اور سوچ کو اُس جادوئی مشین کے تابع بنا دیا جسے عرف عام میں ریڈیو کہا جاتا ہے۔

ابھی ریڈیو کے انقلاب اور امکانات کا مطالعہ جاری تھا کہ آواز کے جادو کے ساتھ تصویر کے طلسم نے بھی قیامت بپا کر دی اور ٹیلی ویژن کا عہد شروع ہوگیا۔ سرینگر دلی کے بعد ہندوستان کا دوسرا شہر ہے کہ جہاں ٹیلی ویژن سٹیشن قائم ہوا، بمبئی کا نمبر تیسرا ہے۔ اس لحاظ سے یہ شہر ملک کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں زیادہ ماڈرن اور ترقی یافتہ ہے۔ اگر چہ ٹیلی ویژن سیٹوں کی بھاری قیمت کے پیش نظر ابھی تک آواز اور تصویر کا یہ عجوبہ صرف متوسط طبقے تک ہی محدود ہے۔ لیکن ٹی وی سیٹوں کی بڑھتی ہوئی مانگ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آئندہ چند سالوں کے اندر اندر ٹی،

وی ریڈیو کی جگہ لے گا اور بہت کم لوگ ریڈیو کے ''دقیانوسی'' میڈیم میں دلچسپی لیں گے، سرینگر میں ٹی وی کی مقبولیت کی بہت سی وجوہات کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ راولپنڈی اور لاہور سے ٹیلی کاسٹ کیے جانے والے پروگرام یہاں آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں اور پچھلے چند ماہ سے سرینگر میں ٹی وی دیکھنے والے سرینگر کے علاوہ راولپنڈی اور لاہور کے پروگراموں سے بھی محظوظ ہو رہے ہیں۔پاکستان کے اُس ہوائی حملے، کا مقابلہ کرنے کے لیے سرینگر کے ٹی وی سینٹر سے ہر شام ساڑے چار گھنٹے کا پروگرام شروع کیا گیا اور اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے سرینگر ٹی وی پروگراموں کے سلسلے میں دہلی اور بمبئ پر سبقت لے گیا۔ دہلی اور بمبئ دونوں شہروں میں صرف انہی شہروں کے پروگرام دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن سرینگر کے خوش نصیب سرینگر، راولپنڈی اور لاہور اسٹیشنوں کے پروگرام بھی دیکھ سکتے ہیں۔ میں اس بات پر غور کرتا ہوں تو ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مجھے پر لگ گئے ہیں اور فضاؤں میں تیر رہا ہوں۔ چند دن ہوئے لاہور ٹیلی ویژن سنٹر سے یہ خبر نشر ہوئی کہ پاکستان ٹیلی ویژن کے موجودہ سیاہ و سفید، میڈیم کو ترک کر کے رنگین ٹیلی ویژن شروع کر رہا ہے اور وجہ یہ بتائی گئی کہ رنگین ٹیلی ویژن کے استعمال میں خرچہ کم ہوگا۔ یہ اعلان سننے کے بعد میرے ہوش وحواس اُڑ گئے اور دوسرے ہی لمحہ پاکستان ٹیلی ویژن کے ڈائریکٹر جنرل نے اس کی وضاحت کر کے میرے استعجاب میں اور اضافہ کر دیا۔ ڈائریکٹر جنرل نے کہا کہ آئندہ دو تین سال کے اندر اندر دنیا بھر میں سفید و سیاہ ٹی وی بنانے والے رنگین ٹی وی بنانا شروع

کریں گے اور پھر بلیک اینڈ وہائٹ سیٹ یا اس کے پُرزے ملنا دشوار ہو جائے گا۔ یا اللہ! یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ہاں ابھی سفید و سیاہ ٹی وی سیٹ کی شروعات بھی نہیں ہوئی ہیں اور سوڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر ہمارے پڑوس میں یہ چیز زائد المعیاد بلکہ آثارِ قدیمہ بنتی جا رہی ہے۔ ایسے واقعات میں نے سائنس فکشن کی کتابوں میں پڑھے تھے، لیکن حقیقت فکشن سے زیادہ حیران کن اور تیز رفتار ہو گی اس کا مجھے تصور بھی نہیں تھا۔ امریکہ، یورپ اور جاپان میں رنگین ٹی وی نے سالہا سال کے انتظار اور تجربوں کے بعد سفید و سیاہ کی جگہ لے لی۔ لیکن مجھے اگر آج ایک رنگین ٹی وی خریدنے کی استطاعت ہو تو میں اس عبوری اور تجرباتی دور سے گزرے بغیر اپنی خواب گاہ میں رنگین ٹی وی سے مسحور اور مستفید ہو سکتا ہوں۔ ٹی وی کے ان حیرت ناک اور پریشان کن امکانات کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ پاکستان ٹیلی ویژن نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے دورہ امریکہ کی تقریبات کو براہِ راست خلائی سیارے کے ذریعے ٹیلی کاسٹ کریں گے، خلائی سیارے کا ذکر میں نے کئی بار سنا ہے، اپنی توفیق کے مطابق اس کے بارے میں کچھ پڑھا بھی ہے لیکن اس کے باوجود خلائی سیارے کے ذریعے واشنگٹن اور نیو یارک سے براہ راست ٹیلی کاسٹ پروگرام کا تصور، ایک الف لیلوی افسانہ معلوم ہوتا تھا۔ شام کو لاہور ٹی وی سنٹر سے امریکہ کے صدر نکسن کی قیامگاہ وہائٹ ہاؤس میں وزیر اعظم کے استقبال کی روداد دیکھ کر واقعی میں الف لیلوی افسانے کا ایک کردار معلوم ہو رہا تھا۔ دوسرے دن نیو یارک کے پریس

کلب میں مسٹر بھٹو کی پریس کانفرنس براہِ راست خلائی سیارے کے ذریعے پاکستان کے تمام ٹی وی سنٹروں سے ٹیلی کاسٹ ہوگئی اور میں اپنے سونے کے کمرے میں حیرت و مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس طرح اس کانفرنس سے محظوظ ہوا کہ جیسے میں خود اس میں شریک تھا، دوسرے الفاظ میں جو کچھ ہم آج دیکھ رہے ہیں وہ ہم نے اپنے خوابوں میں نہیں دیکھا تھا اور اس لحاظ سے حقیقت خوابوں میں بھی آگے بڑھ گئی ہے اور میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ آئندہ چند برسوں میں زندگی کس رفتار سے بدل جائے گی۔ مجھے لگتا ہے کہ اگر ترقی کی یہی رفتار رہی تو دس برس بعد میرے بچے، مجھ جیسے ترقی پسند اور ماڈرن انسان کو دقیانوسی، قدامت پسند اور ماضی پرست بڈھا کہہ کر میرا مذاق اڑائیں گے۔ اس تصور سے بھی کوفت ہوتی ہے لیکن اس سے فرار کی کوئی گنجائش بھی نظر نہیں آتی۔ کمر توڑ گرانی، حد سے بڑھتی ہوئی رشوت ستانی اور چاروں طرف پھیلی ہوئی بے ایمانی کو نظر انداز کر کے آج میں نے جان بوجھ کر اظہارِ خیال کے لئے ایک ایسا موضوع منتخب کیا ہے کہ جس کا سیاست اور اقتصادیات سے کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے، اس سے میرا مقصد ٹی وی کی شکل میں جنم لیتی ہوئی اس نئی تہذیب کے خدو خال اُبھارنا ہے کہ جو آئندہ دس یا بیس برسوں میں پرانی تہذیب کی جگہ لے کر زندگی ، مذہب سیاست، صحافت اور شرافت کی نئی اقدار اور نئے معیار معین کرے گی۔ جو شخص اپنے گھر میں ایک ٹیلی ویژن سیٹ خرید کر لاتا ہے اُسے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہیے کہ وہ اپنے گھر میں کچھ نئی اقدار اور نئے نظریات بھی در آمد کرتا ہے۔ پرانے کپڑوں

اور کھپٹے پرانے جوتوں کی طرح اسے پرانے نظریات اور فرسودہ تصورات کو اپنے ذہن سے اتار کر پھینک دینا ہوگا۔ اسے ایک نئی دنیا کو سلام کرنا پڑے گی اور اس حقیقت کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑے گا کہ دنیا اس تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے کہ اس کا ساتھ دینے کے لئے تیز، بہت تیز دوڑنا پڑے گا اور جو لوگ ٹی وی کی نئی تہذیب سے بچنے کے لئے اپنے گھروں کو اس ''مصیبت'' سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں گے۔ ان کے بچے یا تو اپنے پڑوسیوں کے ہاں چوری چھپے ٹی وی دیکھنے جائیں گے۔ یا احساس کمتری کا شکار ہو کر اپنے والدین کی قدامت پسندی اور ذہنی پسماندگی کی یادگار بن کر رہ جائیں گے۔ آئندہ دس برسوں میں ٹی وی کی یلغار سے فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے اس مشین کا استقبال کر کے اسے اپنے قابو میں لانے کی کوشش کیجئے۔ یہ میرا مخلصانہ مشورہ ہے۔

۲۳/اکتوبر۱۹۷۳ء

ریاستی کانگریس کے لال بُجھکّڑ

پردیش کانگریس کی مجلسِ عاملہ کے تین روزہ اجلاس کے متعلق جو اطلاعات اخبارات میں شائع ہوئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مجلسِ عاملہ کے اکثر ممبروں کو ریاست میں کانگریس کی گھٹتی ہوئی قوت اور لٹتی ہوئی عزت سے سخت تشویش پیدا ہوگئی ہے اور وہ اس میں جان ڈالنے اور اسے ایک متحرک تنظیم بنانے کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ مجلس عاملہ کے ممبران کو اپنی جماعت کے ماضی اور مستقبل کے متعلق سوچنے اور پریشان ہونے کا حق حاصل ہے اور میں ان سے یہ حق چھیننا نہیں چاہتا۔ لیکن تین روزہ اجلاس کے دوران ممبروں کی سوچ اور ان کے استدلال کا جو خاکہ اُبھرا، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مریضوں کو اپنی اصل بیماری کا علم اور احساس ہی نہیں ہے اور وہ علامت اور اسباب میں فرق نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تشخیص، ان کا تجزیہ اور ان کی تجویزیں ایک ایسے نیم حکیم کا نسخہ معلوم ہوتی ہیں کہ جو بہرحال، خطرہ جان ہوتا ہے۔ مجلس عاملہ کے اکثر ممبران نے اپنی تقریروں میں وزیر اعلیٰ سید میر قاسم کی ''نرم روپالیسی'' کی تعریف کرتے ہوئے یہ اندیشہ

ظاہر کیا کہ اس پالیسی کے نتیجے میں کانگریس کی طاقت اور مقبولیت اتنی کم ہو جائے گی کہ ۱۹۷۶ء کے عام انتخابات میں کسی کانگریسی کا انتخاب جیتنا ناممکن ہوگا۔ ریاست کے سابق وزیر اعظم خواجہ شمس الدین، سابق وزیر صنعت پیر غیاث الدین، سابق وزیر مال مسٹر منوہر ناتھ کول، پارلیمنٹ کے ممبر اور وزیر اعلیٰ کے برادرِ اکبر سید حسین اور مرحوم خواجہ غلام محمد صادق کی ہمشیرہ زینب بیگم نے اپنی تقریروں میں شیخ صاحب کے ساتھ مفاہمت اور مصالحت کی پالیسی کا خیر مقدم کیا، لیکن ساتھ ہی یہ وارننگ بھی دی کہ شیخ صاحب کے ساتھ کسی قسم کا سمجھوتہ کانگریس کی قیمت پر نہیں ہونا چاہئے''۔ بعض ممبروں نے کھُل کر، اور کچھ نے دبی زبان میں اپنے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اگر نرم روی کی موجودہ پالیسی کو اسی طرح برقرار رکھا گیا تو آئیندہ انتخابات میں کانگریس کا وجود ختم ہو جائے گا۔ وزیر اعلیٰ سید میر قاسم نے شیخ صاحب کے تازہ رویے اور بدلے ہوئے سیاسی پس منظر کی نشان دہی کرتے ہوئے مجلس عاملہ کے ممبران کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ریاست میں کانگریس کے اقتدار سے زیادہ وہ اقدار اور اصول زیادہ اہم ہیں کہ جن کی خاطر ہم گزشتہ چالیس سال سے لڑتے آئے ہیں اور اگر شیخ صاحب کی قیادت میں ان اصولوں اور آدرشوں کو تقویت ملنے کا امکان پیدا ہو جائے تو اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ ہم اقتدار میں رہتے ہیں یا نہیں۔ وزیر اعلیٰ نے قدرے تفصیل کے ساتھ ان تجربات کا بھی ذکر کیا کہ جو گزشتہ پچیس برسوں کے دوران اس ریاست میں انتخابات جیتنے اور اقتدار حاصل کرنے کے لئے روا رکھے گئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی مجلس عاملہ کے

Release of
(COLLECTION
LATE
28th.

ممبران کو یہ بُری خبر بھی سنائی کہ ۱۹۷۶ء کے انتخابات میں اس قسم کے تجربات دہرانے کی اب کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ وزیر اعلیٰ کی وضاحت سے ممبران مجلس عاملہ کی تشفی ہونے کی بجائے ان کی تشویش میں اضافہ ہوگیا اور اکثر ممبروں نے ان پر بے اثر، بے عمل اور بے راہ رو ہونے کا الزام عاید کیا۔ اس ساری بحث کا لب لباب یہ نظر آتا ہے کہ کانگریس کے نام پر اقتدار و اختیار کے شیش محل میں بیٹھنے والے یہ لال بجھکڑ، ان تغیرات اور تصورات سے آنکھیں بند کرنا چاہتے ہیں کہ جن کی بناء پر سیاسیات کشمیر کے بنیادی مفروضات میں اہم تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مفادِ خصوصی کا یہ طبقہ جو اس ملک کی بدبختی کا عنوان بن کر گزشتہ پچیس سال سے ہم پر مسلط ہے، اپنی طبعی موت مرنے کی بجائے تاریخ کے بہاؤ کو بدلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کانگریس کی قوت اور مقبولیت کا ماتم کرنے والے یہ غم گسار کس کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں؟ کانگریس کے اصولوں کی دہائی دینے والے یہ ریا کار کس کی آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتے ہیں؟ نرم روی کی پالیسی کے یہ طرفدار، کس کو اپنی معصومیت کا یقین دلانا چاہتے ہیں؟ دنیا جانتی ہے کہ کانگریس اپنے جنم سے لے کر اب تک اس ریاست میں کبھی عوامی قوت کا سرچشمہ یا مقبولیت کا مرکز نہیں رہی ہے۔ اس کی گھٹتی ہوئی طاقت پر آنسو بہانے والے بھی اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ گزشتہ پچیس برسوں میں کسی حکمران جماعت کو اس ریاست میں عوامی اساس حاصل نہیں ہوئی اور نیشنل کانفرنس ہو یا نیشنل کانگریس، یہ دونوں جماعتیں عوام کے بجائے فوج اور پولیس کے سہارے اقتدار پر قابض رہی ہیں۔ اس

لئے کانگریس کے مستقبل، اس کی قوت اور اس کی اہمیت کے بارے میں ریاستی کانگریس کے ''شہ سواروں'' کو فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مرکزی حکومت اور حکمران جماعت کے فہمیدہ رہ نما پردیش کانگریس کی ''اوقات'' سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس لئے انہیں گھٹتی ہوئی قوت اور لٹتی ہوئی عزت کا واسطہ دے کر مرعوب نہیں کیا جا سکتا۔

ریاستی کانگریس کے بہت سے شیخ چلیوں کا خیال ہے کہ نرم روی کی پالیسی ایک خیرات ہے جو سستے چاولوں کی طرح حکومت اس ریاست کے عوام میں بانٹ رہی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ اپنے وجود کی تاریکیوں میں رہنے والے یہ اُلو اور ان کے پٹھے تاریخ کی روشنی میں آکر اپنی یہ غلط فہمی دور کر دیں۔ نرم روی کی یہ پالیسی نہ صادق صاحب مرحوم کا تحفہ ہے اور نہ قاسم صاحب کا عطیہ، یہ ریاستی عوام کی بے پناہ قربانیوں، ان کی جدوجہد ان کے عزم وایثار اور اُن تاریخی حقائق کی پیداوار ہے کہ جنہوں نے ظلم وتشدد، جبر وآمریت اور غنڈہ گردی کے فرعونوں اور چنگیزوں کو تخت سے اُتار کر تختے پر لٹکا دیا۔ ۱۹۶۳ء میں موئے مقدس کی گمشدگی کے بعد رونما ہونے والے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ تشدد، طاقت اور استبداد کی سیاست کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ خواجہ غلام محمد صادق بجائے خود اسی احساس کی پیداوار تھے، ورنہ لیجسلیچر میں اکثریت حاصل نہ ہونے کے باوجود وہ وزیر اعلیٰ نہیں بن سکتے تھے اور ۱۹۶۴ء سے اب تک جہلم میں اتنا پانی بہہ چکا ہے کہ آج اگر بخشی غلام محمد بھی دوبارہ جنم لے کر وزیر اعلیٰ ہو جائیں تو وہ بھی نرم روی کی پالیسی ترک کر کے اپنی پرانی روش نہیں اپنا سکتے۔ لیکن کانگریسی نیتاؤں

کی تقریروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ناکامیوں، محرومیوں اور نا مرادیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے نرم روی کی پالیسی کو ہدفِ ملامت بنا رہے ہیں۔ ان کے خیال میں شیخ محمد عبداللہ کے تئیں وزیر اعلیٰ کے معقول اور مودبانہ رویے نے ریاستی کانگریس کو کمزور بنادیا اور وہ بالواسطہ طور انہیں مشورہ دے رہے ہیں کہ نرم روی کی موجودہ پالیسی کو ترک کرکے بخشی غلام محمد کے آزمائے ہوئے نسخوں کو دوبارہ آزمانے سے ریاستی کانگریس کے مردے میں نئی روح پھونکی جاسکتی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ مشورہ دینے اور مطالبہ کرنے والوں میں پیر غیاث الدین، منوہر ناتھ کول، خواجہ شمس الدین اور زینب بیگم پیش پیش ہیں۔ ان میں سے پیر صاحب اور کول صاحب تو ۱۹۷۲ء کے عام انتخابات میں اپنی ضمانتیں ضبط کروا چکے ہیں اور خواجہ شمس الدین اسلام کے نام پر ووٹ مانگ کر کامیاب ہوئے ہیں۔۔ جہاں تک زینب بیگم کا تعلق ہے مجھے افسوس ہے کہ وہ شیخ صاحب کے ساتھ مکالمے اور مفاہمت کی مخالفت کرکے اپنے مرحوم بھائی کی روح کو تکلیف پہنچا رہی ہیں۔ کیونکہ مجھے ذاتی طور پر اس بات کا علم ہے کہ مرحوم صادق شیخ صاحب کو قومی زندگی کے دھارے میں شامل کرنے کے لئے کتنے بے چین اور بیتاب تھے۔

کانگریس کے نام پر اپنی سیاسی دکان چلانے والے تاجروں کی پریشانی اور بدحواسی اس لحاظ سے قابل رحم ہے کہ ۱۹۷۶ء کے انتخابات میں انہیں اپنی کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور وہ ابھی سے ایسے حالات پیدا کرنے کے لئے کوشاں ہیں کہ جن میں فوج اور پولیس کے سہارے انتخابات میں کامیابی حاصل کرنا یقینی بن جائے۔ اس لئے وہ

حالات پیدا کرنے کے لئے کوشاں ہیں کہ جن میں فوج اور پولیس کے سہارے انتخابات میں کامیابی حاصل کرنا یقینی بن جائے۔ اس لئے وہ ریاست کے صحت مند سیاسی ماحول میں تشویش، تشکیک اور افراتفری کے بیج بونے کے درپے ہیں اور اس مقصد کے لئے انہوں نے کانگریس کی دہائی دینا شروع کر دی ہے۔ ان کے خیال میں اپنے ذاتی مفادات کے تحفظ کا اس سے بہتر اور مؤثر کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔ یہ لوگ جو اپنی نااہلیت، بدکرداری اور بددیانتی کے سہارے پچھلے بیس سال سے اقتدار پر قبضہ جمائے ہوئے ہیں، کسی قیمت پر اپنے خصوصی مفادات سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ چاہے ایسا کرنے میں ملک کی عزت وآبرو، سالمیت اور وحدت ہی کو خطرہ کیوں نہ لاحق ہو، ان لال بجھکڑوں میں سیاسی بصیرت ہوتی تو وہ آئیندہ انتخابات میں اپنی کامیابی کی ضمانت چاہنے کے بجائے شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ مفاہمت اور مصالحت کی دور اندیشانہ پالیسی کا خیر مقدم کرتے، لیکن جن لوگوں کو اقتدار کی ہڈیوں کی چاٹ پڑ جائے ان سے بلند نظری، وسیع القلبی اور ایثار کا مطالبہ کرنا فضول ہے۔ مرکزی حکومت کے رہنماؤں کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ اس ریاست کے مستقبل کو چند طالع آزما ابن الوقت سیاسی سوداگروں کے مستقبل کے ساتھ وابستہ کر کے تاریخی تقاضوں کو نظرانداز کریں گے یا ماضی کے تلخ تجربات سے فائدہ اُٹھا کر ریاست کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کریں گے؟ وہ چند بے ساکھ اور بے ضمیر شعبدہ بازوں کو اقتدار کے مسند پر بٹھانے کے لئے اس ریاست کے چالیس لاکھ عوام سے غدّاری کریں گے یا نوشتۂ دیوار پڑھکر اس

ریاست کے مستند اور معتبر رہنماؤں کے ساتھ کوئی باعزت اور اُبرو مندانہ سمجھوتہ کرنے کی اپنی کوششیں جاری رکھیں گے؟

ان سوالات کے جوابات پر اس ریاست ہی میں نہیں سارے ملک میں جمہوریت کے مستقبل کا دارومدار ہے اور جہاں تک مجلس عاملہ کے ''ذی عزت'' ممبران کے شور وغل کا تعلق ہے اسے مرتے ہوئے سامراج کی آخری ہچکی سمجھنا غلط نہیں ہوگا۔

۲۳/ مئی ۱۹۷۴ء

’’خصوصی حیثیت‘‘ کی اصلیت

۱۴ مئی کو دارالخلافہ دہلی سے شائع ہونے والے ایک موقر انگریزی روزنامے ’’ہندوستان ٹائمز‘‘ نے صفحہ اول پر جلی حروف میں یہ خبر شائع کی، کہ آج سے کشمیر کا خصوصی درجہ ختم ہو گیا ہے۔ خبر کی سرخی دیکھ کر میں لمحے بھر کے لئے چونک گیا، لیکن اس کے نیچے دی ہوئی تفصیل پڑھکر نامہ نگار کی لاعلمی اور سُرخی کا انتخاب کرنے والے سب ایڈیٹر کی جہالت پر بے حد غصہ آیا۔ کچھ دیر بعد پارلیمنٹ کے سنٹرل ہال میں جب بہت سے سرکردہ صحافیوں اور ممبران پارلیمنٹ نے مجھ سے اس خبر کے بارے میں استفسار کیا، تو مجھے اندازہ ہوا کہ غلط فہمی اور لاعلمی کے اس اندھیرے میں ہندوستان ٹائمز کا نامہ نگار اور اس کا سب ایڈیٹر تنہا نہیں ہیں، بلکہ اکثر صحافی اور ممبران پارلیمنٹ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ ۱۴ مئی ۱۹۵۴ء کو صادر ہونے والے صدارتی فرمان کی رو سے کشمیری عوام کو وہ خصوصی مراعات حاصل ہیں کہ جن سے ملک کے دوسرے حصوں میں رہنے والے شہری محروم ہیں۔ دوسرے روز جب تقریباً سبھی اخبارات نے نمایاں طور پر یہ خبر شائع کر دی کہ کشمیر کے خصوصی درجے میں مزید پانچ سال کی توسیع کر دی گئی ہے تو میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ اس ملک کے اخبارنویس جاہل ہیں، ستم ظریف ہیں یا

اذیت پسند؟ اور پھر جب بھارتیہ جن سنگھ کے ایک مہان نیتا اور پارلیمنٹ کے ممبر شری پرکاش ویر شاستری نے اس توسیع پر کچھ اس انداز سے نکتہ چینی کی کہ جیسے ہندوستان کی مرکزی حکومت نے صدارتی فرمان کی تجدید کر کے ریاستی عوام پر کوئی بہت بڑا احسان کیا ہو، تو میں اس الجھن میں پڑ گیا کہ جس ملک کے ممبران پارلیمنٹ اس درجہ جاہل اور بے علم ہوں، وہاں کے اخبار نویسوں کو دوش دینا مناسب ہے یا نہیں؟ مجھے تعجب اس بات کا ہے کہ ریاست سے شائع ہونے والے درجنوں اخبارات نے بھی ۱۴ مئی کو صادر ہونے والے صدارتی فرمان کو مراعات سے تعبیر کر کے اس خبر کی تشہیر کی کہ ریاست جموں وکشمیر کو مزید پانچ سال کے لئے ''امتیازی شان'' عطا کر دی گئی ہے یہ ستم ظریفی کی انتہا ہے یا تجاہل مجرمانہ، آپ خود ہی فیصلہ کیجئے!

آئین کی دفعہ ۳۷۰ کی رُو سے اس ریاست کو جو خصوصی درجہ اور مراعات حاصل ہیں، ان میں ریاست کے لئے ایک الگ آئین، ایک الگ جھنڈے اور اپنے لئے ایک صدر ریاست منتخب کرنے کا حق شامل ہے اس دفعہ کے تحت پارلیمنٹ کے پاس کردہ قوانین کو ریاست پر لاگو کیا جاسکتا ہے اور صدارتی احکامات جاری کئے جاسکتے ہیں۔ ریاست کی اس ''خصوصی حیثیت'' کے خلاف ملک کی فرقہ پرست اور رجعت پسند طاقتوں نے اس وقت سے احتجاج اور واویلا شروع کیا تھا کہ جب ہندوستان کے آئین میں دفعہ ۳۷۰ شامل کر لی گئی تھی۔ یہ لوگ جب سے اب تک برابر چیخ رہے ہیں اور مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ ان کی چیخ وپکار رائیگاں نہیں گئی ہے اور گزشتہ بیس بائیس سال کے دوران

ہندوستان کے آئین، کشمیری عوام سے کئے گئے وعدوں اور کشمیری رہنماؤں سے کئے گئے معاہدوں کو بالائے طاق رکھ کر ریاست کی خصوصی حیثیت کو ختم کرنے میں کافی پیش رفت ہوئی ہے اور بہت سے مرکزی لیڈروں نے پارلیمنٹ میں کھل کر اس بات کا اعلان کیا ہے کہ وہ دفعہ ۳۷۰ کو منسوخ کرنے کی بجائے اسے اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر رہے ہیں۔ بہر کیف! میں اس وقت ریاست کی ''خصوصی حیثیت'' کے جواز یا عدم جواز پر بحث نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس صدارتی فرمان کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ جسے ستم ظریفوں نے کشمیر کے خصوصی درجے اور کشمیر عوام پر مرکزی حکومت کے ''احسان عظیم'' سے تعبیر کیا ہے تاکہ دنیا کو معلوم ہو کہ کشمیری عوام ہندوستانی جمہوریت کے فیض و بابرکات سے کس طرح مستفید ہو رہے ہیں!

آئین کی دفعہ ۳۷۰ کی رُو سے ریاست جموں و کشمیر پر صرف دو دفعات کا اطلاق براہِ راست ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ا دوم دفعہ ۳۷۰۔ آئین کی باقی دفعات ریاست جموں و کشمیر پر ایک خصوصی صدارتی حکم کے ذریعے ہی لاگو کی جاسکتی ہیں اور انکے اطلاق پر صدر کو بعض حالات میں ترمیم و اضافے کا حق حاصل ہے۔ اگست ۱۹۵۳ء سے پہلے آئین ہند کے باب سوئم میں شامل بنیادی حقوق کا کشمیر پر اطلاق نہیں ہوتا تھا اور ہمارے بہت سے خیر خواہ ہماری اس محرومی پر گریہ زاری کرتے تھے۔ اگست ۱۹۵۳ء کے بعد جب کشمیر کو ہندوستان کے ''بہت قریب'' کر دینے کا عمل پورے زور وشور سے شروع ہو گیا تو ہمارے خیر خواہوں اور بدخواہوں، دونوں نے بنیادی حقوق کو کشمیر پر لاگو کر دینے کا مطالبہ بھی

کر دیا اور پھر ۱۴ مئی ۱۹۵۴ء کو صدر جمہوریہ ہند نے ایک صدارتی حکم نامے کے ذریعے ہندوستانی آئین میں محفوظ اور مندرجہ بنیادی قوانین کو ریاست پر لاگو کر دیا۔ بظاہر یہ ایک بہت بڑا ترقی پسندانہ قدم تھا اور ریاست کی کٹھ پتلی حکومت اور مرکزی حکومت دونوں ہی نے اس جمہورنواز فیصلے پر خوب داد وصول کی۔ ساری دنیا میں اس بات کا چرچا ہوا کہ شیخ محمد عبداللہ کی حکومت نے کشمیری عوام کو جن بنیادی حقوق سے محروم رکھا تھا مرکزی حکومت نے بڑی سخاوت اور شجاعت کا ثبوت دے کر کشمیری عوام پر ان بنیادی حقوق کے دروازے کھول دیئے ہیں اور اب اس ریاست میں قانون کی عملداری اور انصاف کا دور دورہ ہے۔ یہ اس پروپگنڈے، غلط بیانی اور ریاکاری کا ہی نتیجہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو اس انقلابی قدم اور جمہوری فیصلے کی حقیقت تک پہونچنے کا موقع ہی نہیں ملا اور آج بھی اکثر لوگ اس فریب میں مبتلا ہیں کہ ۱۴ مئی ۱۹۵۴ء کا صدارتی حکم کشمیر کے خصوصی درجے کی توسیع کرتا ہے جب کہ حقیقت میں یہ صدارتی حکم ایک ہاتھ سے دئے گئے بنیادی حقوق کو دوسرے ہاتھ سے چھیننے کی عیارانہ حکمت عملی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور اس حکم نامے کا بغور مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوگا کہ مرکزی حکومت ریاست میں جمہوریت اور بنیادی حقوق کی بحالی کے مسلئے میں کبھی نیک نیت نہیں رہی ہے۔

آئین کی دفعہ ۱۹ کی رو سے ہندوستان کے شہریوں کو تحریر وتقریر، پر امن اجتماع، نقل وحرکت، حصول جائداد اور کاروبار کے بنیادی حقوق عطا کر دیئے گئے ہیں، لیکن یہ تمام حقوق کچھ معقول پابندیوں کے تابع ہیں

اور ان پابندیوں کی بنیاد کیا ہونی چاہیئے اس کی وضاحت بھی اس دفعہ میں کی گئی ہے۔ بنیادی حقوق پر عائد شدہ پابندی معقول ہے یا نہیں یہ فیصلہ کرنے کا اختیار حکومت کی بجائے عدالتوں کو دیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے آئینی مقدمات میں عدالتوں نے حکومت کی طرف سے عائد شدہ پابندیوں کو نا معقول اور نا مناسب قرار دے کر شہریوں کے بنیادی حقوق بحال کر دیئے۔ اب اس پس منظر میں ۱۴ مئی کے صدارتی حکم نامے کو دیکھئے تو مرکزی حکومت کی بدنیتی اور ریاستی حکومت کی بدکرداری کا اندازہ ہو جائیگا۔ اس حکم کی رُو سے دفعہ 19 کا اطلاق تو ریاست پر ہوتا ہے لیکن صدر نے ترمیم واضافے کے اپنے حقوق کا استعمال کرتے ہوئے یہ فرمان جاری کر دیا کہ جہاں تک ریاست جموں وکشمیر کا تعلق ہے بنیادی حقوق پر حکومت کی طرف سے عائد کی جانے والے پابندیوں کی معقولیت یا عدم معقولیت کا فیصلہ عدالتیں نہیں بلکہ ریاست کا قانون سازیہ کرے گا۔ یعنی پورے ملک بھر میں صرف کشمیر کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں حکومت کی بدعنوانیوں اور بدکرداریوں کا محاسبہ عدالتیں نہیں، خود حکومت ہی کرے گی۔ اس ترمیم کی رُو سے اگر ریاستی قانون سازیہ یہ فیصلہ کرے کہ وزیر اعلیٰ پر تنقید کرنے والے صحافی کو بلا ضمانت گرفتار کر کے پانچ سال کے لئے نظر بند کیا جاسکتا ہے تو اس ملک کی عدالتوں کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ اس پابندی کو نامعقول اور جاہلانہ قرار دے کر صحافی کے بنیادی حقوق کا تحفظ کرے۔ ۱۴ مئی ۱۹۷۴ء کو اس بہیمانہ حکم کی توسیع کو ملک کے سرکردہ صحافیوں اور ممبران پارلیمنٹ نے خصوصی مراعات کا نام دے کر ہمارے زخموں پر

نمک چھڑکا ہے۔

اس حکم نامے کی رو سے ایک اور بنیادی حق دفعہ ۲۲ کو بھی اس ریاست پر لاگو کیا گیا ہے۔ لیکن کچھ اس انداز سے کہ اس کے اطلاق سے بنیادی حقوق کا تحفظ ہونے کے بجائے سرکاری غنڈہ گردی اور دہشت پسندی کو تقویت مل گئی ہے۔ دفعہ ۳۵ میں ایک نئے کلاز کا اضافہ کر کے یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ جموں و کشمیر میں احتیاطی نظر بندی کا کوئی قانون اس بناء پر ناجائز قرار نہیں پائے گا کہ یہ آئین کے باب سوئم میں درج بنیادی حقوق کے منافی ہے۔ یعنی اگر ریاستی حکومت شہریوں کو نظر بند کرنے کے لئے کوئی وحشیانہ سے وحشیانہ قانون بنائے اور اس قانون سے تمام بنیادی حقوق کی تکذیب اور توہین ہوتی ہو، تو ملک کی عدلیہ کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ اس قانون کو بنیادی حقوق کے منافی قرار دے کر رد کر دے۔ کشمیری عوام کے حال زار پر رحم کھا کر صدر جمہوریہ نے صرف یہ مہربانی کی ہے کہ اس قسم کے وحشیانہ اور بہیمانہ قانون کے لئے صرف پانچ سال کی میعاد مقرر کی ہے۔ یعنی پانچ سال کے بعد بنیادی حقوق کے منافی احتیاطی نظر بندی کا قانون ختم ہو جائے گا۔ یہ الگ سوال ہے کہ ریاستی حکومت کو پانچ سال کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی اس قانون کی میعاد میں مزید اضافے کا حق حاصل ہوگا اور ہماری بدکردار حکومت اس حق کا پچھلے بیس برسوں سے فراخدلانہ استعمال کرتی آئی ہے۔

۱۴ مئی ۱۹۵۴ء کے صدارتی حکم میں بنیادی حقوق پر ان پابندیوں کی میعاد پانچ سال قرار پائی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۴ء اور

۱۹۶۹ء میں نئے صدارتی فرمانوں کے ذریعے ان پابندیوں میں مزید پانچ پانچ سال کی توسیع ہوتی رہی۔ ۱۴مئی ۱۹۷۴ء کو ۱۹۶۹ء میں کی گئی توسیع کے پانچ سال ختم ہو گئے اورتوقع یہ تھی کہ ریاست میں بدلے ہوئے خوشگوار ماحول اور سیاسی سطح پر امید افزا اور خوش کُن امکانات کے پیشِ نظر کشمیری عوام کے بنیادی حقوق پر عائید شدہ یہ پابندیاں اب ختم ہو جائیں گی اور اس منحوس اور جمہور کُش صدارتی حکم کی میعاد میں توسیع نہیں ہوگی کہ جس نے گزشتہ بیس سال سے اس ریاست کو ایک وسیع زنداں خانے میں تبدیل کئے جانے کا آئینی جواز فراہم کیا ہے۔ حیرت اس بات کی ہے کہ وزیر اعلیٰ سید میر قاسم جو اپنے آپ کو جمہوریت، انصاف اور لبرلائزیشن کا علمبردار کہلانے پر مُصر ہیں، نے ایک ایسے وقت پر ان پابندیوں کی میعاد میں توسیع کا مطالبہ کیا ہے کہ جب ریاست کا سیاسی ماحول ہر لحاظ سے اطمینان بخش ہے۔ مرکزی حکومت اور ریاستی حکومت کی اس نئی جارجیت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سیاسی ماحول میں خوشگوار تبدیلیوں کے باوجود حکمرانوں کی نیت نہیں بدلی ہے اور وہ کشمیر پر ایک نوآبادی ہی کی طرح راج کرنا چاہتے ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ بہت سے لوگ ان آہنی زنجیروں کو خصوصی مراعات کا نام دے کر ہمارے زخموں پر نمک چھڑکتے رہتے ہیں۔ اگر ''خصوصی حیثیت'' کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس ریاست کے عوام کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا جائے، تو پھر اس امتیاز کو جتنی جلد ختم کیا جاسکتا ہے، ختم کیا جانا چاہیئے۔ ❁❁❁❁

۲۳/ جولائی ۱۹۷۳ء

صبح ہونے لگی

کشمیر کی ۲۷ سالہ سیاسی الجھن کو تسلی بخش طریقے پر حل کرنے کی کوششیں اب ایک ایسے فیصلہ کُن مرحلے میں داخل ہوگئی ہیں کہ جہاں قانونی موشگافیوں اور آئینی باریکیوں سے زیادہ باہمی اعتماد اور اعتبارات کو اہمیت حاصل ہے۔ مرزا محمد افضل بیگ اور مسٹر پارتھا سارتھی کی صبر آزما اور طویل ملاقاتوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ اس وقت سارا ملک ذہنی اور نفسیاتی طور پر کشمیر میں مجوزہ اور متوقع سیاسی تبدیلیوں کا منتظر ہے اور بات چیت کی موجودہ رفتار سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اختلافات اور بدظنی کی خلیج روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ مسائل کی پیچیدگی اور بیس بائیس برس کی باہمی بے اعتمادی کے حوصلہ شکن ماحول کو ذہن میں رکھتے ہوئے مفاہمت، رواداری اور خیر سگالی کی موجودہ فضا توقعات سے بھی زیادہ پُر امید اور حوصلہ افزا ہے اور میرا خیال ہے کہ اگر نزاعی مسائل اور اختلافی امور کے متعلق ایک دوسرے کے نکتۂ نگاہ کو سمجھنے کی کوشش، ایک دوسرے کی مشکلات اور مجبوریوں کو زیر نظر رکھنے کی روش اور ہر قیمت پر مفاہمت کے موجودہ ماحول کو برقرار رکھنے کی خواہش اسی طرح قائم رہی، تو کشمیر میں بنیادی نوعیت کی سیاسی تبدیلیوں کا عمل شروع ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ لیکن میں اس مرحلے پر اپنے قارئین کو اس انگریزی مقولے کی بھی یاد دلانا چاہوں گا

کہ جس کے معنی یہ ہیں، کہ چائے کی پیالی اور ہونٹوں کے درمیان بھی کئی نازک مقام آتے ہیں۔ بیگ صاحب اور مسٹر پارتھا سارتھی کو بھی ابھی کچھ نازک مقامات سے گزرنا ہے اور جب تک یہ مرحلے بالکل طے نہ ہوں، ہم محتاط طریقے پر اپنی امید، اپنے اعتقاد اور ایقان کا اظہار کرنے پر ہی اکتفا کریں گے۔

مذاکرات کی غیر معمولی سیاسی اہمیت اور معاملات کی نزاکت کے پیش نظر اس مرحلے پر یہ ظاہر کرنا ممکن نہیں کہ کون سے امور پر تصفیہ ہو چکا ہے اور کون سے مسائل ابھی حل طلب ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں اس حد تک اپنے قارئین کو اپنے علم اور اپنی بصیرت میں شریک کر سکتا ہوں کہ اب ایسا کوئی مسلہ باقی نہیں رہا ہے کہ جس پر بات چیت کے ٹوٹ جانے یا کوئی غیر معمولی اڑچن پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ اگر چہ بعض باتوں پر افہام وتفہیم کی گنجائش اب بھی موجود ہے لیکن بنیادی اہمیت کی بات یہ ہے کہ شیخ صاحب اور مسز اندرا گاندھی کے درمیان باہمی اعتماد اور اعتبار کے علاوہ ایک نظریاتی ہم آہنگی بھی پیدا ہوگئی ہے اور دونوں رہنماؤں کو اس بات کا احساس ہے کہ نئے ہندوستان کی تعمیر میں وہ ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کام کر سکتے ہیں۔ ملک کی موجودہ سیاسی بے اطمینانی اور بے چینی کے پیش نظر یہ مفاہمت ایک نیک شگون اور خوش گوار مستقبل کی علامت ہے اور اس اعتبار سے کشمیر کا سیاسی استحکام پورے ملک کی سیاست کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ ملک کی تمام ترقی پسند سیاسی جماعتوں نے شیخ محمد عبداللہ اور مرکزی حکومت کے درمیان موجودہ بات چیت کا خیر مقدم کیا ہے۔

اس وقت جبکہ مرکز کے ساتھ ریاست کے تعلقات کی نوعیت اور حدود مقرر کرنے کی بات چیت اپنے آخری مراحل سے گزر رہی ہے، پاکستانی حکمرانوں، ہندوستانی فرقہ پرستوں اور ریاست کے مفاد خصوصی کی آواز اور ان کے احتجاج میں ایک حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہ سبھی عناصر مختلف وجوہات کی بناء پر کشمیر میں سیاسی استحکام پیدا ہونے کے امکانات سے پریشان اور بدحواس ہیں۔ پاکستان کو اس بات کا یقین ہے کہ شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت کے بعد کشمیر کے مسئلے میں اس کی بچی کچھی اخلاقی حیثیت ختم ہو جائے گی اور انتہائی بدحواسی کے عالم میں پاکستان کے حکمرانوں، پریس اور ریڈیو نے شیخ صاحب کے خلاف دشنام طرازی اور یادہ گوئی کی ایک نئی مہم شروع کر دی ہے۔ پاکستان کے ارباب اقتدار کی پریشانی قابل فہم ہے اور انہیں معاف کیا جانا چاہئے۔ اس کے برعکس ملک کی فرقہ پرست قوتوں اور ریاست کے مفاد خصوصی کا اشتراک ایک ایسے خطرے کی نشان دہی کرتا ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان عناصر نے ریاست کے اندر اور باہر موجودہ خوشگوار ماحول کو زہر آلودہ بنانے کے لئے اپنی سرگرمیاں تیز کر دی ہیں اور اندازہ ہے کہ جوں جوں مفاہمت کے امکانات روشن تر ہوتے جائیں گے تاریکی کے تاجروں کی ریشہ دوانیاں بھی بڑھتی جائیں گی۔ جن سنگھ، جماعت اسلامی اور مولانا فاروق کا موجودہ اشتراک اور اتحادِ عمل اسی خطرناک منصوبے کا ایک حصہ ہے اور ملک کی ترقی پسند قوتوں کو متحد ہو کر اس ناپاک گٹھ جوڑ کو ناکام بنانے کی جدوجہد کرنا پڑے گی۔ سرینگر کے چند محلوں تک محدود آل جموں وکشمیر عوامی ایکشن

کمیٹی کے چیئر مین مولوی فاروق نے جس شدت اور جرأت کے ساتھ پاکستان کی وکالت کا بیڑا اٹھایا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان نے اپنے مقامی ایجنٹوں کے ساتھ اپنا تباہ شدہ مواصلاتی نظام پھر بحال کر دیا ہے اور مولوی صاحب کو تازہ کمک ملنا شروع ہو گئی ہے۔ مولوی صاحب کے ذہنی افق کو وسیع کرنے اور پاکستان کے اندرونی حالات سے براہِ راست روشناس کرنے کے لئے انہیں ایک بار، صرف ایک بار پاکستان بھیجنا چاہیئے، تاکہ وکیل صاحب کو اپنے موکل کی حالت، ہئیت اور صحت کا اندازہ ہو جائے۔ مجھے امید ہے کہ پاکستان میں مقیم اپنے عزیز واقارب سے مل کر ان کا ذہنی توازن اور جسمانی صحت، دونوں ہی بحال ہو جائیں گے۔ مولوی صاحب کے اس سفر میں اگر جماعت اسلامی کے کچھ مُلاّ بھی شریک ہوں، تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کیوں کہ ہندوستانی آئین کی وفاداری کا حلف اٹھانے والے یہ مولوی بھی ہندوستانی ''جہنم'' سے گھبرا کر پاکستانی ''جنت'' کا نظارہ کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ جہاں تک جن سنگھ اور اس کے حلیف عناصر کے شور وغوغا کا تعلق ہے، ہم اس کے اس درجہ عادی ہو گئے ہیں کہ اگر یہ لوگ اپنا شور شرابا بند کر دیں تو بازار سیاست کی رونق کچھ کم ہو جائے گی۔ ان تمام عناصر کے عمل اور ردِ عمل کو ذہن میں رکھتے ہوئے مرکزی لیڈروں اور شیخ محمد عبداللہ کو بڑی یکسوئی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھنا ہو گا۔ مسز اندرا گاندھی کو یہ بات ذہن نشین کرنا ہو گی کہ کشمیر کی موجودہ سیاسی الجھن کا باوقار حل نہ صرف ان کے اپنے وقار کو بلند کرے گا بلکہ ان کی سیاسی طاقت میں بھی غیر معمولی اضافے کا باعث بنے گا۔ ان کے

سامنے صرف یہ مقصد ہونا چاہئے کہ کشمیر نہ صرف جغرافیائی اعتبار سے ہندوستان کا ایک حصہ بنا رہے بلکہ نظریات اور نصب العین کی وہ بنیاد بھی مضبوط ہو جائے کہ جس پر ہندوستان اور کشمیر کے تعلقات کی عمارت قائم ہے۔ گزشتہ ۲۷ برسوں کے دوران اس عمارت کو بُری طرح مجروح کیا گیا ہے اور اس کی دیواروں میں بڑے بڑے سوراخ پیدا ہو گئے ہیں یہ صورت حال اگر زیادہ دیر تک قائم رہی تو عمارت کو نا قابل تلافی نقصان پہونچنے کا احتمال ہے۔ اس لئے مزید تاخیر کے بغیر ٹوٹی ہوئی دیواروں اور ٹپکتی ہوئی چھتوں کی مرمت کا کام شروع ہو جانا چاہئے۔ کشمیر کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے کی وزیر اعظم کی خواہش یقیناً اس احساس کا نتیجہ ہے اور یہ بات ان کے حق میں کہی جاسکتی ہے کہ وہ نا مساعد موسمی حالات کے باوجود بڑی تن وہی کے ساتھ اس مقصد کی تکمیل میں لگی ہوئی ہیں اور بیگ پارتھا سارتھی بات چیت کی حوصلہ افزا رفتار ان کے خلوصِ نیت کی آئینہ دار ہے۔

شیخ محمد عبداللہ بجا طور پر مرکزی حکومت سے زیادہ سے زیادہ رعائتیں اور ضمانتیں حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ وہ اپنے گزشتہ تجربات اور ۱۹۵۳ء کے حادثات کی روشنی میں کوئی ایسا انتظام چاہتے ہیں کہ جس سے ریاست کی اندرونی خودمختاری پر آنچ نہ آنے پائے۔ وہ اس بات کے لئے کوشاں ہیں کہ انہیں کوئی ایسی ضمانت اور یقین دہانی مل جائے کہ جس کے بعد ۱۹۵۳ء کے واقعات کا اعادہ ناممکن بن جائے۔ وہ ریاستی عوام کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص اس بات کا اطمینان دلانا چاہتے ہیں کہ ریاست جموں و کشمیر ہندوستانی فیڈریشن کے

سمندر میں شامل ہونے کے باوجود اپنی انفرادیت برقرار رکھ سکے گی۔ وہ ماضی کی روشنی میں مستقبل کا تحفظ چاہتے ہیں اور اسی لئے وہ ۱۹۵۳ء کی آئینی حیثیت کو بحال کرئے جانے پر اصرار کر رہے ہیں۔ مجھے اصولی اور اخلاقی طور ان کے موقف اور استدلال سے مکمل اتفاق ہے لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مجھے آئینی ضمانتوں اور یقین دہانیوں پر کوئی اعتبار نہیں اور میری نگاہوں میں کاغذی معاہدوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس بات کا امکان ہے کہ شیخ صاحب کو ہر وہ ضمانت اور رعایت مل جائے کہ جس کا وہ مطالبہ کریں۔ لیکن ان ضمانتوں اور رعائتوں کو مستقل اور مستحکم بنانے کے لئے کاغذی معاہدوں سے زیادہ باہمی اعتماد اور نیک نیتی کا ہونا ضروری ہے۔ ۱۹۵۳ء میں ہمارے پاس آئینی ضمانتیں بھی تھیں اور قانونی تحفظ بھی لیکن باہمی اعتماد واعتبار کی وہ فضا ختم ہو گئی تھی کہ جس نے ۱۹۴۷ء میں کشمیری عوام کو پاکستانی حملہ آوروں کے خلاف صف آراء کر کے ہندوستان کے ساتھ اپنا ناطہ جوڑنے کی تحریک دی تھی۔ اس لئے آئینی تحفظات کے باوجود ہماری آزادی اور خود مختاری پر حملہ ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ ہم نے ہندوستانی عوام کی بجائے ہندوستانی آئین کو اپنا محافظ سمجھ لیا تھا جبکہ آئین اپنے تقدس اور طاقت کے باوجود ایک کاغذی دستاویز ہے۔ اس لئے یہ کاغذی دستور ہماری کوئی مدد نہیں کر سکا۔ اب کی بار ہمیں کتاب سے زیادہ اہل کتاب کے ساتھ اپنا تعلق قائم کرنا چاہیئے۔ یعنی آئین سے زیادہ عوام پر وشواس رکھنا ہوگا اور یہی ہمارے حقوق اور ہماری مراعات کی سب سے مستحکم ضمانت ہوگی۔ ہمیں ہندوستانی حکمرانوں کی بجائے ہندوستان کے عوام سے اپنا رابطہ قائم کرنا

ہوگا اور پھر ہندوستان کی کوئی حکومت ہمارے حقوق کو پامال کرنے کی ہمت نہیں کرسکتی۔ مطلب یہ کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ آئینی ضمانتیں اور قانونی تحفظات حاصل کرنے کی کوشش تو کرنا چاہئے لیکن ایسا کرتے ہوئے ہندوستانی عوام کے اعتماد اور اعتقاد کو دھچکا نہیں پہنچانا چاہئے کیونکہ ان آئینی ضمانتوں کو جب تک عوام کی طاقت اور حمایت حاصل نہ ہو، یہ محض کاغذ کے پُرزے ہیں۔ اس لئے میں شیخ صاحب کو یہ مشورہ دینا چاہوں گا کہ وہ ہیئت سے زیادہ مواد اور الفاظ سے زیادہ معانی پر زور دیں اور ریاستی عوام کے وقار کی بحالی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی عوام کے اعتبار کو بھی بحال کرنے کی کوشش کریں۔ گزشتہ دو سال کے دوران انہوں نے ہندوستان کے لوگوں کے دلوں میں ایک بار پھر اپنے لئے عزت ومحبت کی جگہ بنالی ہے اور یہ عزت ومحبت ان آئینی تحفظات سے کہیں بڑھ کر ہے کہ جن کے حصول کے لئے وہ آجکل کوشاں ہیں۔ انہیں کاغذی معاہدوں کی بجائے دائمی قدروں اور جذباتی رشتوں کو مضبوط بنانے کی کوشش کرنا چاہئے اور مجھے یقین ہے کہ ماضی کے تلخ تجربات ان کی فکر کو محدود کرنے کی بجائے انہیں نئی بصیرت عطا کریں گے۔ اب جبکہ ایک نئی صبح کے آثار نمودار ہونے لگے ہیں، ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی رعائتوں کی بجائے بڑے بڑے مقاصد کے حصول کے لئے جدوجہد کریں کیونکہ ایسا لگتا ہے کہ نئی صبح کے طلوع ہونے میں اب زیادہ دیر باقی نہیں ہے۔

❁❁❁

۱۵/اگست ۱۹۷۴ء

ایک اہم تاریخی اجتماع

جموں اور لداخ کے سیاسی رہنماؤں، سماجی کارکنوں، سرکردہ صحافیوں اور دانشوروں کا سہ روزہ کنونشن جو مجاہد منزل سرینگر میں ۱۱، ۱۲، ۱۳/اگست کو منعقد ہوا، اپنی نوعیت کا پہلا اجتماع تھا، اسکا اہتمام شیخ محمد عبداللہ اور انتظام محاذ رائے شماری نے کیا تھا اور اس کی غیر معمولی کامیابی نے یقیناً شیخ صاحب کے سیاسی وقار میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ ان کی دعوت پر لداخ اور جموں کے دور افتادہ علاقوں سے آئے ہوئے مندوبین نے ایک جگہ جمع ہو کر اس بات کی تصدیق کر لی کہ ریاست کی سیاسی زندگی میں شیخ محمد عبداللہ آج بھی سب سے اہم شخصیت اور جاندار علامت ہیں اور وہ لوگ بھی کہ جو ان کے سیاسی نظریات سے مکمل اتفاق نہیں کرتے، ان کی عظمت اور اہمیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔ اس اعتبار سے اس سہ روزہ کنونشن کو شیخ صاحب کی ذاتی فتح اور ان کی قیادت کی ہمہ گیری سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

اس کنونشن میں جن سنگھ کے سِوا جموں اور لداخ کے ہر مکتب فکر کے نمائندوں کو مدعو کیا گیا تھا اور اس کا مقصد شیخ صاحب کے اپنے الفاظ میں کشمیر کے سیاسی اور آئینی مسائل کے متعلق مرکزی رہنماؤں سے ہمارے مذاکرات میں جموں اور لداخ کے دوستوں سے صلاح و

مشورہ کرنا تھا۔ جن سنگھ کے نمائندوں کو صلاح ومشورے کے اس سنجیدہ عمل میں شامل نہ کرنا ظاہر کرتا ہے کہ کنونشن کا مقصد کھلے دل اور خلوص نیت کے ساتھ ریاست کو درپیش موجودہ مسائل پر تبادلہ خیال کرنا تھا اور فرقہ پرست جن سنگھی چوں کہ ریاست میں جمہوریت اور سیکولرازم کے استحکام کو ملک کی عزت اور سالمیت کے لئے خطرہ سمجھتے ہیں، اس لئے ان کی موجودگی سے فائدے کی بجائے نقصان کا اندیشہ تھا۔ بات صرف ان لوگوں سے ہو سکتی ہے کہ جو بات سننے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور جن سنگھیوں کے بارے میں کوئی شخص یہ ضمانت دینے کے لئے تیار نہیں کہ وہ کسی دوسرے کی بات سننے پر بھی آمادہ ہوں گے۔ یہ جماعت بنیادی طور پر فسطائی جماعت ہے اور فسطائیت تبادلۂ خیال، استدلال اور بحث وتمحیص کی بجائے جبر، تشدد، چاقو اور چھرے پر یقین رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے جن سنگھ کو کنونشن میں شرکت کے لئے مدعو نہ کرنا، دانش مندانہ فیصلہ تھا۔ اگر چہ جن سنگھی ذہنیت اور فسطائی رجحانات رکھنے والے کچھ لوگ بہر حال کنونشن میں موجود تھے، لیکن وہ دوسری بات ہے۔ کنونشن کا افتتاح کرتے ہوئے شیخ صاحب نے اپنے خطبے میں جس سادگی، صفائی اور خلوص سے ان مسائل اور مشکلات کا ذکر کیا، کہ جو انہیں درپیش ہیں، اس کا بحیثیت مجموعی مندوبین پر گہرا اثر ہوا اور خطبہ صدارت پر بحث کے دوران اکثر مقررین نے شیخ صاحب کو یقین دلایا کہ وہ ان مسائل اور مشکلات کے حل میں ان سے ہر ممکن تعاون اور اشتراک کرنے کے لئے تیار ہیں۔ شیخ صاحب نے اپنے خطبے میں جموں اور لداخ سے آئے ہوئے مندوبین کو کشمیری عوام کا دکھ درد محسوس

کرنے، ان کے اندیشوں کو سمجھنے اور ان کی نفسیات کا مطالبہ کرنے کی دعوت دی اور کہا کہ میں ماضی کی تلخیوں کو بھول کر مستقبل پر وشواس کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنے لوگوں کو اس وشواس کا وشواس کیوں کر دلاؤں۔ عام طور پر سیاسی لیڈر اتنے صاف اور واضح الفاظ میں دل کی بات زبان پر نہیں لاتے، لیکن شیخ صاحب کی یہ ادا مندوبین کو بہت بھاہ گئی اور کنونشن کے آغاز میں ہی باہمی اعتماد اور اعتبار کی وہ فضا قائم ہوئی کہ جس نے اس اجتماع کو جموں، کشمیر اور لداخ کے درمیان پہلا با مقصد مکالمہ بنادیا۔ اس مکالمے میں غلبے، استحصال اور امتیاز کی باتیں تو ناگزیر طور پر آہی گئیں لیکن بنیادی طور پر ریاست کی سالمیت اور وحدت کو برقرار رکھنے کا جذبہ غالب رہا اور جن لوگوں نے اپنے غیض وغضب یا بے اطمینانی کا اظہار کرنے کیلئے ریاست کی وحدت کو ختم کرنے کی بات کی، وہ مندوبین کی ہمدردی تو کیا، ان کی سنجیدہ توجہ حاصل کرنے میں بھی ناکام رہے۔ شیخ صاحب نے اپنے خطبے میں یہ بات پہلے ہی صاف کر دی تھی کہ وہ اور ان کے ساتھی ریاست کی سالمیت کے لئے ہر ممکن جدوجہد اور قربانی دینے کے لئے تیار ہیں اور جموں اور لداخ کے نمائندوں کا یہ اجتماع بجائے خود اس بات کا ثبوت تھا کہ شیخ صاحب کشمیر کے مسئلے کو جموں اور لداخ سے الگ کر کے نہیں دیکھتے۔ وہ یہ بات کئی بار کہہ چکے ہیں کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت یہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ جموں اور لداخ بھی اس ریاست کا ایک حصہ ہیں اور ہر فیصلے میں ان خطوں میں رہنے والے عوام کے مفادات کو ملحوظ خاطر رکھا جائیگا۔ مرکزی رہنماؤں

سے اپنی بات چیت کے اس اہم مرحلے پر لداخ اور جموں کے دوستوں سے یہ تبادلۂ خیال، ان کے اسی عقیدے کا عملی اظہار تھا۔ اور مجھے خوشی ہے کہ لداخ اور جموں کے نمائندوں نے شیخ صاحب کی ذات پر اعتماد کر کے جموں، کشمیر اور لداخ میں یگانگت، بھائی چارے اور اشتراک کی ایک نئی فضا قائم کرنے میں مدد دی ہے۔ کنونشن کا سب سے خوشگوار پہلو یہ تھا کہ حکمران کانگریس سے تعلق رکھنے والے مندوبین نے بغیر کسی ذہنی تحفظ کے شیخ صاحب کی قیادت، ان کے ترقی پسندانہ رول اور ان کے تاریخی منصب کو سراہا اور مرکز کے ساتھ ان کی بات چیت کے متعلق اطمینان اور آسودگی کا اظہار کیا۔ اس بات کا سبھی کو احساس تھا کہ کشمیر میں موجودہ غیر یقینی کو ختم کرنے کے لئے شیخ صاحب کے ساتھ مفاہمت اور مصالحت کا عمل نہ صرف جاری رہنا چاہیئے بلکہ اس کی رفتار کو تیز تر کر دینا چاہئیے اور یہ بات اہم بھی ہے اور قابل تعریف بھی کہ اس نکتہ نگاہ کو پیش کرنے میں حکمران جماعت کے نمائندے پیش پیش تھے۔ اس سے ریاست کی بدلی ہوئی فضا اور آنے والے واقعات کا اندازہ ہوتا ہے!

جموں اور لداخ کے نمائندوں کے اس کنونشن کا مقصد کوئی سیاسی فیصلہ کرنا یا فتویٰ صادر کرنا نہیں تھا، اور اسی لئے اس نے کوئی تجویز کوئی فارمولہ یا قرارداد پاس نہیں کی۔ اس کا مقصد افہام و تفہیم، تبادلۂ خیال اور صلاح و مشورہ تھا اور اس لحاظ سے یہ کنونشن بے حد کامیاب رہا۔ شیخ صاحب کو جموں اور لداخ کے عوام کے جذبات اور رجحانات کا اندازہ ہوا اور مندوبین کو شیخ صاحب کے احساسات اور ان کی مشکلات کا .... دونوں طرف سے ایک دوسرے کے نکتۂ نگاہ کو سمجھنے کی یہ کوشش بڑی

مفید ثابت ہوگی اور میرا خیال ہے کہ یہ سلسلہ مستقبل میں بھی جاری رہنا چاہیئے۔ سرینگر کی جن مینڈکوں کو اکثر زکام کی شکایت رہتی ہے اور جو بدیں وجہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہتی ہیں کہ وہ شیروں اور ہاتھیوں کی حریف اور رقیب ہیں انہیں شیخ صاحب کی قیادت اور صدارت میں منعقدہ اس کنونشن سے کچھ سبق حاصل کرنا چاہئے اور سب سے پہلے ریاست کے جغرافیے کے متعلق اپنے توہمات کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ انہیں اب تو معلوم ہو جانا چاہیئے کہ سرینگر کی چاردیواری کے باہر لداخ کی بلندیوں، کٹھوعہ کے میدانوں، پونچھ کے پہاڑوں اور کشتواڑ اور بھدرواہ کی وادیوں میں بھی ایک دنیا آباد ہے اور اس دنیا میں رہنے والے لوگ نہ کسی میر واعظ کو جانتے ہیں اور نہ کسی مولانا کو مانتے ہیں۔ ان کے لئے شیخ عبداللہ کا نام اور ان کی ذات ہی کشمیر ہے اور ان سے سیاسی اختلافات کے باوجود وہ انہی کی طرف دیکھتے ہیں۔ یہ وہ منصب ہے کہ جو صرف تعویذ لکھنے اور اپنے شبستانوں سے پریس نوٹ جاری کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ایک ایسے ماضی کی ضرورت ہے کہ جو کشمیر کی تمام تر سیاسی قیادت میں صرف شیخ صاحب کے پاس ہے اور بدقسمتی سے ماضی ایک ایسی چیز ہے کہ جو بازار سے خریدا نہیں جاسکتا۔ کمسن مولویوں اور نادان میر واعظوں کو اگر اب بھی شیخ صاحب کی سیاسی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوتا تو انہیں اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے کیوں کہ ان ہی لوگوں کے بارے میں قرآن حکیم میں یہ ارشاد ہے کہ ان کے دلوں پر قفل اور آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔

بعض لوگوں کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ کشمیر کے سیاسی مستقبل کے

متعلق مرکزی حکومت اور شیخ صاحب کے درمیان کسی بھی تصیفے میں سب سے بڑی اڑچن اس وجہ سے پیدا ہوگی کہ جموں اور لداخ کے عوام شیخ صاحب پر اعتماد کرنے کے تیار نہیں ہوں گے، اس قسم کا تاثر پیدا کرنے میں وہ لوگ سرگرم ہیں کہ جو شیخ صاحب کے ساتھ مفاہمت کے موجودہ عمل کو اپنے منطقی انجام تک پہونچتے، دیکھ کر بدحواس ہو گئے ہیں۔ لیکن شیخ صاحب نے براہِ راست جموں اور لداخ کے عوام سے رابطہ پیدا کر کے اعتماد اور اعتبار کا جو خوشگوار ماحول قائم کیا ہے اس کے پیش نظر یہ اندیشہ بے بنیاد ثابت ہوگا۔ سرینگر میں منعقدہ اس کنونشن نے اس ماحول کو اور زیادہ مستحکم بنا دیا ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ عمل جاری رہے گا۔ ہم کو ماضی کی غلطیوں سے سبق حاصل کرنا ہوگا۔ جموں کے عوام یہ سمجھ لیں کہ شیخ عبداللہ کو کھو کر وہ کشمیر کو کھو دیں گے اور شیخ صاحب کو یہ بات ذہن نشین کرنا ہوگی کہ جموں کے عوام کو مطمئن کئے بغیر وہ ریاست کی وحدت کو برقرار نہ رکھ سکیں گے۔

۱۷ ستمبر ۱۹۷۴ء

اتحاد کا نشان

شیخ محمد عبداللہ کا حالیہ دورۂ لداخ ایک سے زیادہ حیثیتوں سے اہم اور قابل توجہ واقعہ ہے اور یہ امر کسی حد تک نشر واشاعت کے اداروں کے یک رُخی مزاج کا مظہر ہے کہ اس دورے کے گہرے عوامل اور ممکنہ اثرات کو پوری طرح ابھارا نہیں گیا۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ شیخ صاحب نے اس عمر اور اپنی صحت کی موجودہ حال میں یہ صبر آزما اور صعوبت آمیز سفر اختیار کیا۔ یہ کوئی راز کی بات نہیں ہے کہ شیخ صاحب کے ہمدردوں نے ہی نہیں بلکہ ان کے معالجوں نے بھی حتی الامکان شیخ صاحب کو اس سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے ان کی قیمتی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی اس کے ساتھ ہی شیخ صاحب کا جو بیان ہے وہ بھی رسمی اور لفظی نہیں بلکہ وہ ان کے ایمان کا حصہ اور ان کے اعتقاد کا جُز ہے۔ ریاست کی تینوں اکائیوں کے اتحاد کی شیخ صاحب کو جو لگن ہے، وہ بھی کسی سیاسی مصلحت کوشی کی نہیں بلکہ ایک گہری جذباتی اور روحانی وابستگی کی پیداوار ہے۔ اس لئے نہ تو زدجیلا کی کٹھنائیاں اور نہ ہی فوتیلا کی بلندیاں ان کے آہنی عزم میں حائل ہو سکیں۔ ان کی پیرانہ سالی میں روشن ضمیری اور عوام دوستی کی جو کرن موجود ہے، اس نے انہیں پہاڑوں کا پُر غرور سر جھکانے کے قابل بنا دیا

اور وہ آکسیجن پر تکیہ کرنے کے باوجود ہر اُس مقام تک پہونچ گئے جہاں لداخ اور کرگل کے عوام کا دل دھڑکتا تھا اور نبض پھڑکتی تھی۔ یہاں اس حقیقت کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ان سے بہت کم عمر اور بہت زیادہ سہولیات کے مالک ریاست کے کئی سابقہ وزراء اعلیٰ نے کبھی لداخ جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ شیخ صاحب نے اگر مشکلات اور مسائل کے باوجود یہ کٹھن سفر اختیار کیا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کے دردمند دِل میں جموں کے ہریجن اور کشمیر کے کسان کی طرح کرگل اور لداخ کی پہاڑیوں میں رہنے والے ریاستی باشندوں کی محبت موجزن ہے اور وہ ریاست کے ان تین خطوں کے اتحاد کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہیں۔

یہ لداخ میں شیخ صاحب کے دورے کا ایک ذاتی اور جذباتی پہلو تھا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ سارا لداخ ان کے استقبال کے لئے اُمڈ آیا اور اُن کی مقناطیسی شخصیت جس طرح کشمیر کے کسی دُور اُفتادہ حصّے میں عقیدت مندوں کا پیمانہ لبریز کر دیتی ہے اسی طرح لداخ میں جذب وکشش کی وہ کرامات دیکھنے میں آئیں جس کی داستانیں صرف شیخ محمد عبداللہ کی محبوب ذات سے وابستہ رہی ہیں اور ہماری تاریخ اور قومی حافظے پر نقش ہو کر رہ گئی ہیں۔ جب کشمیر اور دہلی میں ریاستی عوام کی عزت وآبرو کے دشمن شیخصاحب کیخلاف مایوسی اور ناامیدی کی مہم چلا رہے تھے اور مرکز کے ساتھ ان کے مذاکرات کے بارے میں منحوس قیاس آرائیاں کر رہے تھے، اُس وقت شیخ صاحب ایک عاشق کی بے نیازی کے ساتھ لداخ کے بیابانوں میں ریاست کے اتحاد کی متاع کے

ریزے چن رہے تھے اور جس وقت جموں اور سرینگر میں اپنے گناہوں کے محاسبے سے خائف چور اُچکے شیخ صاحب پر طرح طرح کی الزام تراشیاں کر رہے تھے، اس وقت کرگل اور لیہہ کی سڑکوں پر شیر کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مسلم سکھ اتحاد کے نعرے گونج رہے تھے اور وہاں کے عوام ان کو دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ نے لداخ اور کرگل کے مقامات اور مضافات میں بہت سے جلسوں سے خطاب کیا اور مشاہدین نے دیکھ لیا کہ دور دراز علاقوں سے ہزاروں لوگوں نے آکر اپنی آزادی، اتحاد اور عزت کے علمبردار اُس رہنما کو دیکھا اور اس کے خیالات سُنے، جس کی جوانی اور زندگی کے بہترین سال پہلے شخصی راج اور پھر آزاد ہندوستان کی جیلوں میں کٹے لیکن وہ ہر وقت اور ہر مقام پر یہی نعرہ بلند کرتا رہا کہ یہ ملک ہمارا ہے، اس کا فیصلہ ہم کریں گے۔ لیہہ اور کرگل میں شیخ صاحب کے اعزاز میں جو جلسے ہوئے۔ اُن کی نظیر خود ان قصبوں کی عوامی زندگی میں ملنا مشکل ہے۔ حاضری اور جوش وخروش دونوں لحاظ سے اُس عہدرفتہ کی یاد تازہ ہوگئی جب عوام رہبروں کو رہزنوں کے رُوپ میں نہیں دیکھتے تھے۔ شیخ صاحب کے جلسوں اور ان کی میٹنگوں میں جہاں ایک طرف کرگل کے وہ لوگ تھے، جو سرینگر کے ساتھ زیادہ قریبی روابط کے حامی ہیں۔ وہاں لیہہ میں لاما لوپزن جیسے لوگ بھی موجود تھے، جنہوں نے حالیہ برسوں میں سرینگر اور لیہہ کے درمیان علیٰحدگی کے نعرے بلند کئے ہیں۔ اس طرح سے ساری دنیا پر یہ بات واضح ہوگئی کہ شیخ صاحب کی ذات میں ہماری ریاست کو وہ رہنما نصیب ہے جو ہمارے اتحاد کا پرچم اور

ہماری وحدت کا نشان بن گیا ہے۔ کشمیر میں شیخ صاحب کی محبوبیت کی قسم کھانا لا حاصل ہے۔ جموں صوبے کا انہوں نے پچھلے موسم بہار میں جو دورہ کیا اُس سے جن سنگھیوں اور دوسرے تعصب پرستوں کے وہ ہوائی قلعے مسمار ہو گئے، جو انہوں نے شیخ صاحب کے متعلق قائم کر رکھے تھے۔ اب لداخ میں شیخ صاحب کے استقبال اور ان کی عقیدت کے مظاہروں نے اس حقیقت کو ایک اور بار پھر روشن کر دیا ہے کہ ریاست کے ان تین خطوں کو اگر پہلے ایک حکمران خاندان کی تلوار متحد رکھتی تھی، وہاں انہیں اب شیخ صاحب کی بلند و بالا محبوب اور مقبول ذات ایک لڑی میں پروئے رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس حقیقت کو ساری ریاست کو خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے کہ ابھی ہمارے درمیان اس مرتبے کی شخصیت موجود ہے۔

شیخ صاحب نے اپنے دورۂ لداخ میں اپنی عادت کے مطابق بلا تکلف صاف گوئی سے کام لیا۔ انہوں نے لداخیوں کو بتایا کہ میں جو لڑائی لڑ رہا ہوں وہ صرف کشمیر کے عوام کے لئے ہی نہیں، بلکہ لداخ اور جموں کے عوام کے لئے بھی ہے اور میرا واحد مقصد ہے کہ اس ریاست کے سارے لوگ ایک کنبے کے برابر حصہ داروں کی حیثیت سے عزت، آزادی اور خوش حالی کی نعمتوں سے فیض یاب ہوں۔ شیخ صاحب نے لداخیوں کو بتایا کہ اگر وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں کچھ ناہمواریوں اور نابرابریوں کو نمایاں پاتے ہیں تو اس کو کشمیر کے غریب عوام کے سر نہیں تھوپا جانا چاہیئے۔ اس کو اس خاص ذہنیت اور طبقے کی کارستانیوں کا ثمرہ سمجھنا چاہیئے جو کشمیر میں ۵۳ء کے بعد برسرِ

اقتدار آیا اور جس کی ستم رانیوں سے لداخ اور جموں کے عوام کی طرح کشمیر کے عوام کی اکثریت بھی نالاں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس طبقے کے ایجنٹ کشمیر میں ہی نہیں، بلکہ جموں اور لداخ میں بھی دندناتے پھر رہے ہیں اور جب تک اس ذہنیت کے سرچشمے کو ختم نہیں کیا جاتا، یہ نہ صرف ریاست کے تین حصوں میں علاقائی تفاوت کے تعصب کو ہوا دیتا رہے گا بلکہ ان حصوں میں رہنے والے مذہب کے پیروؤں میں بھی نفرت کی دیواریں حائل کرتا رہے گا۔ شیخ صاحب نے لداخیوں کو بتایا کہ ان کے ذہن میں مستقبل کا جو نقشہ ہے اس کے مطابق جموں کشمیر اور لداخ کی وحدتوں کو زیادہ سے زیادہ اندرونی خود مختاری ملے گی اور اقتدار کے اصل فیصلے پنچائیتوں اور بلاکوں کی سطح پر لئے جائیں گے۔ انہوں نے یہ بات واضح کر دی کہ اگر نئے نظام کو آزمانے کے بعد بھی لداخ کے عوام کی یہ خواہش رہے کہ وہ کشمیر اور جموں کے ساتھ نہیں رہ سکتے تو انہیں اپنا راستہ چننے کا اختیار ہوگا۔ کیونکہ میں بنیادی طور عوام کی رضا اور ان کے حقوق کے لئے جدوجہد کرتا اور قربانیاں دیتا رہا ہوں اور ان کا فیصلہ میرے لئے سب سے زیادہ مقدس ہے۔

لداخی عوام نے جس توجہ، دل چسپی اور احترام کے ساتھ شیخ صاحب کے خیالات سنے اور انہیں اپنے تعاون کا یقین دلایا، اُس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے دورے سے لداخی عوام کے دلوں میں پیدا شدہ وہ تلخیاں بڑی حد تک کم ہوگئی ہیں جو صاحب اقتدار طبقے کی سیاہ کاریوں اور دہلی میں مقیم چند شرارت پسندوں کی ریشہ دوانیوں سے تشویشناک صورت اختیار کر گئی تھیں۔ شیخ صاحب اس وقت اقتدار میں نہیں ہیں۔

وہ اتحاد برادری اور برابری کے سفیر کی حیثیت سے لداخ گئے اور وہاں
ان کی قلندرانہ اداؤں اور سکندرانہ نگاہوں نے لداخیوں کے دل جیت لئے۔
برسوں کے لگے ہوئے زخم مندمل ہونے لگے ہیں اور اسی لئے شیخ صاحب کا
دورۂ لداخ ہماری ایکتا کی تاریخ میں ان کے آہنی ارادے کے ساتھ
ساتھ ان کی بزرگانہ شفقت کی شہادت کے طور پر بھی زندہ رہے گا۔ اس
وقت میر پور کے میدانوں سے لے کر لہیہ کے پہاڑوں تک گلگت کے
خیابانوں سے کشتواڑ کی وادیوں تک اور گریز کی گھاٹیوں سے پونچھ کی
چوٹیوں تک صرف ایک محبوب شخصیت کی نظر قربت اور اتحاد کے نشان کی
حیثیت سے چمک رہی ہے اور وہ شیخ محمد عبداللہ کی ذات ہے، جو صرف
ایک ذات کا ہی نام نہیں، ریاستی عوام کی امنگوں اور آرزوں ان کی
دعاؤں ان کی قربانیوں، مقاصد اور نصب العین کی علامت بھی ہے۔ نئی
دہلی کے ایوانوں میں کتابی سیاست کے رسیا دوستوں کو اس عظیم حقیقت کا
ایک اور بار سامنا کرنا چاہیئے اور اس علامت کی قوتِ شفا سے جلد از جلد
ریاست کے اتحاد میں پیدا شدہ زخموں کے علاج کا عمل تیز کرنا چاہیئے۔

۱۷نومبر۱۹۷۴ء

نویدِ صبح

چھ ماہ قبل جب میں نے اس اخبار کے اسی صفحے پر ''پھر صبح ہو گی''
کے عنوان سے یہ اعلان کیا تھا کہ آئیندہ چھ ماہ ریاست کی تاریخ میں
غیر معمولی اہمیت کے حامل ہوں گے اور اس دوران میں سیاسی سطح پر
بنیادی اہمیت کی کچھ تبدیلیاں رونما ہوں گی، تو دن کے اجالے کو رات کی
تاریکیوں پر ترجیح دینے والے کچھ الوؤں اور ان کے پٹھوں نے میرا
مذاق اڑایا تھا۔ رات کی سیاہی اور ریاستی عوام کی بدبختی پر ان کا اعتقاد
اتنا مستحکم تھا کہ وہ روشنی کی ہر کرن کو فریبِ آرزو اور طلسم خیال سمجھ کر
قہقہے بلند کرتے رہے۔ وہ تاریخ کی منطق، اس کی جدلیات اور اس
کے طبقاتی شعور سے آنکھیں بند کر کے صرف اپنے حقیر مفادات کی
خاطر مایوسی، نا امیدی اور ناکامی کی فضا پیدا کرنے میں مصروف رہے۔
حتیٰ کہ انہیں خود اس بات کا یقین ہو گیا کہ صبح کبھی نہیں ہو گی۔ لیکن
تاریخ کا کارواں افراد کی خواہشات اور ان کے مفادات کی پروا کئے بغیر
آگے بڑھتا ہے۔ اس کے سفر کے قوانین، پیش قدمی کی رفتار اور اس کی
منزل مُعین ہوتی ہے۔ اس لئے مفاد پرستوں اور رجعت پسندوں کی
خواہشیں اور سازشیں کچھ کام نہ آئیں اور صبح کا قافلہ اندھیرے کو چیرتا
اور مایوسی کے بادلوں سے ٹکراتا ہوا آگے بڑھتا گیا اور مجھے یہ اعلان
کرتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے کہ صبح کے آثار اب بالکل صاف اور
واضح طور نظر آنے لگے ہیں۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ سیاست
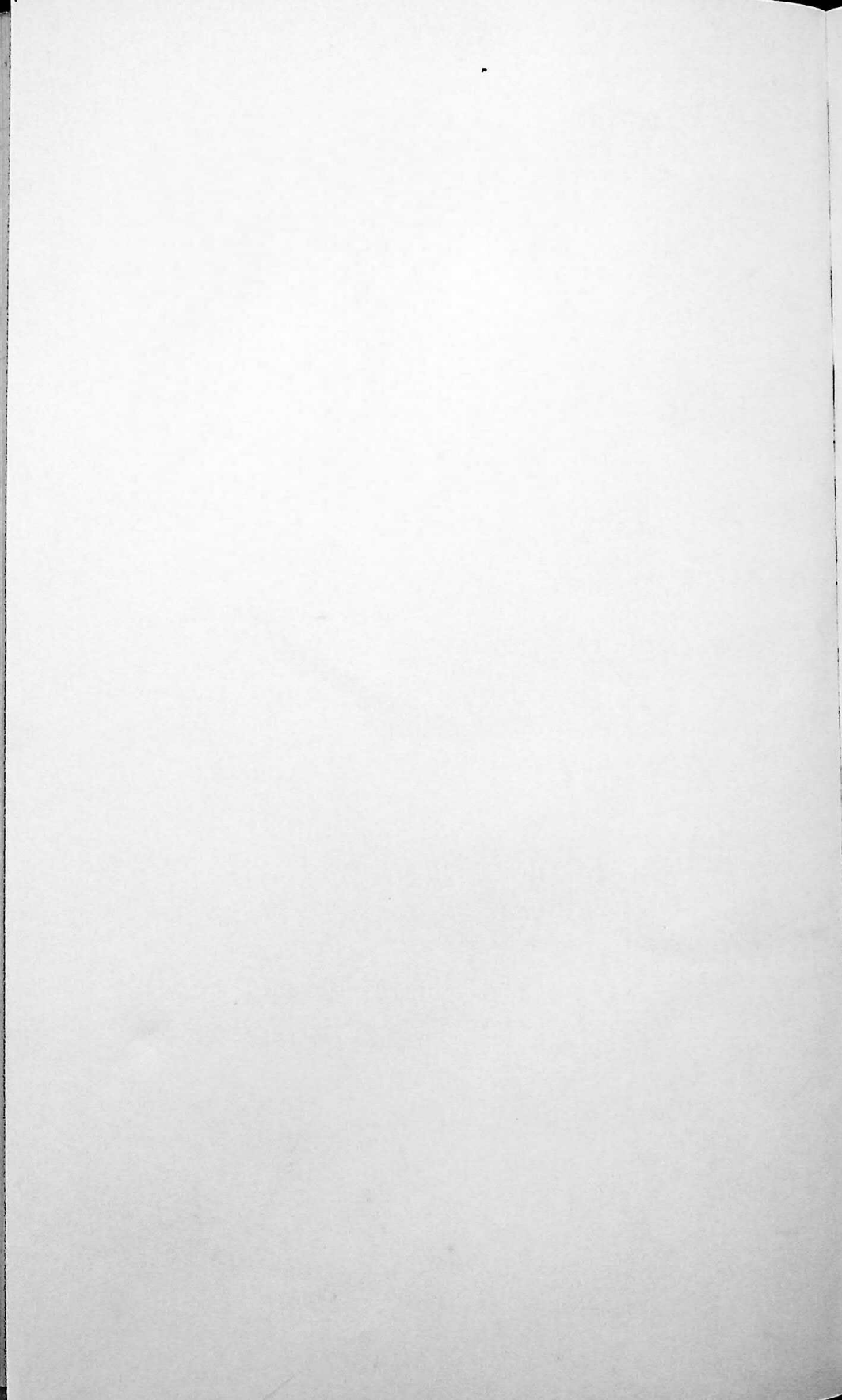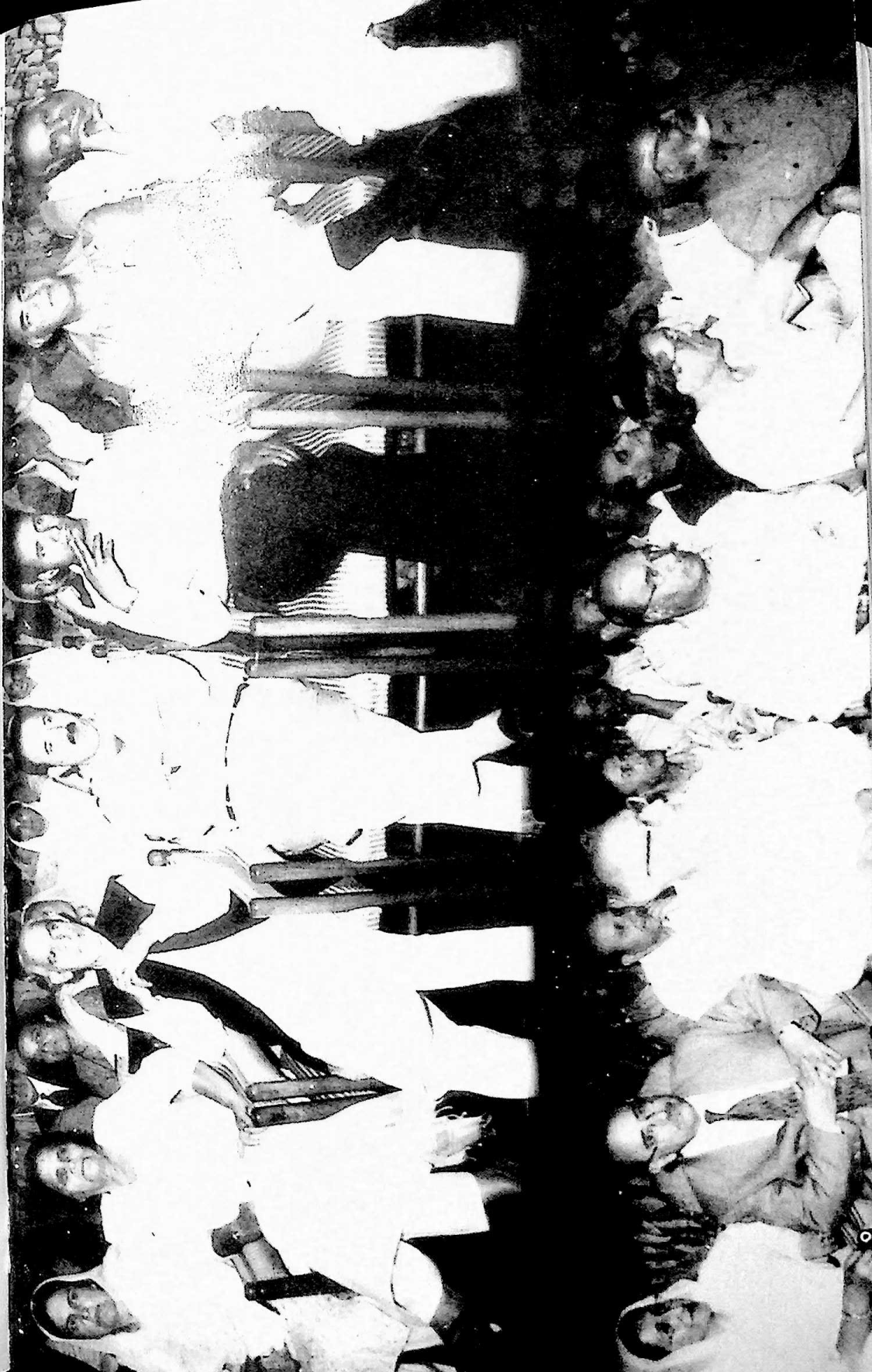
اور صحافت کے اندھیرے میں سب سے پہلے میں نے روشنی کی کرن دیکھ کر سویرے کی بشارت دی تھی اور راستے کی طوالت، سفر کی صعوبت، اور قدم قدم پر امید وبیم کی کشمکش کے باوجود صبح کی آمد پر میرا یقین مستحکم اور میرا اعتقاد غیر متزلزل رہا اور انتہائی ناامیدی کے عالم میں بھی میں نے شیخ صاحب اور مرکزی حکومت کے درمیان مفاہمت کے امکانات پر اپنا وشواس نہیں کھویا، حتیٰ کہ ڈیڑھ دو ماہ قبل اپنے وطن سے ہزاروں میل دور جب میں نے نیویارک میں بات چیت ٹوٹ جانے اور مفاہمت کی کوششوں میں تعطل پیدا ہو جانے کی خبریں پڑھیں تو میرے دل نے ان کی صحت اور میرے دماغ نے ان کی معقولیت پر ایمان لانے سے انکار کردیا، اور دلی پہونچنے کے صرف چند گھنٹوں کے اندر اندر میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی کہ ناکامی اور تعطل کی خبریں واقعات سے زیادہ قیاس پر مبنی ہیں۔

دکھائی راویوں نے طبع کی جولانیاں کیا کیا
ہوئی ہے کچھ سے کچھ جب انجمن تک بات پہنچی

تازہ ترین صورت حال یہ ہے کہ مرزا محمّد افضل بیگ اور مسٹر پارتھا سارتھی کے درمیان تمام بنیادی امور پر مفاہمت ہوگئی ہے اور دونوں نمائندوں نے پہلی بار تحریری طور پر متفقہ امور کی فہرست مرتب کر کے اپنے اپنے فریق کو پیش کر دی ہے۔ اختلافی نوعیت کے دو ایک مسائل جو بات چیت کی رفتار اور مفاہمت کی راہ میں رکاوٹ بن گئے تھے، اب بھی فیصلہ طلب ہیں لیکن ان کے متعلق شیخ صاحب اور مسز گاندھی، دونوں کے ذہنی رویے میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا ہوگئی ہے اور دونوں لیڈر اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ تمام مسائل کو ایک ہی

جست میں حل کرنے کی بجائے بعض معاملات کو تاریخ اور تجربے کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ باالفاظ دیگر فریقین کو اس بات کا احساس ہے کہ دو برس کی محنت کے بعد جو کچھ حاصل ہوا ہے، وہ اتنا اہم اور قیمتی ہے کہ اسے کچھ اور حاصل کرنے کی کوشش میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور جن معاملات میں ابھی تک مکمل اتفاق نہیں ہوا ہے، وہ اہم ہونے کے باوجود بنیادی نہیں ہیں اور ان پر تبادلہ خیال ہوتا رہے گا۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ ۲۹ اکتوبر کو نئی دہلی سے سرنگر تک ہوائی جہاز میں ایک ساتھ سفر کرتے ہوئے شیخ صاحب اور مسز اندرا گاندھی کے درمیان ایک گھنٹے کی پرواز کے دوران ان تمام اختلافی امور پر تبادلہ خیال ہوا کہ جو مسٹر پارتھا ساتھی اور مرزا محمد افضل بیگ کی پیش قدمی روکے ہوئے تھے اور یہیں دونوں لیڈروں نے ذاتی وقار اور محدود سیاسی مفادات کی سطح سے چالیس ہزار فٹ بلند ہوکر ملک اور قوم کے وسیع تر مفادات کے بارے میں ایک دوسرے کے نکتہ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی اور آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں تک آتے آتے شیخ صاحب اور مسز گاندھی دونوں پر یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ بنیادی مسائل کے متعلق ان کے رویے اور ردعمل میں حیرت انگیز یکسانیت پائی جاتی ہے۔ سرینگر میں وزیر اعظم کے دو روزہ قیام کے دوران دو ایک غیر رسمی ملاقاتوں میں تشکیک اور بے اعتمادی کے بچے کچھے آثار بھی مٹ گئے اور دوسرے دن جب مسٹر پارتھا سارتھی میرزا محمد افضل بیگ سے اپنی بات چیت جاری رکھنے کے لئے سری نگر تشریف لائے تو صرف دو ہی نشستوں میں وہ سارے مسائل سلجھتے نظر آنے لگے، جو پچھلے دو سال سے

NUMA
GS OF)
SHAM

مسٹر پارتھا سارتھی کے لئے دردِ سر اور میرزا محمد افضل بیگ کے لئے دردِ جگر بنے ہوئے تھے! دلی روانہ ہونے سے قبل جب مسٹر پارتھا سارتھی شیخ صاحب سے ملنے کے لئے ان کی قیام گاہ پر تشریف لائے، تو میں وہاں موجود تھا۔ شیخ صاحب سے باقاعدہ گفتگو سے قبل مسٹر پارتھا سارتھی نے ایک غیر رسمی ملاقات میں مجھے بتایا کہ بالآخر یہ طویل مذاکرات اپنے خوشگوار انجام کو پہونچ گئے ہیں اور اب کی بار میں اس وقت تک پیرس نہیں جاؤں گا، جب تک کہ مجھے یہاں مکمل فراغت حاصل نہ ہو۔ کم گو اور کم آمیز پارتھا سارتھی کے یہ دو بلیغ جملے میرے لئے ایک نئے دور کی بشارت کا درجہ رکھتے تھے اور شیخ صاحب کے ساتھ ۴۵ منٹ کی گفتگو کے بعد جب مسٹر پارتھا سارتھی رخصت ہو رہے تھے تو ان کے ہونٹوں پر ایک طمانیت آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ یہ اطمینان، یہ سکون اور یہ مسرت میں نے آج تک ان کے چہرے پر کبھی نہیں دیکھی ہے۔

سمجھوتے کی تفصیلات کے متعلق حتمی طور پر کچھ کہنا میرے لئے مشکل ہے لیکن یہ بات قطعی ہے کہ شیخ صاحب کو مستقبل قریب میں اپنی نئی ذمہ داریاں سنبھالنے کو کہا جائے گا۔ ریاست کے موجودہ وزیر اعلیٰ سید میر قاسم مستعفی ہوں گے اور ریاستی اسمبلی شیخ صاحب کو اپنا لیڈر منتخب کرے گی۔ موجودہ کابینہ کو برخاست کر کے شیخ صاحب نئی کابینہ کا اعلان کریں گے اور اس کے بعد وہ جب چاہیں، نئی اسمبلی کے لئے انتخابات کروا سکتے ہیں۔ اقتدار منتقل کرنے کے لئے ابھی تک کوئی آخری تاریخ مقرر نہیں ہوئی ہے اور اس کا فیصلہ شیخ صاحب پر چھوڑ دیا جائیگا کہ وہ کب اپنی نئی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے تیار ہوں گے۔ قیاس

غالب ہے کہ شیخ صاحب فوری طور اقتدار کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی بجائے غور وفکر اور صلاح مشورے کے لئے کچھ وقت چاہیں گے۔

۲نومبر کو لالچوک میں ایک بھاری اجتماع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے شیخ صاحب نے ریاست کی معیشت اور موجودہ مسائل کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا، اس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ اقتدار سنبھالنے سے پہلے رائے عامہ کو نئی تبدیلیوں کے لئے تیار کرنا چاہتے ہیں۔ بہرحال یہ بات ثانوی اہمیت کی حامل ہے کہ کس خاص تاریخ کو انتقال اقتدار کی رسم انجام دی جائیگی۔ اصل بات یہ ہے کہ اصولی طور پر ریاست کے موجودہ سیاسی ڈھانچے میں تبدیلیوں کی ضرورت اور اہمیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ۲نومبر کو لالچوک میں تقریر کرتے ہوئے شیخ محمد عبداللہ نے کہا تھا کہ اس وقت ہندوستان میں دو تجربے ہو رہے ہیں۔ ایک تصادم کا اور دوسرا مفاہمت کا۔ بہار میں جے پرکاش نرائن طاقت اور تصادم کے ذریعے باہمی مسائل اور اختلافات کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں، اور یہ ایک قسم کا تجربہ ہے۔ دوسرا تجربہ مفاہمت اور مصالحت کا ہے، جو ہم کشمیر میں کر رہے ہیں۔ اگر خدانخواستہ مفاہمت اور مصالحت کی موجودہ کوششیں یہاں ناکام بنا دی گئیں، تو پھر ماننا پڑے گا کہ جے پرکاش نرائن کا راستہ ہی صحیح اور کامیاب راستہ ہے۔ خوش قسمتی سے شیخصاحب کی قیادت میں کیا جانے والا تجربہ کامیاب وکامران ہوتا نظر آرہا ہے اور یہ امن پسند جمہوری قوتوں کے لئے ایک نیک شگون کا درجہ رکھتا ہے۔ ❁ ❁ ❁

۲۳/نومبر ۱۹۷۴ء

آلو اور آزادی

ایک عرصہ ہوا کہ میں نے شیخ محمد عبداللہ کے متعلق یہ رائے ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی افتادِ طبع، مزاج اور کردار کے اعتبار سے ایک بہت بڑے انسان تو ہیں لیکن کامیاب سیاستدان نہیں ہیں۔ ان کی صاف گوئی، تلخ نوائی، صدق دلی اور دل کی ہر بات زبان پر لانے کی عادت، انہیں سیاسی لیڈروں سے زیادہ درویشوں اور قلندروں کے قریب کر دیتی ہے اور باوجود اس کے کہ اپنی ان ہی خصوصیات کی بنا پر وہ اپنوں اور غیروں دونوں کے ہاتھوں کئی بار زخمی ہو چکے ہیں، وہ اپنی عادت سے باز نہیں آتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بغیر لگی پٹی کے ہر بات کو برملا طور کہہ دینا ان کا اسلوب ہی نہیں، ان کی شخصیت کا ایک حصہ ہے اور وہ اپنی عافیت یا کسی مصلحت کے نام پر اس سلسلے میں کوئی سمجھوتہ کرنے پر آمادہ نہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ ناصحوں اور عقل مندوں کی ہر بات سننے کے بعد وہی کہتے اور کرتے ہیں کہ جو ان کا دل کہتا ہے۔ حد یہ ہے کہ وہ جو کچھ سوچتے ہیں اس میں بھی ساری دنیا کو شریک کرتے ہیں اور اس سے بعض اوقات دشمنوں کو غلط فہمی اور بدظنی پھیلانے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ ۲۰ نومبر کو لالچوک (سرینگر) میں شیخ صاحب کی تقریر کی تعبیر و تفسیر اس کی ایک تازہ مثال ہے!

شیخ صاحب نے اپنی ایک گھنٹے کی تقریر میں ریاست کے موجودہ سیاسی اور اقتصادی مسائل پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ ریاست کے معاشی

بحران اور اقتصادی عدم توازن کے اسباب وعلل کا تجزیہ کرتے ہوئے انہوں نے بجا طور پر یہ بات کہی کہ گزشتہ بیس بائیس برسوں میں یہاں لوگوں کی عادات خراب کرنے کے لئے روپیہ پیسہ تو پانی کی طرح بہایا گیا، لیکن اقتصادی ڈھانچے کو مضبوط اور مستحکم بنانے پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اس سلسلے میں انہوں نے واضح طور پر دو امور کی جانب اشارہ کیا۔ ایک ایڈمسٹریشن کا بڑھتا ہوا اور ناقابل برداشت بوجھ اور دوسرا رعائتی قیمتوں پر راشن مہیا کرنے کی روش۔ شیخ صاحب کے لئے یہ بات باعث حیرت ہے کہ جس ریاست کی کل آمدن ۳۵ کروڑ ہے، وہ ریاست صرف سرکاری ملازموں کی تنخواہوں پر پچاس کروڑ روپے سالانہ خرچ کرتی ہے۔ انہیں اس بات کا بھی دُکھ ہے کہ ریاست کو غذائی اعتبار سے خود کفیل بنانے کی بجائے ہر سال شہریوں کو کم قیمتوں پر راشن مہیا کرنے پر ۱۸ کروڑ روپے خرچ کئے جارہے ہیں اور اس سال یہ رقم ۲۵ کروڑ روپے تک پہونچنے والی ہے۔ اس مصنوعی خوش حالی اور کھوکھلی اقتصادیات پر اپنی گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے شیخ صاحب نے لوگوں کو خبردار کیا کہ مرکزی حکومت کے ساتھ موجودہ مذاکرات کی کامیابی کے نتیجے میں اگر انہیں ایک بار پھر عنانِ اقتدار سنبھالنا پڑے، تو ریاست کو معاشی اور اقتصادی بحران سے نکالنے کے لئے یہاں کے عوام کو ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ یہ ریاست خوارک کی سبسڈی پر ہر سال پچیس کروڑ روپے صرف کرنے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اس لئے سب سے پہلے ہمیں اس بوجھ کو کم کرنے کی طرف توجہ دینا چاہیئے۔ خوراک کے سلسلے میں

ریاست کو خود کفیل بنانے کے اپنے خواب کا ذکر کرتے ہوئے شیخ صاحب نے کہا کہ میں نے ۱۹۵۳ء میں بھی لوگوں سے یہ کہا تھا کہ انہیں آلو کھا کر زندہ رہنے کو بھیک مانگنے پر ترجیح دینا چاہیئے اور آج اکیس سال بعد بھی میرا یہی نظریہ ہے کہ ریاست کو غذائی اعتبار سے خود کفیل بنائے بغیر ہم اپنی عزت و آزادی کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ اور جب تک ہم اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوتے، ہمیں آلو کھا کر بھی زندہ رہنا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں! شیخ صاحب کے ان جذبات اور خیالات کو سامعین نے جس توجہ اور گرم جوشی سے سُنا، اس پر مجھے بے ساختہ اقبالؔ کا یہ شعر یاد آ گیا ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

انہوں نے جس دردمندی، خلوص نیت اور جرأت رندانہ کے ساتھ یہ باتیں کہیں، اس سے ان کے بدترین سے بدترین دشمن بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے جو کچھ کہا، اس کی منطق، معقولیت اور اہمیت سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ لیکن دوسرے ہی دن شیخ صاحب کے ازلی مخالفوں، ریاستی عوام کے بدخواہوں اور شہر کے افواہ بازوں نے یہ سرگرشیاں شروع کر دیں کہ شیخ صاحب کے برسرِ اقتدار آتے ہی بہت سے سرکاری لازموں کو برخواست کر دیا جائے گا، رعائیتی قیمتوں پر خوراک کی تقسیم بند ہوگی اور شہر والوں کو چاول اور آٹے کی بجائے آلوؤں پر گذارہ کرنا پڑے گا۔ جو لوگ بالواسطہ یا بلاواسطہ ۱۹۵۳ کی سازش میں شریک تھے یا جن کا براہِ راست اس شب خون سے کوئی

ذاتی مفاد وابستہ رہا ہے، وہ یہ دہشت پھیلانے میں پیش پیش تھے کہ شیخ عبداللہ کے برسرِ اقتدار آتے ہی یہاں کے لوگوں کو سستے چاولوں کی بجائے آلو کھانا پڑیں گے اور سرکاری ملازمت کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔ خفیہ ایجنسیوں کے کچھ تنخواہ داروں نے غریب عوام کے غم میں مگر مچھ کے آنسو بہا کر اپنی لیڈری کی دکان چمکانا شروع کر دی اور ریاستی کابینہ کے بعض وزیروں نے ان فرضی اور بے بنیاد خدشات کو فروغ دینے کے مذموم کوششیں کیں۔ کچھ جاہلوں نے چاول اور آلو کی موجودہ قیمتوں کا موازنہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ آج کل آلوؤں کے مقابلے میں چاول سستے ہیں۔ الغرض ایک انتہائی سنجیدہ بحث اور غیر معمولی اہمیت کے حامل اقتصادی مسلئے کو اس کے سیاق وسباق سے الگ کر کے طنز و تضحیک اور طعن و تشنیع کا موضوع بنایا گیا اور کچھ بوالہوس اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ وہ شیخ صاحب کے تئیں عوام میں بدظنی اور بدگمانی پھیلانے کے ناپاک منصوبے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ شیخ صاحب کے خلوص اور کشمیری عوام کی بیدار مغزی کا معجزہ ہے کہ مفادِ خصوصی کی اس منظّم تحریک کا نہ عامۃ الناس نے کوئی نوٹس لیا اور نہ شیخ صاحب نے اپنے موقف کی وضاحت کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ بلکہ وہ زیادہ شدت کے ساتھ سیاسی اور اقتصادی مسائل پر اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے رہے۔ اتنے نازک اور ہمہ گیر مسائل پر اس جرأت اور بے باکی کے ساتھ صحت مند اور تعمیر رویہ اپنانا واقعی شیخ صاحب ہی کے بس کی بات ہے۔ ورنہ اس سے پہلے بڑے بڑے گرانڈیلوں کو بھی یہ موضوع چھیڑنے کی ہمت نہیں پڑی۔

اس بات سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ ریاست کی اقتصادی حالت کو سدھارنے اور عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہماری معاشیات اور اقتصادیات کی بنیادیں مستحکم ہونی چاہئیں اور اس کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ یہ ریاست غذائی اعتبار سے خود کفیل ہو اور یہاں اتنی خوراک پیدا ہو کہ ہم نہ صرف اپنی کفالت کرسکیں بلکہ مستقبل میں دوسری ریاستوں کو بھی امداد دینے کے اہل ہوں۔ یہ بات نہ صرف ممکن ہے بلکہ سو فیصدی یقینی ہے اور شیخ صاحب کو بجا طور پر اس بات کا افسوس ہے کہ گزشتہ بیس بائیس برسوں میں غذائی پیداوار بڑھانے کی بجائے کروڑوں، اربوں روپے خیرات کے طور پر تقسیم کئے گئے ۔ ابھی تک جو رقم سبسڈی پر خرچ ہوتی ہے یہی رقم اگر مناسب طریقے پر ریاست کو خوراک کے معاملے میں خود کفیل بنانے پر صرف کی گئی ہوتی تو آج ہماری اقتصادیات کا نقشہ ہی مختلف ہوتا۔ لیکن خود غرض، کوتاہ اندیش اور بدخواہ حکمرانوں کو ریاستی عوام کے مستقبل کی بجائے اپنے مستقبل سے دلچسپی تھی اور وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ عوام میں صحیح قسم کی خود اعتمادی اور خوش حالی پیدا ہو، اس لئے وہ کھلونے اور خیرات دے کر انہیں بہلاتے رہے، ریاست کی معیشت تباہ ہوتی رہی، اس کا بال بال قرضے کی زنجیروں میں جکڑتا گیا۔ سود در سود کی رقم بڑھتی گئی اور نتیجہ یہ کہ آج اس ریاست پر صرف خوراک کی سبسڈی کا ایک ارب روپے سے زیادہ قرضہ باقی ہے اور اس کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ اس میں روز بروز کمی ہونے کی بجائے اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ پچھلے سال ہم نے سبسڈی پر ۸ کروڑ خرچ کیا۔ اس سال ۲۵ کروڑ خرچ

کئے جانے کا تخمینہ ہے۔ شیخ صاحب کا موقف یہ ہے کہ اگر ہم ریاست کو صحیح معنوں میں خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں تو قرض کے مرض سے آزاد ہوکر اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اس کوشش میں یقیناً زحمتیں برداشت کرنا پڑیں گی۔ لیکن کیا آزادی اور عزت جیسی چیزیں کبھی بغیر قیمت کے بھی حاصل ہوسکتی ہیں؟ شیخ صاحب نے جب آلو کھانے کا ذکر کیا تو انہوں نے آلو کو علامت کے طور پر استعمال کیا لیکن جاہلوں نے اپنی جہالت اور حاسدوں نے اپنی خباثت کے مطابق اس کی منطقی تعبیر یہ کی کہ شیخ صاحب لوگوں کو چاول کی بجائے آلو کھانے پر آمادہ کر رہے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ آلو سب سے مقوی غذا ہے اور یورپ اور امریکہ میں اس کا استعمال آٹے اور چاول سے بھی زیادہ ہوتا ہے، قابل قدر بات یہ ہے کہ شیخ صاحب لوگوں کو اپنی ریاست کے اقتصادی استحکام کے لئے قربانیاں دینے پر آمادہ کر رہے ہیں اور انہیں بتا رہے ہیں کہ مستقبل قریب میں یہاں کے لوگوں کو کچھ عارضی مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ موجودہ دور میں یہ بات وہی لیڈر کہہ سکتا ہے کہ جسے نہ صرف اپنے اوپر بلکہ عوام پر بھی اعتماد ہو۔ یہ وہ باتیں ہیں کہ جو یقیناً کوئی بخشی غلام محمد، کوئی شمس الدین، کوئی غلام محمد صادق یا میر قاسم نہیں کہہ سکتا۔ اس کے لئے خلوص نیت ہی نہیں، جرأت و ہمت کی بھی ضرورت ہے۔ عوام کو دو وقت روٹی مہیا کرنے کی ذمہ داری سرکار پر ہوتی ہے اور جب شیخ صاحب اس ریاست کی عنان اقتدار سنبھالیں گے تو یقیناً یہ ذمہ داری ان کی ہو گی کہ وہ کس طرح اس ریاست کی غذائی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی

اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے ریاست میں کوئی شخص بھوکوں نہیں مرے گا۔ لیکن انہیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ ریاست کو غذائی اعتبار سے خودکفیل بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں اور ہر سال پچیس پچیس کروڑ کا زرِ کثیر خوراک کی سبسڈی پر خرچ کرنے کی بجائے اسے بہتر مصرف میں لائیں تاکہ یہ بوجھ روز بروز بڑھنے کی بجائے رفتہ رفتہ کم ہوتا جائے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم سبسڈی پر ہر سال ۲۵ کروڑ روپے خرچ کرنے کی بجائے ۲۰ کروڑ روپے سالانہ کیمیائی کھاد اور زراعت پیدا کرنے کے جدید طریقوں پر صرف کر دیں؟ ہم نے جو ایک ارب روپیہ ابھی تک سبسڈی پر خرچ کیا ہے، وہ ہم زراعت کو جدید لائنوں پر منظّم کرنے پر خرچ کرتے، تو اس وقت دوسروں کے دست نگر ہونے کی بجائے ہم اوروں کی مدد کرنے کے قابل ہوتے یہی حال سروسز کا ہے کہ جہاں بقول شیخ صاحب ایک ایک جگہ پر پانچ پانچ افراد تعینات ہوئے ہیں اور اس اعتبار سے کارکردگی کا معیار بھی گر گیا ہے۔ یہ لوگ اس ریاست کا پچاس کروڑ روپیہ ہضم کر جاتے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے۔ اس میں ملازموں کا نہیں، ان سیاستدانوں کا قصور ہے کہ جو اپنا اثر رسوخ بڑھانے کے لئے یہ سارا بوجھ خزانہ عامرہ پر ڈال دیتے ہیں اور نتیجہ یہ کہ ہر شخص سرکاری ملازم بننے کی ہوس میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ وقت آنے پر اس بات کی جانچ کرنا پڑے گی کہ کس محکمے میں دراصل کتنے ملازموں کی ضرورت ہے اور کتنے لوگوں کو مروت یا سفارش کی بناء پر تعینات کیا گیا ہے۔ ان تمام غیر ضروری افراد کی فہرست بنانے کا مقصد یہ نہیں ہوگا کہ انہیں

ملازمت سے سبکدوش کر دیا جائے، بلکہ ان کے بہتر مصرف کا جائزہ لینا ہوگا۔ اس لئے اس سلسلے میں بھی بے جا طور تشویش کی کوئی بات نہیں۔ شیخ صاحب کا خیال ہے اور میں ان کے اس خیال سے سو فیصدی متفق ہوں کہ ریاست میں روزگار کے اتنے وسائل اور ذرائع موجود ہیں کہ ہر سال سینکڑوں نوجوانوں کو کام مہیا کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ہر شخص کی نگاہیں چونکہ سرکاری ملازمت پر لگی ہوئی ہیں، اس لئے ہمارے نوجوانوں کی بہترین صلاحیتوں کا اظہار نہیں ہوتا۔ جب ریاست میں مختلف النوع صنعتی اداروں کی تنظیم اور تربیت کا کام ہاتھ میں لیا جائے گا، تو روزگار اور کاروبار کے نئے نئے وسائل پیدا ہوں گے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے کاری کا مسلہ بہت حد تک حل ہو جائیگا۔ مختصر یہ کہ شیخ صاحب کی نگاہیں ریاستی عوام کے تابناک اور خوشحال مستقبل پر لگی ہوئی ہیں اور جو لوگ ان کے جذبۂ شوق اور ان کی علو ہمتی سے گھبرا گئے ہیں، ان کی حیثیت تالاب کے ان کیڑوں کی سی ہے کہ جو اپنے گرد و پیش کی غلاظت اور عفونیت کو اپنا مقصد حیات اور حاصل زیست سمجھتے ہیں۔ وہ اتنی دیر سے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں کہ انہیں عزت نفس اور خودداری کے معنی کا نہ احساس ہے اور نہ عرفان۔ وہ اپنی زنجیروں کے اس درجہ عادی ہو گئے ہیں کہ ان کے توڑنے کی ہر کوشش کو شک وشبہ کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کی حالت پر رحم کھانا چاہیئے۔ اس ریاست کو ذلت، افلاس اور پسماندگی سے نجات دے کر عزت آبرو اور آزادی کی راہ پر لائے جانے کا تاریخی فرض شیخ محمد عبداللہ کے لئے مقدر ہو چکا ہے، اس لئے کیڑے مکوڑوں کی یورش اور شورش کو نظر انداز کیا جانا چاہیئے۔ ❁❁❁

۱۵/جولائی ۱۹۷۵ء

نیشنل کانفرنس کا احیائے نو

محاذ رائے شماری کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کے فیصلے سے ریاست کی سیاسی زندگی مین تضاد اور ابہام کی وہ کیفیت ختم ہوگئی ہے کہ جو پچھلے چھ ماہ سے سیاسی کارکنوں اور ریاست کے طالب علموں کے ذہنوں پر چھائی ہوئی تھی۔ محاذ کے صدر میرزا محمد افضل بیگ نے اگرچہ محاذ کے نام میں تبدیلی کا ارادہ بہت پہلے ظاہر کیا تھا لیکن اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں جو تاخیر ہو رہی تھی اس نے بہت سے لوگوں کو اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا کر دیا تھا اور مقامی اخبارات کا ایک حصہ جان بوجھ کر یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ محاذ کے مستقبل کے متعلق محاذی لیڈروں اور کارکنوں میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ڈیلی گیٹ سیشن کے انعقاد سے چند دن پہلے محاذ کے ایک برگزیدہ رہنما صوفی محمد اکبر کے استعفیٰ اور احتجاج کی خبروں نے باہمی اختلافات کی قیاس آرائیوں کو مزید تقویت پہنچائی۔ لیکن ڈیلی گیٹ سیشن میں دو دن کے مباحثے کے بعد محاذ رائے شماری کے لیڈروں اور کارکنوں نے وہی

فیصلہ کیا کہ جس کی ایک باشعور، حقیقت پسند اور دور اندیش قیادت اور جماعت سے توقع تھی۔

محاذ رائے شماری کے لئے اپنے نام اور کام میں تبدیلی کا فیصلہ یقیناً ایک مشکل اور کٹھن مرحلہ تھا اور اس فیصلے تک پہونچنے کے لئے محاذ کے لیڈروں اور عام کارکنوں کو بہت سے ذہنی تعصّبات اورنفسیاتی الجھنوں کی دیواریں پھاندنا پڑی ہوں گی۔ وہ بیس سال سے رائے شماری کی گردان کرتے آئے ہیں اور انہوں نے اس مقصد کے حصول کے لئے بے مثال قربانیاں دی ہیں۔ اگر چہ سیاسی جماعتوں کی تاریخ میں بیس سال کا عرصہ کچھ زیادہ طویل وقفہ نہیں ہوتا لیکن محاذ کو اس مختصر سی مدت میں جن صبر آزما حالات اور دشوار گزار راستوں سے گزرنا پڑا، ان سے یہ جماعت دوسری سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں زیادہ مقبول، زیادہ منظّم اور زیادہ مستحکم بن گئی۔ رائے شماری اور حق خودارادیت کے خوبصورت اور معنی خیز نعروں نے اسے ایک ایسا رومانی طلسم عطا کیا تھا کہ اس کے ساتھ آزادی، عزت وآبرو اور جدوجہد کا ہر ممکن تصور وابستہ ہوگیا تھا۔ محاذ کے لیڈروں نے جان بوجھ کر اقتصادی نظریات اور معاشی پروگرام کے بارے میں خاموشی اختیار کر کے آزادی کے رومانی تصور کو ہی نوجوانوں کی جذباتی وابستگی کا مرکز بنایا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس حکمت عملی نے محاذ رائے شماری کو وہ مضبوط عوامی اساس عطا کی تھی کہ اس کے مقابلے میں کسی دوسری جماعت کا ٹھہرنا ناممکن بن گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی سطح پر اس کا مقابلہ کرنے کی بجائے ہر حکومت نے اسے طاقت اور تشدد سے کچلنے کی کوششیں کیں اور ۱۹۷۲ء میں اسے

ایک خلاف قانون تنظیم قرار دے کر اس کی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اپنی طاقت اور تاریخ کے اس پسِ منظر میں محاذ کا تازہ ترین فیصلہ ایک نہایت ہی جرأت مندانہ قدم ہے اور میرزا محمد افضل بیگ یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بڑے تدبّر اور طریقے سے محاذ کی اکثریت کو شیخ محمد عبداللہ کی اس رائے کا ہمنوا بنا دیا کہ موجودہ حالات میں نیشنل کانفرنس کا احیاءِ نو، سب سے قابلِ عمل اور دانشمندانہ راستہ ہے۔

نیشنل کانفرنس ہماری تحریک اور تاریخ کا ایک ایسا عنوان ہے کہ جس کے ساتھ چالیس سال کی جدوجہد ہی نہیں، ہمارے شہیدوں کا لہو اور ہمارے بزرگوں کی تمنائیں بھی وابستہ ہیں۔ اس جھنڈے تلے ہم نے نہ صرف مطلق العنان حکمرانوں کے خلاف جنگ لڑی بلکہ فرقہ واریت، مذہبی تعصب اور تنگ نظری کے خلاف بھی صف آراء ہوئے۔ ڈوگرہ راج کو ختم کرنے میں ہماری جدوجہد سے زیادہ تاریخی عوامل کا حصہ تھا کہ جو ہندوستان کی جنگ آزادی اور انگریزوں کے ہندوستان چھوڑ کر چلے جانے سے ظہور میں آئے تھے لیکن فرقہ واریت کے مقابلے میں سکیولرازم اور جاگیر دارنہ نظام کے مقابلے میں سوشلزم کا راستہ اختیار کرنا ہماری دور اندیش قیادت اور ترقی پسند سیاست کا نتیجہ ہے اور اس اعتبار سے نیشنل کانفرنس کا احیاء ماضی کے ساتھ ہمارے ان رشتوں کو استوار کرے گا کہ جن کی بنیاد پر ہم نے نیا کشمیر کے سیاسی نظام اور اقتصادی ڈھانچے کو اپنایا تھا۔ تاریخ ایک پیچیدہ جدلیاتی عمل اور انسانی کش مکش کی پیداوار ہوتی ہے اور ہر قوم کی تاریخ اس کی شخصیت اور اس کے مقدر سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس لئے یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنی

پرانی تاریخ سے دست بردار ہو کر ایک نئی تاریخ کے وارث بن سکیں۔ نیشنل کانفرنس کی تجدید نے اس تاریخی تسلسل کو بحال کر دیا ہے کہ جو ۱۹۵۳ء میں ٹوٹ گیا تھا اور جس کے ٹوٹ جانے سے ہماری تحریک اور تاریخ کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ ۲۲ سال کا درمیانی وقفہ اپنی تمام تر ناگواریوں اور نامرادیوں کے باوجود ہماری تاریخ کا ایک ناگزیر حصہ ہے اور تاریخ کا کوئی طالب علم اس سے آنکھیں بچا کر آگے نہیں بڑھ سکتا۔

محاذ رائے شماری کے ڈیلی گیٹ سیشن کا یہ تاریخی فیصلہ ریاست کی سیاسی زندگی میں اعتدال اور توازن پیدا کرنے کی جانب ایک اہم قدم ہے۔ لیکن اس موقع پر لیڈروں اور کارکنوں کی سوچ میں ایک ایسی نفسیاتی بے اعتمادی کا بھی اظہار ہوا ہے کہ جو یقیناً صحت مند قرار نہیں دی جاسکتی۔ اکثر مقررین نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ نیشنل کانفرنس میں ان لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہونا چاہیئے کہ جنہوں نے ۹/۱ اگست ۱۹۵۳ء کے بعد عوام کُش رول ادا کر کے تحریک حریت کو مجروح کر دیا۔ میری دانست میں اس خطرے کی نشان دہی کرنا، محاذی لیڈروں اور کارکنوں کی اپنی کمزوری اور بے اعتمادی ظاہر کرنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس قسم کے لوگوں کا نیشنل کانفرنس میں شامل ہو کر اس پر چھا جانے کا امکان ایک یقینی خطرہ ہے اور محاذ کے موجودہ رہنما سیاسی یا نظریاتی سطح پر اس خطرے کا مقابلہ کرنے کی بجائے ان عناصر کے داخلے پر پابندی کر کے اپنی عافیت کا سامان بہم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ رویہ نہ دانشمندی کی علامت ہے اور نہ مردانگی کی اور میرے خیال میں یہ ایک افعال سیاسی تنظیم کے

شایانِ شان بھی نہیں۔ نیشنل کانفرنس کے دروازے ہر اس شخص کے لئے کھلے ہونے چاہئیں کہ جو اس سیاسی پروگرام اور اقتصادی نظام پر یقین رکھتا ہو کہ جو نیشنل کانفرنس کا نصب العین اور منتہائے مقصود ہے اور اس یقین کا اندازہ کرنے کے لئے بہرحال اس کے قول پر ہی اعتماد کرنا پڑے گا۔ جن لوگوں کو یہ خطرہ ہے کہ ۱۹۵۳ء کے غارت گر تنظیم میں داخل ہو کر اس پر قبضہ جما لیں گے، انہیں نہ اپنی صلاحیتوں پر اعتماد ہے اور نہ عوام کی طاقت پر۔ میں تو اس بات پر وشواس رکھتا ہوں کہ نیشنل کانفرنس بنیادی طور پر اس نئی نسل اور نئی پود کی جماعت ہوگی کہ جو ۱۹۴۷ء کے بعد پروان میں سیاسی اور ذہنی طور کسی جرم کے مرتکب ہونے کے اہل نہیں تھی۔ یہ نسل بزرگوں کے تجربات سے روشنی ضرور حاصل کرے گی لیکن اسے اپنی راہیں متعین کرنے کا مکمل اختیار ہونا چاہئیے اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس نسل پر اعتبار کر کے اسے اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کے اہل بنانے میں اپنا حصہ ادا نہ کریں۔ اس پس منظر میں نیشنل کانفرنس کو ایک سیاسی تنظیم ہی کا نہیں، ایک ایسی قومی تجربہ گاہ کا درجہ حاصل ہونا چاہئے کہ جہاں مستقبل کے رہنما ماضی کے استادوں سے فیض پا کر اپنی شخصیت کی تعمیر اور اپنے کردار کی تشکیل کریں گے۔ شیخ صاحب کی ذات اور بیگ صاحب کا تجربہ ہمارے نوجوانوں کے لئے ایک ایسا بیش قیمت سرمایہ ہے کہ اس سے استفادہ حاصل کرنے کی سعادت سے محروم رہنا اس ریاست کی تاریخ اور تقدیر کا سب سے بڑا المیہ ہوگا۔ میں نیشنل کانفرنس کی موجودہ قیادت سے یہ توقع رکھوں گا کہ وہ شخصی ترجیحات، ذاتی تعصّبات اور جزوی اختلافات کی سطح سے بلند ہو

کر اس جماعت کو صحیح معنوں میں نہ صرف سیاسی اور نظریاتی طور پر ایک تجربہ گاہ تصور کریں بلکہ اپنے آپ کو ایک نئی اور نوجوان قیادت کی تیاری اور ترتیب کے لئے بھی ذمہ دار سمجھیں۔ تاکہ ملکی تعمیر کے وسیع اور پیچیدہ عمل میں، اس ملک کو بہتر سے بہتر انسان اور اعلیٰ سے اعلیٰ ذہن میسر آسکیں۔

بعض لوگوں کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے درمیان ٹکراؤ اور تصادم ناگزیر ہے اور جب تک ان دونوں جماعتوں کا الگ الگ وجود قائم رہے گا، سیاسی غیر یقینیت کی فضا ختم نہیں ہوگی۔ میں تصادم کے اس امکان کو خارج از بحث قرار نہیں دیتا لیکن میں اس وہم میں مبتلا نہیں ہوں کہ تصادم کی صورت میں کانگریس کو ہمیشہ نیشنل کانفرنس پر فوقیت یا برتری حاصل رہے گی۔ مستقبل میں دونوں جماعتوں میں اسی جماعت کو برتری حاصل رہے گی جو اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ عوامی اعتماد کے اہل ثابت کر سکے۔ ۱۹۵۳ء کے تجربے نے صرف شیخ محمد عبداللہ اور اُن کے رفقاء کو ہی نہیں، مرکزی حکومت اور حکمران کانگریس کو بھی یہ احساس دلایا ہے کہ تصادم کا راستہ تباہی کا راستہ ہے اور جب تک ریاست اور مرکز کے درمیان باہمی مفاہمت اور افہام وتفہیم کی راہیں مسدود نہیں ہوتی، ریاست کی موجودہ قیادت اور مرکزی حکومت کے درمیان غلط فہمی یا بدظنی پیدا ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں اور اگر خدانخواستہ مرکزی لیڈروں کی نیت میں فتور آگیا تو اس صورت میں شیخ صاحب کا کانگریس سے وابستہ ہونا بھی اس قیامت کو نہیں ٹال سکتا تھا کہ جس کے ڈر سے بہت سے لوگ شیخ صاحب کو کانگریس میں شامل ہونے کا مشورہ دے رہے تھے۔ بنیادی بات باہمی اعتماد واعتبار کی ہے

اور اس وقت فریقین میں کسی کی نیت یا خلوص پر شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ اب رہی بات مستقبل کی، اس کے بارے میں بڑے سے بڑا نجومی بھی قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن یہ پیش گوئی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ نیشنل کانفرنس اور نیشنل کانگریس کے درمیان تصادم کی صورت میں وہی جماعت زندہ رہے گی کہ جو حکومت سے زیادہ عوام کو طاقت پر بھروسہ کرنا سیکھے۔ شیخ محمد عبداللہ کی سرپرستی میں نیشنل کانفرنس کو جو عوامی مقبولیت حاصل ہوگی، اسے پائدار بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ نیشنل کانفرنس کے سیاسی مقاصد اور اقتصادی پروگرام کو نئے تقاضوں کے مطابق Redefineاور Re-staate کیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ نیشنل کانفرنس کے قائدین اس میں تاخیر سے کام نہیں لیں گے۔

۳۰ جولائی ۱۹۷۷ء

شیخ صاحب اور اندرا گاندھی

(نمبر..... ۱)

وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ نے آٹھ دس دن قبل شہریوں کی طرف سے دیئے گئے ایک استقبالیہ میں تقریر کرتے ہوئے جب نہرو خاندان اور مسز اندرا گاندھی کی تعریف کی، تو بہت سے لوگ اس کی سیاسی تعبیریں کرنے لگے اور چند ہی دنوں بعد مقامی اخبارات میں یہ خبریں شائع ہونے لگیں کہ مسز اندرا گاندھی شیخ صاحب کی دعوت پر کشمیر آکر ان کے خصوصی مہمان کی حیثیت سے رہیں گی۔ شیخ صاحب کے قریبی حلقوں نے ان خبروں کی نہ تصدیق کی ہے اور نہ تردید اور نہ ہی مسز اندرا گاندھی کی طرف سے کوئی ایسا اشارہ ملا ہے کہ وہ مستقبل قریب میں کشمیر آرہی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود سیاسی حلقوں میں مسز گاندھی اور شیخ صاحب کے درمیان ایک نئی مفاہمت کی خبر بڑے زوروں سے گشت کر رہی ہے اور افواہ بازوں نے یہ افواہ بھی اڑائی ہے کہ مسز گاندھی کو سرینگر یا بارہ مولہ سے انتخاب لڑنے کی پیش کش بھی کی گئی ہے میں نہیں جانتا کہ اس مبینہ نئی مفاہمت میں حقیقت کتنی ہے اور افسانہ کتنا، لیکن شیخ صاحب نے اپنی تقریر میں مسز گاندھی کے تئیں جن جذبات اور خیالات کا اظہار کیا، ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت کے سرکردہ لیڈروں کی سردمہری اور بے

اعتنائی نے انہیں مسز گاندھی کی تعریف کرنے پر مجبور کر دیا ہے اور وہ ایسا کر کے شری مرار جی ڈیسائی، شری چرن سنگھ اور دوسرے لیڈروں پر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ان کے ترکش میں بھی بہت سے تیر باقی ہیں جو ضرورت پڑنے پر استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ شیخ صاحب اچھی طرح جانتے ہیں کہ موجودہ سیاسی پس منظر میں مسز اندرا گاندھی کی تعریف مرار جی ڈیسائی اور دوسرے جنتا لیڈروں کیلئے سخت ترین گالی کا درجہ رکھتی ہے اور وہ اس پر ضرور چیں بہ جبیں نظر آئیں گے۔ جنتا لیڈروں نے چونکہ ابھی تک اس گالی پر اپنا ردعمل ظاہر نہیں کیا ہے، اس لیے شیخ صاحب نے بھی اس محاذ پر اس کے بعد کوئی پیش قدمی نہیں کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے صرف ایک ہلکا سا اشارہ کیا ہے اور اب وہ اس کے نتائج کا انتظار کر رہے ہیں۔

مسز گاندھی کے حق میں شیخ صاحب کے تعریفی کلمات سے اس ثابت شدہ حقیقت کی ایک بار پھر صراحت ہو جاتی ہے کہ سیاسی لغت میں مستقل دوستی اور مستقل دشمنی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی، آج کا دشمن کل کا بہترین دوست اور کل کا جانی دوست آج کا بدترین دشمن ہو سکتا ہے۔ اس حقیقت کی تصدیق کے لئے ایک نہیں ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ لیکن خود مسز گاندھی اور شیخ صاحب کی نئ دوستی اس حقیقت اور صداقت کی کم دل چسپ مثال نہیں ہے۔ یہ بات میں اپنے ذاتی علم اور واقفیت کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ اندرا شیخ مفاہمت کے بعد بھی مسز گاندھی کا رویہ کبھی شیخ صاحب کے تئیں دوستانہ نہیں تھا اور مفاہمت کی بات چیت کے دوران اُن کا رویہ کتنا سخت تحکمانہ، غیر دوستانہ اور بعض

اوقات توہین آمیز تھا، اس کا علم کچھ تو بیگ صاحب کو ہے اور کچھ ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو اس عرصے میں مسز گاندھی نے شیخ صاحب کے نام لکھے ہیں۔ ان ایام میں مجھے بھی کئی بار مسز گاندھی سے ملنے کا موقع ملا اور ان کے سخت گیر روّیے سے خوفزدہ ہوکر مجھے کبھی کبھی یہ احساس ہوتا تھا کہ شاید مفاہمت کی یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی، لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ شیخ صاحب اور بیگ صاحب ''ہر قیمت'' پر مفاہمت کے لئے آمادہ ہیں، اس لئے مسز گاندھی کے غیر مفاہمانہ روّیے کے باوجود یہ مفاہمت ہوکر رہے گی۔ بہرحال مفاہمت ہوگئی اور میری طرح بہت سے لوگ یہ سمجھ بیٹھے کہ اب دونوں لیڈر شیخ صاحب اور مسز گاندھی خلوص دل کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور اشتراک کر کے واقعی کشمیر کی تاریخ میں ایک نئے بات کا اضافہ کریں گے۔ لیکن مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس مفاہمت کی بنیاد باہمی اعتبار واعتماد کی بجائے باہمی تشکیک، بدظنی اور نفرت ہے اور دونوں لیڈر ایک دوسرے کو ''پیر کی عزت دینے کے باوجود ایک دوسرے کو چور کی نگاہوں ے دیکھتے ہیں'' مسز گاندھی نے مفاہمت اس لیے کی تھی کہ وہ شیخ صاحب کو اقتدار دے کر انہیں ان کے سیاسی موقف سے دستبردار کرانا چاہتی تھیں۔ شیخ صاحب نے مسز گاندھی کی شرایط پر یہ سمجھوتہ اسلئے قبول کر لیا تھا کہ انہں اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اپنی زندگی اور جدوجہد کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے کہ جہاں ۱۹۴۷ء میں جواہر لال نہرو، سردار پٹیل اور دوسرے کانگریس لیڈر نظر آتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے بہترین سال جیلوں اور جدوجہد میں گزارے تھے اور اب وہ

بڑھاپے میں کچھ دن کیلیئے حکومت اور اقتدار کی آسائشوں سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔ ان کی اس خواہش اور کمزوری سے فائیدہ اٹھا کر لارڈ ماؤنٹ بٹین نے ان سے برصغیر کی تقسیم جیسے نا قابل قبول فارمولا کو منظور کرا لیا۔ ٹھیک اسی طرح ۱۹۷۵ء میں شیخ صاحب اور بیگ صاحب مسلسل نظر بندی، جلاوطنی اور صحرا نوردی سے تنگ آکر اب اپنے بڑھاپے میں اقتدار کی آسائشوں اور لذتوں سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ ہر قیمت پر سمجھوتے کے لئے تیار تھے اور مسز گاندھی کو ہمارے رہنماؤں کی اس کمزوری کا علم ہو چکا تھا۔ شیخ اندرا مفاہمت کی دستاویز میرے اس بیان کی تصدیق بھی ہے اور شیخ صاحب کے تیئں مسز گاندھی کے غیر دوستانہ بلکہ بے رحمانہ رویے کی ایک زندہ مثال بھی۔

شیخ اندرا مفاہمت کے بعد شیخ صاحب اور مسز گاندھی کے باہمی تعلقات میں ظاہرا طور پر تو ایک خوشگواری آگئی، لیکن اس خوشگواری میں تصنع اور تکلف زیادہ تھا اور سچائی کم، اور دونوں کے درمیان تلخی اور ناگواری کا ایک سبب پردیش کانگریس کے وہ لیڈر تھے کہ جو مسز گاندھی کو بہت عزیز اور شیخ صاحب کی نگاہوں میں کھٹکتے خار تھے۔ شیخ صاحب کی خواہش تھی کہ مسز گاندھی مفتی محمد سعید اور غلام رسول کار جیسے کانگریس لیڈروں کی پشت پناہی کرنا چھوڑ دیں۔ لیکن مسز گاندھی کا موقف یہ تھا کہ ان کے لئے مفتی صاحب اور کار صاحب زیادہ قابل بھروسہ اور قابل کار ہیں اور شیخ صاحب کو سیدھی راہ پر رکھنے کے لئے مفتی اور کار کا وجود اہم ہی نہیں بہت ضروری بھی ہے۔ دونوں لیڈروں کے درمیان اس ذہنی تضاد کی وجہ سے کئی بار بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوتی تھی لیکن مفاہمت کو قائم

رکھنے اور کامیاب بنانے کے ساتھ چونکہ دونوں کا مفاد وابستہ تھا، اس لیے دونوں ایک دوسرے کو بادل ناخواستہ برداشت کرتے رہے۔

ریاست میں نیشنل کانفرنس کے قیام کے بعد شیخ صاحب اور مسز گاندھی کے درمیان بدظنی کا جذبہ کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا۔ اور اس کے بعد جب مسز گاندھی پہلی مرتبہ کشمیر آئیں تو شیخ صاحب نے ان کے غصے اور کی بیزاری کو کم کرنے کیلئے ان کے اعزاز میں ایک شان دار دریائی جلوس کا اہتمام کیا۔ شیخ صاحب کا خیال تھا کہ اس گرم جوشانہ استقبال کی وجہ سے مسز گاندھی کا رویہ ان کے اور نیشنل کانفرنس کے تئیں کچھ نرم پڑ جائے گا۔ لیکن اندرا گاندھی بھی کچھ کچی گولیاں نہیں کھیلیں تھیں۔ اس نے دوسرے دن ایمپوریم گارڈن میں نہ صرف کانگریس کی حمایت میں ایک زور دار تقریر کی بلکہ شیخ صاحب پر کئی چوٹیں بھی کیں۔ انہوں نے شیخ صاحب کے اس دعوے کو جھٹلا دیا کہ ریاست کی نازک سیاسی اور اقتصادی حالت کے پیش نظر ان سے اقتدار سنبھالنے کی درخواست کی گئی، مسز گاندھی نے کہا کہ سید میر قاسم کی قیادت میں ریاست میں مکمل سیاسی استحکام کے باوجود اگر کانگریس پارٹی نے شیخ صاحب کو اقتدار سونپا تو یہ ہماری وسعت قلبی ہے۔ انہوں نے کانگریس کے مقامی لیڈروں کا زبردست دفاع کیا اور ایسا کرتے ہوئے بڑی سخت زبان اور درشت لہجہ استعمال کیا۔ اس تقریر کا شیخ صاحب پر کیا ردعمل ہوا اس کا مجھے ذاتی علم ہے اور میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کروں گا کہ وہ اس سے نہ صرف بہت مایوس ہوئے بلکہ انہیں مسز گاندھی پر سخت غصہ بھی آیا۔ لیکن حکم حاکم مرگِ مفاجات۔ مسز گاندھی کے سامنے شیخ صاحب کا کیا بس چلتا۔ ان

کے دل پر جو گذری سو گذری، لیکن دوسرے دن انہوں نے اندرا جی کو مسکراتے ہوئے ہوائی اڈے سے رخصت کیا۔

اس کے بعد چندی گڈھ کا سانحہ پیش آیا۔ کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے استقبالیہ کمیٹی کے صدر نرنجن سنگھ طالب نے نیشنل کانفرنس کو بھی مشاہدین بھیجنے کی ایک رسمی سی دعوت دی تھی، میرا خیال تھا کہ نیشنل کانفرنس کی طرف سے دوچار کارکن یہ رسم پوری کرنے کے لئے بھیجے جائیں گے لیکن شیخ محمد عبداللہ سے لے کر شیخ غلام محمد بھدرواہی تک ہر کانفرنسی کارکن اس عزت افزائی پر پھولے نہ سماتا تھا اور شیخ صاحب نے فیصلہ کیا کہ نیشنل کانفرنس کا ایک بہت بڑا وفد چندی گڑھ اجلاس میں شرکت کیلئے جائیگا اور وہ بہ نفسِ نفیس اس کی قیادت کریں گے۔ چندی گڈھ میں نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کے ساتھ جو ہوا سو ہوا، خود شیخ صاحب کے ساتھ مسز گاندھی نے جو کچھ کیا وہ اس درجہ توہین آمیز تھا کہ چندی گڈھ سے واپسی پر جب شیخ صاحب دہلی آئے تو وہ بے حد رنجیدہ اور سنجیدہ نظر آرہے تھے۔ معلوم ہوا کہ چندی گڈھ میں مسز گاندھی نے ان کی طرف ایک بار آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا ۔ وہ جب پنڈال پر تشریف فرما ہوئے تو کسی نے ان کا نام اناؤنس نہیں کیا۔ شیخ صاحب اس خیال سے گئے تھے کہ وہ بڑی مدت کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے خطاب کریں گے۔ لیکن انہیں کسی نے تقریر کرنے کیلئے کہا ہی نہیں۔ اندرا جی کی اس ناراضگی اور برہمی کے دو سبب تھے۔ ایک یہ کہ شیخ صاحب نے چند دن قبل بمبئی پردیش کانگریس کمیٹی کے اہتمام سے منعقدہ ایک جلسے میں بڑے ہی دبے لفظوں میں ایمرجنسی کو

ختم کیے جانے کی بات کہی تھی دوسری وجہ یہ تھی کہ نیشنل کانفرنس کی طرف سے بلراج پوری کا لکھا ہوا ایک پمفلٹ نیشنل کانفرنس کیوں کے نام سے ڈیلی گیٹوں میں تقسیم کیا گیا تھا ان دونوں وجوہات کی بناء پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کے لیے مسز گاندھی نے جو رویہ اختیار کیا وہ اتنا توہین آمیز اور اشتعال انگیز تھا کہ میرا خیال تھا کہ شیخ صاحب اس پر شدید ردعمل کا اظہار کر کے مسز گاندھی پر یہ بات واضح کردیں گے کہ وہ ان سے اور ان کی حکومت سے مرعوب یا خوفزدہ نہیں ہیں۔ لیکن دوسرے ہی دن شیخ صاحب نے دہلی ہی میں منعقدہ ایک تقریب پر تقریر کرتے ہوئے ایمرجنسی اور بیس نکاتی پروگرام کی تعریف کی اور میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔

چند ماہ بعد ایک اور نازک مرحلہ آیا، کانگریس لیجسلیچر پارٹی کے ایک باغی گروپ نے نیشنل کانفرنس میں شمولیت کا فیصلہ کرنے کی غرض سے شیر کشمیر پارک میں ایک کنونشن کا اہتمام کیا اور شیخ صاحب نے خلاف توقع نہ صرف اس میں شرکت کی، بلکہ ان باغیوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کچھ ایسی باتیں بھی کہیں کہ جس سے کانگریس پر تنقید کی بو آتی تھی۔ دوسرے دن دلی سے لے کرناروادا[1] تک ایک ہنگامہ بپا ہوگیا، اور گردھاری لال ڈوگرہ سے لیکر اندرا گاندھی تک ہر کانگریسی لیڈر نے شیخ صاحب کے تیئں اپنی ناراضگی اور برہمی کا برملا اظہار کیا۔ آل انڈیا ریڈیو نے شیخ صاحب کے اس جرم پر ہرایرے غیرے نتھو خیرے کا بیان نشر کرنا شروع کردیا اور ایساد کھائی دینے لگا کہ مفاہمت کی نازک ڈور بس ٹوٹنے ہی والی ہے۔

[1] اننت ناگ کا ایک دور دراز گاؤں۔

❀❀❀

۳۱ جولائی ۱۹۷۷ء

شیخ صاحب اور اندرا گاندھی

(نمبر....۲)

عبدالغنی لون اور ان کے ساتھیوں کے کنونشن میں شرکت کرنے پر مسز گاندھی شیخ صاحب سے اس درجہ ناراض ہوگئیں کہ شیخ اندرا مفاہمت کے بعد پہلی مرتبہ وہ بھی شیخ صاحب کو اقتدار سے محروم کرنے کے سوال پر سنجیدگی سے غور کرنے لگیں۔ سید میر قاسم جو اس سے پہلے متعدد بار مفاہمت اور مصالحت کا فریضہ انجام دے چکے تھے اب کی بار اس درجہ مایوس نظر آرہے تھے، کہ انہوں نے مجھے کہا کہ صورت حال بہت نازک ہے، مسز گاندھی کی برہمی اور دہلی کی چیخ وپکار سے شیخ صاحب بھی کچھ گھبرا گئے اور انہوں نے مسز گاندھی کے نام ایک وضاحتی خط میں اپنی صفائی پیش کرنا ضروری سمجھا۔ میں جب یہ خط لے کر مسز گاندھی کے سیکرٹری شری پی، این، در کے پاس پہنچا، تو مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ اس خط کا مضمون ان تک پہلے ہی پہنچ چکا ہے۔ شیخ صاحب کی صفائی کا مسز گاندھی اور دوسرے کانگریسی لیڈروں پر کیا اثر ہوا، میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اس کے بعد کچھ ایسا محسوس ہونے لگا کہ طوفان تھم گیا ہے۔ اس کے چند دن بعد جب شیخ صاحب نے کچھ پبلک جلسوں میں عبدالغنی لون جیسے نوجوانوں کو قوم کا قابل فخر سرمایہ اور اپنی امیدوں کا مرکز کہنا شروع کر

دیا، تو نئی دہلی میں پھر بے چینی اور برہمی کے آثار نظر آنے لگے۔ لیکن بیگ صاحب کی مداخلت اور تلخ نتائج کے احساس سے گھبرا کر شیخ صاحب نے جلد ہی یہ سلسلہ بند کر دیا۔

پھر کچھ دنوں بعد کانگریسی حلقوں نے وزارت میں توسیع کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا اور شیخ صاحب نے کانگریس کی مرکزی اور مقامی قیادت کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے اس مطالبے پر ہمدردانہ غور کرنا تسلیم کر لیا۔ ادھر قاسم صاحب سے اس سلسلے میں صلاح ومشورہ کیا جانے لگا اور ادھر شیخ صاحب نے اپنے ساتھیوں سے بھی تبادلہ خیال شروع کر دیا۔ چند دنوں بعد جو صورت حال ابھری، اس کے مطابق کانگریسی وزیروں میں اضافے کے ساتھ ساتھ شیخ صاحب نیشنل کانفرنس سے وابستہ کئی افراد کو بھی کابینہ میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ ان کی دلی خواہش تو عبدالغنی لون کو وزیر بنانے کی تھی لیکن وہ جانتے تھے کہ لون کا نام مسز گاندھی کے لیے ناقابل برداشت ہوگا۔ اس لیے انہوں نے لون کے دوسرے ساتھیوں اشرف خان، محمد شفیع اوڑی اور عبدالغنی میر کو وزیر مملکت بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ شیخ صاحب کو غالباً یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان تین باغیوں کی کابینہ میں شمولیت بھی مسز اندرا گاندھی کو سخت ناپسند ہوگی۔ کابینہ میں توسیع کا اعلان ہونا ہی تھا کہ ریاست میں ایک اچھے خاصے سیاسی بحران کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ مسز گاندھی نے سید میر قاسم سے غالباً پہلی بار سخت لہجے میں بات کر کے ان پر یہ الزام لگایا کہ انہیں کشمیر کی صحیح صورتحال کا اندازہ نہیں اور وہ اس سلسلے میں انہیں صحیح مشورے دینے کی اہلیت کھو بیٹھے ہیں۔ پردیش کانگریس کے صدر مفتی

محمد سعید کو دہلی طلب کر لیا گیا، اور اعلیٰ ترین سطح پر مشورے ہونے لگے کہ اس صورت حال کا کیا علاج کیا جائے۔ مسز گاندھی نے صدر کانگریس مسٹر بروا اور دوسرے صلاح کاروں کو ایک طرف چھوڑ کر براہ راست کشمیر کے معاملات سے نپٹنے کی ذمہ داری سنبھالی اور عین اس دن جبکہ نئے وزیروں کو حلف اٹھانا تھا، کانگریس وزیروں کو حکم دیا گیا کہ وہ حلف نہ اٹھائیں۔ اس کاروائی کا مقصد شیخ صاحب پر یہ واضح کرنا تھا کہ وہ اتنے خودمختار نہیں ہیں کہ جتنا وہ اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔ مسز گاندھی کا یہ وار بھرپور بھی تھا اور ناقابل برداشت بھی اور ہر شخص یہی سوچتا تھا کہ شیخ صاحب اس توہین آمیز سلوک پر سخت ردعمل ظاہر کر کے کوئی اہم قدم اٹھائیں گے۔ ایک اندازہ تھا کہ وہ کانگریسی وزیروں کو نظر انداز کر کے نیشنل کانفرنسی وزیروں کو حلف دلائیں گے۔ دوسرا قیاس یہ تھا کہ وہ وزارت اعلیٰ سے مستعفی ہو کر گورنر سے ریاستی اسمبلی کو برخواست کرنے کی سفارش کریں گے۔ لیکن دونوں اندازے غلط ثابت ہوگئے۔ شیخ صاحب ٹھیک وقت پر راج بھون پہنچے اور وہاں موجود لوگوں کے سامنے ایک انتہائی صلح کن تقریر میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ بعض غلط فہمیوں کی بناء پر کانگریسی وزیروں نے حلف نہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہوں نے اس مرحلے پر اس بات کا اظہار کرنا بھی ضروری سمجھا کہ وہ اپنی طاقت کانگریس سے حاصل کرتے ہیں اور وہ ان کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش جاری رکھیں گے۔ میں اس دن دہلی میں تھا اور مجھے معلوم نہیں کہ شیخ صاحب کی یہ تقریر کس نے لکھی تھی۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ اس دن دہلی میں کانگریسی حلقے بہت مسرور نظر آرہے تھے اور مسز گاندھی

کے قریبی حلقوں سے معلوم ہوا کہ وہ اپنی حکمت عملی کی کامیابی سے بے حد خوش ہیں۔ اسکے بعد کابینہ میں توسیع کا مسئلہ غیر معتین عرصے کے لیے ٹل گیا۔ لیکن مسز گاندھی کو یہ احساس ہو گیا کہ اب شیخ صاحب انہیں کسی قیمت پر ناراض نہیں کریں گے اور پارلیمانی انتخابات کا اعلان ہونے تک کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا کہ جو مسز گاندھی کے اس احساس کو غلط ثابت کرتا... پارلیمانی انتخابات کا اعلان کرتے ہی مسز گاندھی نے یہ محسوس کیا کہ اب انہیں اس مرحلے پر شیخ صاحب کے تعاون اور ان کی امداد کی ضرورت پڑے گی۔ اس لئے انہوں نے ہر قیمت پر شیخ صاحب کو خوش رکھنے کی کوشش کی۔ ادھر شیخ صاحب کو یہ اندازہ تھا کہ مسز گاندھی بہرحال انتخاب جیتیں گی اور وہ پھر وزیر اعظم ہوں گی۔ اس لیے وہ بھی انہیں ہر قیمت پر خوش رکھنے کے لئے تیار تھے۔ پارلیمانی انتخابات کے دوران وادی میں نیشنل کانفرنس اور کانگریس کے باہمی سمجھوتے کے باوجود دونوں نے ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنا شروع کردی اور دونوں کے درمیان بدظنی اور بیزاری کی خلیج بڑھتی گئی۔ اُدھر مسز گاندھی ہی نہیں ان کی جماعت کو بھی انتخابات میں بری طرح شکست ہوئی اور ملک کا سیاسی نقشہ بدل گیا۔ اس اہم مرحلے پر کانگریس نے شیخ صاحب کی حکومت کو اپنے تعاون سے محروم کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ فیصلہ مسز گاندھی کے مشورے سے کیا گیا۔ شیخ صاحب نے مسز گاندھی سے مل کر انہین اس معاملے میں مداخلت کرنے کی اپیل کی تو انہوں نے تنظیمی معاملات سے لاتعلقی ظاہر کردی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔

شیخ صاحب کے تئیں مسز گاندھی کے ذہنی اور سیاسی رویے کی یہ داستان دہرانے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ شیخ صاحب کہیں نہرو خاندان اور مسز گاندھی کی مدح خوانی میں سیاسی تاریخ اور حالیہ واقعات کونظرانداز نہ کردیں۔ جواہرلال نہرو کے بارے میں میں صرف یہ کہنا چاہوں گا کہ ۱۹۵۳ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک جو کچھ ہوا اسکی سیاسی اور اخلاقی ذمہ داری ان پر اور صرف ان پر عاید ہوتی ہے اوراس وقفے کو اگروہ جنتا پارٹی کی ضد میں شرافت انسانیت اور کشمیر پر نہرو خاندان کے احسانات کا دور قرار دیں تو وہ ان کی مرضی ہے لیکن مسز گاندھی نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ان کے ساتھ جو کچھ کیا اسے کسی قیمت پر بھی انسانیت، شرافت یا مہذب سیاست کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ میں صرف انہیں یہ یاد دلانا چاہوں گا کہ ۱۹۷۱ء کے پارلیمانی انتخابات کے وقت جب شیخ صاحب اور بیگ صاحب نے ان انتخابات میں حصہ لے کر ملک کی سیاسی زندگی میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو یہ مسز گاندھی ہی تھیں کہ جس نے بغیر کسی وجہ یا اخلاقی جواز کے نہ صرف انہیں جلاوطن کردیا بلکہ محاذ رائے شماری کو خلاف قانون قرار دے کر ہزاروں لوگوں کو انتخاب میں حصہ لینے کے حق سے محروم کردیا۔ اس کے چار سال بعد جب محترمہ نے کشمیر ایکارڈ کے نام سے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہا تو یہ کفارہ ان گناہوں سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور توہین آمیز تھا کہ جو کشمیر کی سیاسی تاریخ پر ایک بدنما دھبے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

شیخ صاحب کو مسز اندرا گاندھی اور نہرو خاندان کی محل بے محل تعریفیں کرتے وقت یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اگر آج مسز گاندھی برسراقتدار

ہوتی تو کشمیر میں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کا خواب کبھی بھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوتا۔ کانگریسی لیڈر آج ہمیں طعنہ دیتے ہیں کہ جنتا پارٹی کے لیڈر نکمے اور نالایق ہیں اور ان کے نکمے پن اور نالائقی کی وجہ سے شیخ صاحب کو حالیہ انتخابات میں غیر معمولی اور غیر متوقع کامیابی حاصل ہوئی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ مسز گاندھی برسراقتدار ہوتیں تو ان کی جماعت کو انتخاب لڑنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔

مجھے معاف کیجئے کہ ماضی کی روشنی میں مجھے ان کا دعویٰ صحیح معلوم ہوتا ہے اسلئے شیخ صاحب کو مسز گاندھی سے اپنی دوستی کے ذکر پر فخر اورمسرت کا اظہار کرنے کی بجائے جنتا پارٹی کی مرکزی حکومت کا شکرگذار ہونا چاہئے کہ جسکی بدولت اس ریاست کی تاریخ میں پہلی بار آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخاب منعقد ہوئے اور شیخ صاحب کو اپنی ساری قوت اور عوامی مقبولیت کے مظاہرے کا موقع ملا۔ مسز گاندھی برسراقتدار ہوتیں تو آپ آج سرینگر کے سیکریٹریٹ میں براجماں ہونے کی بجائے کوڈے کنال کے کسی ریسٹ ہاوس میں اپنا ذوقِ باغبانی پورا کرتے ہوتے!۔

❀❀❀

۲۲ ستمبر ۱۹۷۷ء

ہنگامی حالات کے ہنگامے

زیر تصنیف کتاب کا ایک باب

۱۱ جون ۱۹۷۵ء کو سرینگر میں وزرائی اعلیٰ کی زونل کانفرنس منعقد ہو رہی تھی اور اس سلسلے میں پنجاب کے گیانی ذیل سنگھ اور ہماچل پردیش کے مسٹر پرمار کے علاوہ مرکزی وزیر داخلہ شری برہما نند ریڈی اور وزیر مملکت شری ادم مہتہ بھی سرینگر میں موجود تھے۔ باوجود اس کے کہ الہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس جگ موہن سنہا نے مسز اندرا گاندھی کے خلاف شری راج نراین کی انتخابی غدرداری کا فیصلہ سنانے کے لئے کی ۱۲ جون کی تاریخ مقرر کر دی تھی، شری بریمانند ریڈی، ادم مہتہ اور گیانی ذیل سنگھ کے چہرے سے کسی قسم کے تردد، تشویش یا بے اطمینانی کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اس اطمینان اور انہماک سے زونل کانفرنس میں مصروف تھے کہ جیسے دوسرے دن (۱۲ جون) کو سنانے جانے والے فیصلے کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ عین ممکن ہے کہ انہیں وزیر اعظم کے خلاف دائر کردہ انتخابی عذرداری کے مسترد کئے جانے کا اس درجہ یقین تھا کہ وہ اپنی زیادہ اہم مصروفیات سے توجہ ہٹا کر اس معمول کے معمولی مسلے کو زیادہ اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ چند دن پہلے جب میں نے ریاست کے سابق وزیر اعلیٰ اور کانگریس کے ایک اہم لیڈر رسید

میر قاسم سے دریافت کیا تھا کہ مسز گاندھی کے خلاف انتخابی عذرداری کے متعلق ان کا کیا خیال ہے؟ تو انہوں نے بڑے اعتماد اور بڑی قطعیت کے ساتھ کہا تھا کہ "یہ مقدمہ ہم جیت جائیں گے اور اس سلسلے میں ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہے" میرے بار بار پوچھنے پر معلوم ہوا کہ قاسم صاحب کے اعتماد اور یقین کی بنیاد مسز گاندھی کے وکیل مسٹر کھارے سے ان کی تازہ ملاقات تھی۔ اور یہ بات بھی مجھے انہوں نے ہی بتائی کہ مسٹر کھارے آج کل کشمیر میں ہیں۔ قصہ مختصر کہ حکمرانوں، حکمران جماعت کے لیڈروں اور ملزم کے وکیلوں، سب کو یہ اطمینان تھا کہ وزیر اعظم کے خلاف انتخابی عذرداری کا فیصلہ ان کے حق میں ہوگا، ان کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ اس دن سرینگر کے براڈوے ہوٹل میں زونل کانفرنس میں حصہ لینے والے وزرء اعلیٰ کے اعزاز میں ایک لنچ دیا گیا تھا، اور یہاں میری ملاقات وزیر داخلہ شری برہمانند ریڈی سے ہوئی۔ ریڈی صاحب حسبِ معمول سفید دھوتی، سفید ٹوپی اور سفید کرتے میں اطمینان اور سکون کی تصویر نظر آرہے تھے۔ انہوں نے میری تعریف کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ سے کہا کہ ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے شمیم صاحب کو پارلیمنٹ میں بھیج کر پارلیمنٹ میں زندگی پیدا کر دی ہے۔ شیخ صاحب نے اس کا کیا جواب دیا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں، لیکن شیخ صاحب کے جواب پر دونوں لیڈروں نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا۔ اس مرحلے پر اوم مہتہ بھی آگئے اور گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ شری مہتہ نے مجھے بتایا کہ وہ اور شری برہمانند ریڈی کل بعد دوپہر واپس دہلی جا رہے ہیں۔ مجھے بھی ایک پارلیمنٹری کمیٹی کی میٹنگ میں

شرکت کے لئے دہلی جانا تھا، اس لئے میں نے بھی ان کے ہمراہ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ شری ریڈی اور ادم مہتہ وزارت داخلہ کے جہاز میں آئے تھے اور وہ اسی جہاز سے واپس جا رہے تھے۔

شام کو وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کی سرکاری قیام گاہ پر مرکزی وزراء اور شمالی زون کے وزراء اعلیٰ کے اعزاز میں شیخ صاحب کی طرف سے ایک پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سرکاری قیام گاہ کے صحن میں ایک خوبصورت شامیانہ نصب کر کے اسے بجلی کے رنگین قمقموں سے سجایا گیا تھا اور ریاستی محکمہ اطلاعات کے کلچرل یونٹ کے فن کار ایک کونے میں رقص وموسیقی کا پروگرام پیش کر رہے تھے۔ برہما نند ریڈی، ادم مہتہ گیانی ذیل سنگھ، سید میر قاسم اور دوسرے سب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ گپ شپ میں اس طرح مصروف تھے کہ بہت دیر تک کسی کو کھانے کی سدھ ہی نہیں رہی۔ دس ساڑھے دس بجے رات جب کھانے کی محفل ختم ہوئی تو شری اوم مہتہ نے مجھے بتایا کہ جہاز کی روانگی کے وقت میں کچھ تبدیلی ہوگئی ہے اور اب ہم کل صبح آٹھ بجے دہلی کے لئے روانہ ہوں گے۔

روس میں ہندوستان کے سفیر شری درگاہ پرشاد در ان دنوں دہلی کے پنت ہسپتال میں بیمار تھے۔ میں نے جب شیخ صاحب سے ذکر کیا کہ میں کل صبح سویرے شری برہمانند ریڈی اور اوم مہتہ کے ساتھ دہلی جا رہا ہوں تو انہوں نے کہا کہ میں علی الصبح ایک گلدستہ بھیجوں گا، یہ میری طرف سے ڈی، پی کو دے دینا۔

۱۲ جون کی صبح کو میں سات ساڑھے سات بجے ہوائی اڈے کے

لئے تیار ہو رہا تھا کہ میرے دوست امرت ملہوترہ سج دھج کر نازل ہو گئے۔ امرت ملہوترہ جموں کے ایک نوجوان ایڈوکیٹ ہیں۔ وہ ان دنوں کانگریس کے ایک سرگرم رکن ہونے کے علاوہ شیخ صاحب کے بہت قریب سمجھے جاتے تھے۔ ان کا یوں صبح سویرے آنا مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ لیکن امرت کے ہاتھ میں پھولوں کا خوشنما گلدستہ دیکھ کر میں ان کی آمد کا مطلب اور مقصد سمجھ گیا۔ امرت ملہوترہ کو ناشتے میں شرکت کی دعوت دیتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ وہ آج کچھ غیر معمولی سنجیدہ اور متفکر نظر آرہا ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ اس کے سینے پر کچھ بوجھ ہے جسے وہ ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اسکی سنجیدگی اور بے اطمینانی کا سبب جاننا چاہا، تو امرت نے کہا ''آج مسز گاندھی کے مقدمے کا فیصلہ سنایا جانے والا ہے''۔

''تو یہ کونسی خبر سنائی آپ نے اور پھر آپ شہر کے اندیشے میں کیوں دبلے ہوتے جارہے ہیں''؟ میں نے چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

''بہت بڑا دھماکہ ہونے والا ہے۔ تم نہیں جانتے!'' امرت ملہوترہ نے اس گھمبیر لہجے میں کہا کہ جیسے وہ کسی ایسے اہم راز کا انکشاف کرنے والا ہو کہ جس پر ساری دنیا کی بقاء کا دارومدار ہو۔ میں امرت سے اس قسم کی باتیں سننے کا عادی ہو چکا تھا، اس لئے میں اسکے سنجیدہ لہجے اور رنجیدہ چہرے کو چنداں وقعت نہیں دی، میری اس بے نیازی اور سردمہری کو میری لاعلمی اور جہالت سے تعبیر کر کے امرت نے اب میری معلومات میں اضافہ کرنے کی مہم شروع کر دی،

''آپ کو معلوم ہے کہ فیصلہ کیا ہے؟'' امرت نے اس انداز سے پوچھا کہ جیسے خود اسے فیصلے کا علم تھا۔ ''جی ہاں مجھے معلوم ہے کہ فیصلہ کیا

ہے، عذرداری مسترد ہوگی اور راج نرائین کو مقدمے کا خرچہ برداشت کرنا پڑے گا'' میں نے اپنے قانونی علم سے زیادہ سید میر قاسم سے اپنی حالیہ گفتگو کی بنیاد پر اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔

''جی نہیں آپ بے وقوفوں کی جنت میں رہ رہے ہیں۔ فیصلہ مسز گاندھی کے خلاف ہونے والا ہے اور دلی کے سرکاری حلقوں میں اس وقت ہاہا کار مچی ہوئی ہے آپ کو معلوم ہے کہ برہمانند ریڈی اور ادم مہتہ دوپہر کو دہلی لوٹنے کے بجائے ۸ بجے کیوں جا رہے ہیں؟۔شری امرت ملہوترہ نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں دلیل بھی پیش کر دی اور میں اس الجھن میں پڑ گیا، کہ اسکی بات کا اعتبار کروں یا اسے اس کے واہمے سے تعبیر کر کے نظر انداز کر دوں، امرت کی فراہم کردہ خبریں اکثر صحیح ہوا کرتی ہیں۔ وہ اتنے لوگوں سے ملتا ہے اور اس کے تعلقات کا دایرہ اتنا وسیع ہے کہ اسے ہر چیز کی خبر رہتی ہے۔ لیکن اسے جسٹس سنہا کے اس فیصلے کا علم کیسے ہو سکتا ہے کہ جو ابھی دو گھنٹے بعد سرینگر سے تقریباً آٹھ سو میل دور الہ آباد کی ہائی کورٹ میں سنائے جانے والا تھا۔ یہ سوال ۱۲ جون ۱۹۷۵ء کو صبح کے آٹھ بجے میرے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ اور آج دو سال بعد بھی مجھے اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں مل رہا ہے۔ اپنے گھر سے ایرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے امرت ملہوترہ نے مزید اہم انکشافات بھی کئے ۔ اس نے کہا ''فیصلہ آج دس بجے سنایا جائے گا۔ اس کے فوراً بعد مسز گاندھی کا وکیل اپیل دائر ہونے تک فیصلے پر عمل درآمد ملتوی کیے جانے کی درخواست پیش کرے گا، جو منظور کی جائے گی، مسز گاندھی کا وکیل مسٹر کھارے پچھلے ایک ہفتے سے یہیں تھا۔

گذشتہ کل رات ساری پولیس اس کا کھوج لگانے میں مصروف تھی۔ وہ بڑی مشکل سے پہلگام کے ایک ہوٹل میں مل گیااور وہ اس وقت الہ آباد پہنچ چکا ہوگا۔"

میں نے اس وقت امرت ملہوترہ کی باتوں کا اعتبار نہیں کیا۔ لیکن صرف دو گھنٹے بعد اسکی ہر بات صحیح ثابت ہونے والی تھی۔

آٹھ بج چکے تھے۔ جہاز رن وے پر بالکل تیار کھڑا تھا۔ اعلیٰ سول افسر اور پردیش کانگریس کے کئی رہنما شری برہما نند ریڈی کو الوداع کہنے کے لئے ایر پورٹ پر موجود تھے۔ لیکن مسٹر ریڈی اور اوم مہتہ کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ ساڑھے آٹھ بج گئے اور پھر پونے نو۔ ائر پورٹ پر جمع لوگ وزیروں کی آمد میں اس تاخیر پر قیاس آرائیوں میں مصروف تھے کہ دور سے ایک جیپ آتی ہوئی دکھائی دی۔ چند لمحوں بعد اس میں ایک پولیس افسر برآمد ہوا اور اس نے ڈی آئی جی محمد سلطان سے مخاطب ہو کر کہا کہ "ڈی، پی صاحب مر گئے ہیں اور مسٹر برہما نند ریڈی شیخ صاحب کے ساتھ ان کی قیام گاہ پر گئے ہیں۔"

"ڈی، پی مر گئے۔ جس کسی نے بھی سُنا اس نے یقین کرنے سے انکار کر دیا لیکن کسی کے یقین کرنے نہ کرنے سے موت کا کیا تعلق؟ یہ تو ایسی بے رحم اور بے مروت حقیقت ہے کہ خدا کی خدائی سے انکار کرنے والے بھی اس سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتے۔

رفتہ رفتہ ڈی، پی کی موت کی خبر نے سارے ماحول پر اداسی طاری کر دی، میں نے ڈی، پی کے لئے شیخ صاحب کے بھیجے ہوئے گلدستے پر نگاہ ڈالی۔ تو مجھے یہ مسکراتے ہوئے پھول بھی روتے ہوئے

نظر آئے۔ ڈی، پی میرا دوست نہیں دشمن تھا۔ لیکن ایسا دشمن کہ اس پر بہت سی دوستیاں نچھاور کی جا سکتی تھیں۔ ابھی صرف ایک ہفتہ پہلے سرینگر میں اپنی قیام گاہ پر ڈی، پی نے کتنی حیات آمیز اور حیات پرور باتیں کی تھیں اور کل کی یہ حقیقت آج افسانہ بن گئی تھی۔

ڈی، پی کی موت نے میرے ذہن سے مسز اندرا گاندھی، جگ موہن سنہا، راج نرائن، امرت ملہوترہ سب کو باہر نکال دیا اور میں صرف ڈی، پی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کچھ دیر بعد برہما نند ریڈی، اوم مہتہ اور گیانی ذیل سنگھ آئے۔ ان سب کے چہرے اترے ہوئے تھے اور میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ ڈی، پی کی موت کے غم میں مبتلا ہیں یا الہ آباد کے متوقع فیصلے کے غیر متوقع نتائج سے خائف ہیں۔ جہاز سوانو بجے روانہ ہوا۔ برہما نند ریڈی سرینگر سے دلی تک دو گھنٹے کے سفر میں بالکل خاموش رہے لیکن میں اور اوم مہتہ ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ میں نے جب اوم مہتہ سے کہا کہ میری اطلاع یہ ہے کہ فیصلہ وزیر اعظم کے خلاف ہونے والا ہے تو اس نے میری تائید کی، وہ انتہائی پریشان بلکہ بدحواس نظر آرہا تھا۔ گیانی ذیل سنگھ بھی بہت بے چین لگ رہے تھے۔ صرف برہما نند ریڈی کے چہرے پر ایک عجیب طرح کا سکون چھایا ہوا تھا۔ اس بے چارے کو یا تو کچھ معلوم ہی نہیں تھا یا سب کچھ معلوم ہوتے ہوئے بھی وہ انجان نظر آرہا تھا۔ اوم مہتہ کو اس کا یقین ہو گیا تھا کہ الہ آباد ہائی کورٹ کا فیصلہ مسز اندرا گاندھی کے خلاف ہوگا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ سدھارتھ شنکر رے اور رجنی پٹیل نے ہمیں گمراہ کر دیا اور ہم نے کیس پوری توجہ کے ساتھ نہیں لڑا۔ اس کا

دعویٰ تھا کہ اس نے کئی بار وزیر اعظم کو کہا کہ ہمیں اس کیس میں زیادہ دلچسپی لینی چاہئے لیکن سدھارتھ اور رجنی ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ راج نراین کا کیس بہت کمزور ہے اور گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اوم مہتہ نے یہ بھی کہا کہ میں نے جسٹس سنہا سے رابطہ قایم کرنے کا بھی مشورہ دیا تھا، لیکن میری کسی نے نہیں سنی۔ بے چارے مہتہ کو اس وقت کیا معلوم تھا کہ کچھ لوگوں نے اس سے مشورہ کئے بغیر ہی اس کے مشورے پر عمل بھی کیا تھا۔ شری اوم مہتہ کے اضطراب اور اضطرار کو دیکھتے ہوئے میں نے اُس سے پوچھا کہ اب وہ کیا کریں گے؟ ''معاملہ مشکل ضرور ہے لیکن اتنی آسانی سے ہم اقتدار چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ دیکھو کیا ہوتا ہے؟'' اوم مہتہ نے دو گھنٹے کی پرواز کے دوران پہلی مرتبہ مسکراتے ہوئے کہا اور مجھے پہلی بار ایسا محسوس ہوا کہ مسز گاندھی اور ان کے مشیروں کے درمیان اس موضوع پر پہلے بھی ضرور بات ہوئی ہو گی اور انہوں نے عدالتی فیصلہ وزیر اعظم کے خلاف ہونے کی صورت میں ضرور کسی متبادل منصوبے پر غور کیا ہوگا۔

۱/۵ اکتوبر ۱۹۷۷ء

ہنگامی حالات کے ہنگامے

زیرِ تصنیف کتاب کا دوسرا باب

گیارہ بجے کے قریب جہاز پالم کے ہوائی اڈے پر اُترا۔ جہاز کی سیڑھیوں سے اترتے ہی برہمانند ریڈی کو شری اوم مہتہ کے پی، اے مسٹر گپتا نے ٹیلی پرنٹر کی ایک سلپ دکھائی جسے دیکھ کر مسٹر ریڈی کا رنگ فق ہو گیا۔

جسٹس سنہا نے نہ صرف مسز گاندھی کے انتخاب کو کالعدم قرار دیا تھا بلکہ انتخاب میں ناجائز طریقے استعمال کرنے کی پاداش میں چھ سال تک کسی انتخابی عہدے پر فائز ہونے کے نااہل بنا دیا تھا۔ اس خبر سے مسٹر برہمانند ریڈی کی جو حالت ہوگئی، اُس سے ظاہر ہو رہا ہے تھا کہ اس معصوم کو اس سے پہلے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں تھا، جب کہ شری اوم مہتہ اور گیانی ذیل سنگھ دونوں کے ردِ عمل سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ پہلے سے ہی یہ سب کچھ سننے کے لئے تیار تھے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ چھ سال تک نااہلیت کی خبر سننے پر اوم مہتہ بھی کچھ حواس باختہ نظر آنے لگے۔ میں نے پہلی بار ان کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے دیکھے۔ گیانی ذیل سنگھ کا چہرہ ان کی داڑھی کے نیچے چھپا ہوا تھا، اس لئے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ان پر کیا گذر رہی ہے۔ داڑھی رکھنے کا کم از کم یہ ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے!

ہوائی اڈے پر ہی یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ ڈی، پی در کی لاش کو پنت ہسپتال سے ۵ پرتھوی راج روڈ پر لایا جا رہا ہے۔ اس لئے میں شری اوم مہتہ کی گاڑی میں بیٹھ کر پرتھوی راج روڈ پر واقع کشمیر ہاؤس کی

طرف روانہ ہوا اور خود مہتہ صاحب گیانی ذیل سنگھ کے ساتھ مسز گاندھی کی قیام گاہ پر گئے۔ برہما نند ریڈی بھی غالباً وہیں چلے گئے۔

میں کشمیر ہاؤس پہنچا، تو ڈی، پی کی لاش وہاں ایک کمرے میں رکھی جا رہی تھی۔ عزیز و اقارب، دوست احباب، غیر ملکی سفیروں، سیاسی لیڈروں، اخباری نمائندوں اور فوٹو گرافروں کا ایک ہجوم تھا۔ المیہ یہ تھا کہ ڈی، پی صاحب کی اہلیہ ماسکو میں تھیں اور انتم سنسکار تک ان کا انتظار کرنا ضروری تھا۔ وہ وہاں سے روانہ ہو چکی تھیں۔ لیکن وہ کب اور کس وقت پہنچیں گی یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ میں شیخ صاحب کا دیا ہوا، گلدستہ لے کر ڈی، پی صاحب کی لاش کے قریب پہنچا، تو میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے اور چند لمحوں بعد میں نے زار زار رونا شروع کر دیا۔ ڈی، پی سے میری دوستی کم رہی ہے، دشمنی زیادہ۔ ریاستی اسمبلی میں میرے اور ان کے درمیان بڑے معرکے ہوئے ہیں، اور بعض اوقات ہمارے درمیان سخت تلخ کلامی اور تکرار ہوا کرتی تھی۔ میں نے اپنے اخبار میں بھی ان کے خلاف بڑے سخت مضامین لکھے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس شخص میں ایک تمکنت، ایک شان اور ایک رکھ رکھاؤ تھا۔ وہ جب مرکزی حکومت میں پلاننگ کے وزیر بن گئے تو ان کے ساتھ میری راہ و رسم کچھ زیادہ بڑھ گئی۔ اس دوران میں مجھے انہیں کچھ زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور میں نے محسوس کیا کہ ڈی، پی پہلے کے مقابلے میں بہت بدل گئے ہیں۔ شیخ صاحب اور مسز اندرا گاندھی کے درمیان مفاہمت کو ممکن بنانے میں انہوں نے بہت اہم اور تعمیری رول ادا کیا اور اس کا احساس خود شیخ صاحب کو بھی تھا۔ ورنہ شیخ

صاحب اپنے سیاسی مخالفین کو پھول وُول بھیجنے کے چکر میں نہیں پڑتے، وہ تو مرنے کے بعد بھی اپنے دشمنوں کے خلاف اپنی نفرت اور انتقام کی جنگ جاری رکھنے کے قائل ہیں۔ لیکن ڈی، پی ایک استثنا تھے۔ ان کی موت پر میں نے شیخ صاحب کو پہلی بار بے تحاشا روتے دیکھا ہے۔

میں نے پھولوں کا گلدستہ، پھولوں میں ڈھکی ہوئی ڈی، پی کی لاش کے قدموں میں رکھ دیا اور یہ سوچنے لگا کہ ڈی، پی زندہ ہوتے، تو الہٰ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے پر ان کا ردعمل کیا ہوتا۔ اسے مسز اندارا گاندھی سے جو گہری وابستگی رہی تھی اور مسز گاندھی نے پچھلے دو تین سالوں میں اسے جو منصب اور مرتبہ دیا تھا، اسکو ذہن میں رکھتے ہوئے ڈی، پی کو مسز گاندھی کے خلاف عدالتی فیصلے سے سخت ذہنی کوفت ہوتی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ چھ ماہ قبل انہیں وزارتی منصب سے محروم کر کے دوبارہ ماسکو میں ہندوستان کا سفیر بنائے جانے سے مسز گاندھی نے ان کے ساتھ بڑی زیادتی کی تھی۔ ڈی، پی کسی قیمت پر بھی دوبارہ ماسکو نہیں جانا چاہتے تھے اور ماسکو روانہ ہونے سے چند دن پہلے اپنے ایک کمزور لمحے میں اس نے میرے سامنے بڑے مایوس لہجے میں اس بات کا اعتراف کر لیا تھا کہ وہ اب وزیراعظم کے اتنے قریب نہیں رہے ہیں کہ جتنے پہلے تھے۔ انہوں نے دبی زبان میں کہا کہ مجھے زبردستی ماسکو بھیجا جا رہا ہے۔ حالانکہ میری صحت اس بات کی اجازت نہیں دیتی، کہ میں وہاں جاسکوں۔ ہوسکتا ہے کہ مسز گاندھی کی آج کی ذلت اور پریشانی سے ان کے اپنے زخمی دل کو کچھ تسلی ہو جاتی۔ میں نہی خیالات میں غرق، ڈی، پی کے پرسکون چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا

کہ مسز اندرا گاندھی ان کے صاحبزادے سنجے گاندھی اور ان کے پی، اے، آر کے دھون کمرے میں داخل ہو گئے۔ مسز گاندھی سفید ساڑھی میں اور سنجے سفید کرتے پاجامے میں ملبوس تھے۔ وزیر اعظم کے چہرے پر ایک خوفناک قسم کی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ ان کی آنکھوں سے رات بھر کی بے خوابی کے اثرات نمایاں تھے اور یہ فیصلہ کرنا یقیناً مشکل تھا کہ وہ ڈی، پی کی موت سے اداس ہیں یا انہیں اپنے خلاف صادر ہونے والے فیصلے کا غم ہے۔ اسی دن گجرات اسمبلی کے نتائج بھی ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے، اور وہاں سے بھی کچھ اچھی خبریں نہیں آ رہی تھیں۔ مسز گاندھی اور ان کے صاحبزادے وہاں کچھ دیر کھڑے رہے۔ انہوں نے لاش پر پھول چڑھائے اور چند لمحوں بعد وہاں سے رخصت ہو کر نمبر 1 صفدر جنگ کو لوٹ آئے۔ ڈی، پی کی لاش کے لئے یہ طے ہوا تھا کہ اسے دو بجے ائیر فورس کے جہاز میں سرینگر لے جایا جائے گا اور اسی شام وہاں ان کا داہ سنسکار کیا جائے گا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں بھی اس جہاز میں سرینگر لوٹوں گا تا کہ اپنے دوست، اپنے دشمن کی آخری رسومات میں شرکت کر سکوں۔

بارہ بجے کے قریب معاً میرے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ وزیر اعظم کی رہائش گاہ کا ایک چکر لگا کر یہ دیکھا جائے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ میرا اپنا خیال یہ تھا کہ عدالتی فیصلہ سنتے ہی وزیر اعظم نے اپنے مستعفی ہونے کا اعلان کر دیا ہوگا یا کرنے والی ہوں گی۔ یہ بات میرے وہم گمان میں بھی نہیں تھی کہ عدالت کا فیصلہ ان کے خلاف ہوگا۔ لیکن اب جبکہ فیصلہ ان کے خلاف ہو چکا تھا، یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اس فیصلے کا احترام نہیں کریں گی۔ اوم مہتہ نے یہ کہہ کر "ہم اتنی

آسانی سے اقتدار چھوڑنے والے نہیں ہیں'' میرے دل میں کچھ شکوک اور شبہات تو پیدا کر لئے تھے لیکن میرا خیال تھا کہ مسز گاندھی عدالتی فیصلے کا احترام کر کے خود تو مستعفی ہو جائیں گی اور آخری فیصلہ ہونے تک کسی دوسرے لیڈر کو اپنا جانشین نامزد کریں گی۔ لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کردیا کہ میرا اور مجھے جیسے ہزاروں بلکہ لاکھوں کا اندازہ کتنا غلط تھا۔ وزیر اعظم کی رہایش گاہ کے باہر درجن بھر گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اخباری نمائندوں اور فوٹوگرافروں کے کچھ جانے پہچانے چہرے داخلے کے گیٹ پر جمع تھے۔ ان میں سے کسی نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کی کیا رائے ہے؟ وزیر اعظم کو فوراً مستعفی ہو جانا چاہیئے؟

''میں نے ابھی اس مسئلے پر سوچا نہیں ہے'' میں نے محض ٹالنے کی غرض سے کہا اور گیٹ کے اند داخل ہو گیا۔

نمبرا۔ صفدر جنگ روڈ پر آج پراسرار خاموشی اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ باہر دفتر والے کمرے میں یش پال کپور ٹیلی فون پر بڑی اونچی آواز میں کسی سے باتیں کر رہے تھے، میں اندر داخل ہوا تو مجھے دائیں طرف والے کمرے میں بابو جگ جیون رام کی صورت نظر آئی۔ وہاں کچھ اور بھی لوگ بیٹھے تھے۔ لیکن میں انہیں دیکھ نہ سکا۔ میں بائیں جانب والے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں کئی کانگریسی ممبران پارلیمنٹ گم صم اداس، اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ ایک کونے میں بہار کے ممبر پارلیمنٹ بھگوت جھا آزاد بیٹھے ہوئے تھے میں بھی ان کے قریب جاکر بیٹھ گیا۔ کانگریس کی جنرل سیکرٹری مسز پورنی مکرجی اور مسز مکل بیز جی ایم، پی، بار بار کمرے کے اندر اور باہر

آجا رہی تھیں۔ ان کی بوجھل آنکھیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ دونوں بہت روئی ہیں۔ میں مسز گاندھی سے مل کر ان سے اظہار ہمدردی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ان سے ملنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ وہ غالباً اپنے ساتھیوں کے ساتھ صلاح مشورے میں مصروف تھیں۔ میں نے بھگوت جھا آزاد سے پوچھا کہ کیا ہونے والا ہے تو اس نے بتایا کہ کچھ معلوم نہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کی اپنی رائے کیا ہے کہ کیا ہونا چاہیئے۔

"بھئی! ہم تو وہی کریں گے، کہ جو پارٹی فیصلہ کرے گی۔ ہم لوگ آپ کی طرح آزاد تھوڑی ہیں، کہ اپنی رائے کا اظہار کرتے پھریں"۔

بھگوت جھا آزاد نے چند لفظوں میں اپنی غلامی کی حکایت بیان کی۔ اس کے بعد اُن سے باتیں ہوتی رہیں اور دوران گفتگو میں نے بھگوت جھا سے کہا کہ مسز گاندھی کو عہدے سے اپنے مستعفی ہونے کے اعلان میں تاخیر نہیں کرنا چاہیئے۔ ابھی تک ہم سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے لیکن باتیں کرتے کرتے ہم بھول ہی گئے تھے کہ اس کمرے میں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ بھگوت جھا کو ایسا لگا کہ میری یہ بات کچھ اور لوگوں نے بھی سنی ہے۔ اس نے خطرے کو بھانپتے ہوئے مجھ سے انتہائی رازدانہ لہجے میں کہا "یہ بات یہاں نہ کہو، یہاں لوگ مار ڈالیں گے۔ ان لوگوں نے مسز گاندھی کو یقین دلایا ہے کہ ان کے بغیر یہ ملک زندہ نہیں رہ سکتا" بھگوت جھا بھی میری رائے سے متفق تھا لیکن اسے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ مسز گاندھی کے صلاح کار اُسے مستعفی نہ ہونے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ اس لئے وہ اپنی رائے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد وہ خود مسز گاندھی کے بدستور وزیراعظم

بنے رہنے کا زبردست کا وکیل بن گیا اور پارلیمنٹ میں اس کے اور میرے درمیان کئی بار جھڑپیں ہوئیں۔ میں کمرے سے باہر آیا تو کانگریس کے صدر دیوکانت بروا نظر آئے۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی مجھ سے ہاتھ ملایا اور مجھے ایک طرف لے گئے۔ میں نے یوں ہی اپنی اہمیت جتانے کی غرض سے کہا کہ شیخ صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ میں مسز گاندھی سے اظہار ہمدردی کروں، اور ان سے کہہ دوں کہ انہوں نے صرف ایک لڑائی ہاری ہے جنگ نہیں ہاری ہے۔ بروا صاحب نے بعد میں اخبارنویسوں کے سامنے کئی بار یہی فقرہ دہرایا کہ ہم نے لڑائی ہاری ہے، جنگ نہیں ہاری ہے۔ اس سے حوصلہ پا کر شری بروا نے مجھ سے کہا کہ ریاستوں کے سبھی وزراء اعلیٰ مسز گاندھی کی حمایت میں ایک بیان جاری کرنے والے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ شیخ صاحب بھی الگ سے ایک بیان میں مسز گاندھی کی حمایت کا اعلان کر دیں۔ مجھے شری بروا کی بات کچھ عجیب سی لگی۔ ایک عدالت نے مسز گاندھی کے انتخاب کو کالعدم قرار دے کر انہیں چھ سال تک کوئی انتخابی عہدہ سنبھالنے کے نا اہل قرار دیا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر کے ہائی کورٹ کے فیصلے کو منسوخ کروایا جائے۔ یہ وزراء اعلیٰ کے حمایتی بیانات کا سلسلہ میری فہم سے بالا تر تھا اور میں اس وقت اسکی معنویت سمجھنے سے قاصر تھا۔ لیکن بعد میں جو کچھ ہوا، اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ اس ''دیوانگی'' کا بھی ایک واضح مقصد تھا۔ میں نے بروا صاحب سے کہہ دیا کہ میں ان کا پیغام شیخ صاحب تک پہنچا دوں گا۔

❁❁❁

۱/۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء

ہنگامی حالات کے ہنگامے

زیرِ تصنیف کتاب کا تیسرا باب

ڈی۔ پی کی لاش لے کر انڈین ایرفورس کا جہاز چار یا ساڑھے چار بجے جب سرینگر کے ہوائی اڈے پر پہنچا تو وہاں ان کے دوستوں، عقیدت مندوں اور جاننے والوں کا ایک جم غفیر موجود تھا۔ شیخ صاحب اپنی کابینہ کے دوسرے رفقاء کے ہمراہ بہ نفسِ نفیس موجود تھے۔ سید میر قاسم ڈھاڑھیں مار مار کر رو رہے تھے اور دوسرے لوگ بھی بہت غم زدہ نظر آرہے تھے۔ جب نعش کو جہاز سے اتار کر ایک کھلی گاڑی میں رکھ دیا گیا اور ماتمی جلوس شہر کی طرف روانہ ہوا، تو شیخ صاحب نے مجھے اپنی گاڑی میں بیٹھنے کو کہا اور راستے بھر وہ مجھ سے دلی کی تازہ ترین صورتحال کے بارے میں دریافت کرتے رہے۔ میں نے جب انہیں شری بروا کا پیغام دیا اوراس کے ساتھ ہی ان کی بے قراری کا بھی احوال سنایا، تو وہ کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ مسز گاندھی کی حمایت میں بیان دیں یا ان مخالف لیڈروں کی حمایت میں کہ جو مسز گاندھی کے فوری استعفیٰ کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد ان کی یہ ذہنی کش مکش کچھ اور بڑھ گئی۔ لیکن ایک تجربہ کار اور جہاں دیدہ سیاست دان کی طرح وہ آخری وقت تک دونوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہے اور یہ بات ان کے حق میں کہی جاسکتی ہے کہ اس بظاہر ناممکن عمل میں وہ بہت حد تک کامیاب رہے۔

ڈی، پی کی آخری رسومات سے فراغت پا کر میں شیخ صاحب کے ساتھ ان کی سرکاری قیام گاہ پر گیا، جہاں ہم کچھ دیر تک یہ سوچتے رہے کہ شری دیوکانت بروا کے مطالبے کو کس طرح پورا کیا جائے۔ کافی غور و فکر کے بعد یہ طے ہوا کہ شیخ صاحب یہ کہیں گے کہ ہائی کورٹ کا فیصلہ قانونی عمل کا پہلا مرحلہ ہے اور حزب مخالف لیڈروں کو سپریم کورٹ کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے۔ یہ مختصر سا بیان اسی وقت پی، ٹی، آئی اور یو، این، آئی کے نمائندوں کو دیا گیا۔ اس کے بعد میں دیر تک شیخ صاحب کے ساتھ ڈی، پی ور کی موت اور الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے کے سیاسی مضمرات پر باتیں کرتا رہا۔

شیخ صاحب کی رائے یہ تھی کہ مسز گاندھی کو عدالتی فیصلے کا احترام کرتے ہوئے مستعفی ہو جانا چاہیے۔ لیکن وہ اس مرحلے پر کھل کر اپنی رائے کا اظہار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے دو دن بعد خود دہلی جا کر صورتِ حال کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے دن یہ طے ہوا کہ بیگ صاحب اور میں بھی ان کے ہمراہ جائیں گے۔

ملک کی سیاسی زندگی کے اس اہم اور نازک مرحلے پر صدر جمہوریہ شری فخر الدین علی احمد اپنی بیگم عابدہ احمد کے ہمراہ سرینگر میں تھے۔ فیصلے کا اعلان ہوتے ہی شری احمد نے دہلی جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ وہ اور ان کی بیگم دونوں ہی حالات کی اس غیر متوقع کروٹ سے بہت پریشان اور افسردہ نظر آرہے تھے۔ ۱۳ جون کے اخبارات میں یہ خبر شایع ہوئی کہ صدر جمہوریہ وادی میں اپنا قیام مختصر کر کے دوسرے دن دہلی لوٹ رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ حزب مخالف کے لیڈروں کے راشٹرپتی بھون کے باہر دھرنا کرنے کی خبر بھی چھپی تھی۔

اپوزیشن لیڈروں نے موقع کا فائدہ اٹھا کر مسز گاندھی کے استعفیٰ کا مطالبہ تیز تر کر دیا تھا اور وہ صدر جمہوریہ سے مطالبہ کر رہے تھے کہ اگر مسز گاندھی مستعفی نہیں ہوئیں، تو وہ انہیں بر طرف کر دیں۔ ادھر مسز گاندھی اور ان کے حمایتی یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے سے کوئی ایسی غیر معمولی صورت پیدا نہیں ہوئی ہے کہ جس سے نپٹنے کے لئے صدر جمہوریہ کا اپنا دورہ منسوخ کر کے دہلی لوٹنا ضروری ہو۔ ایک اطلاع کے مطابق مسز گاندھی نے ٹیلی فون پر فخرالدین علی احمد سے رابطہ قائم کر کے ان سے کہا کہ وہ کشمیر میں اپنا قیام مختصر کر کے دہلی لوٹنے کی کوشش نہ کریں۔ اگر ایسی کوئی صورتحال در پیش آئی کہ جس کے لئے ان کا دہلی میں موجود ہونا ضروری ہو تو وہ انہیں اطلاع کر دیں گی۔ شری احمد مسز گاندھی کے ساتھ اس نازک اور مشکل مرحلے پر اظہار ہمدردی کرنے کے لئے دہلی جانے کے خواہش مند تھے۔ لیکن جب انہیں یہ بتایا گیا کہ ان کے قبل از وقت لوٹنے سے ایک تو اپوزیشن کو تقویت ملنے کا امکان ہے اور دوسرا صورتحال کے غیر معمولی ہونے کا تاثر مل سکتا ہے اور مسز گاندھی کسی قیمت پر یہ تاثر نہیں دینا چاہتی تھیں، تو صدر ۱۶ جون تک کشمیر میں رہنے پر آمادہ ہو گئے۔

اُدھر دہلی میں مسز گاندھی اور ان کے مخالفوں نے اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔ مسز گاندھی نے ایک آزمایا ہوا نسخہ استعمال کرتے ہوئے اپنی رہائش گاہ کے باہر والے چوراہے پر ایک مستقل جلسہ عام کی شروعات کر دیں۔ وہ یہ طریقہ ۱۹۶۹ء میں اپنا چکی تھیں کہ جب ٹرکوں، گاڑیوں اور بیل گاڑیوں میں بھر بھر کر لوگ ان کے حق میں مظاہرے

کرنے کے لئے وہاں جمع ہوا کرتے تھے۔ اب کی بار معاملہ اور بھی کچھ زیادہ اہم تھا۔ اس لئے مظاہرہ بھی بڑا اور زیادہ موثر ہونا چاہئے تھا، لیکن بڑے مظاہرے کے لئے زیادہ کوشش اور بڑی رقم خرچ کرنا پڑتی ہے اور صفدر جنگ روڑ کے چوراہے پر مسز گاندھی کے حق میں نعرے دینے والوں کی تعداد اور جوش وخروش سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے حمایتی تن من اور دھن سے یہ مظاہرے منظّم کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ دہلی ٹرانسپورٹ انڈرٹیکنگ کی بسوں کا بھی بے دریغ استعمال ہونے لگا تھا اور یہ بسیں بھی کرایے کے مظاہرین کو صفدر جنگ روڈ پہنچانے کے لئے استعمال کی جانے لگیں۔ حزب مخالف کے لیڈروں نے اپنی مشترکہ حکمت عملی مرتب کرنے کے لئے باہمی صلاح مشورے کرنا شروع کر دیئے، اور یہ فیصلہ کیا کہ مسز گاندھی کو مستعفی ہونے پر مجبور کرنے کے لئے ایک موثر ملک گیر مُہم کا آغاز کیا جائے۔ راشٹرپتی بھون کے آگے حزب مخالف کے لیڈروں کا دھرنا اسی سلسلے کی پہلی کڑی تھا۔

بگڑی ہوئی سیاسی حالت اور حکومت اور حزب مخالف کے درمیان تصادم کے بڑھتے ہوئے رجحانات نے ایک خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔ ایک طرف وزیر اعظم ایک عدالتی فیصلے کے خلاف عوامی جذبات بھڑکا کر، اصل مسلے کو پسِ پشت ڈالنے کی کوششوں میں مصروف تھیں اور دوسری طرف حزب مخالف کے لیڈر اس غیر متوقع صورت حال سے فائدہ اٹھا کر قانونی عمل کے منطقی انجام تک پہنچنے سے پہلے ہی مسز گاندھی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میری دانست میں دونوں کے طرزِ عمل اور طریق کار سے ان کی بدنیتی آشکارا تھی۔ ❀❀❀

۱/۱۱ اکتوبر ۱۹۷۷ء

ہنگامی حالات کے ہنگامے

زیر تصنیف کتاب کا چوتھا باب

۱۴ جون کو جب میں شیخ صاحب اور بیگ صاحب کے ہمراہ دلی پہنچا تو دلی میں سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ کشمیر ہاؤس سے میں نے پرایم منسٹر کی قیام گاہ پر ٹیلی فون کیا کہ شیخ صاحب دہلی آ گئے ہیں اور وہ پرائم منسٹر سے ملنا چاہتے ہیں۔ جواب ملا کہ ابھی کچھ دیر بعد ملاقات کے وقت سے مطلع کر دیا جائے گا لیکن میں نے ریسیور رکھ ہی دیا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ مسز گاندھی کے پرائیوٹ سیکرٹری مسٹر سیشن کہہ رہے تھے کہ شیخ صاحب شام ۷ بجے نمبر ۱ صفدر جنگ پر تشریف لائیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ مسز گاندھی شیخ صاحب سے ملنے کے لئے بے قرار نہ سہی لیکن کوشاں ضرور تھیں، شیخ صاحب بھی اندرا گاندھی کی اس تازہ مصیبت پر دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے۔ کشمیر ایکارڈ کو آخری شکل دینے کے دوران مسز گاندھی نے شیخ صاحب کی ہر خواہش اور مطالبے کو ٹھکرا دیا تھا اور شیخ صاحب نے اگرچہ بحالت مجبوری مفاہمت کی اس دستاویز پر اپنے دستخط ثبت کر لئے تھے۔ لیکن انہیں اس بات کا احساس تھا کہ یہ سمجھوتہ دراصل ان کی شکست اور مسز گاندھی کی فتح کا اعلان ہے۔ مسز گاندھی کے خلاف جسٹس جگ موہن سنہا کے فیصلے نے انہیں پہلی بار موقع دیا تھا کہ وہ بڑے بزرگانہ اور ہمدردانہ انداز میں اندرا گاندھی کے

سر پر دستِ شفقت پھیر کر اسے اپنے قیمتی مشورے سے نوازیں۔ وہ دن بھر شام کی ملاقات کے لئے تیاری کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ مسز گاندھی کو یہ صلاح دیں گے کہ وہ عارضی طور وزیر اعظم کے عہدے سے مستعفی ہو جائیں اور ایسا کرنے سے ان کے وقار میں غیر معمولی اضافہ ہوگا۔ بیگ صاحب کا بھی یہی خیال تھا اور میں بھی اس اپروچ کے ساتھ متفق تھا۔

ہم لنچ سے فارغ ہوکر اب تھوڑی دیر آرام کرنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ صدر کانگریس شری دیوکانت بروا کا ٹیلی فون آیا۔ وہ اسی وقت شیخ صاحب سے ملنا چاہتے تھے اور خود شیخ صاحب بھی بروا سے ملنے کے خواہش مند تھے۔ چند لمحوں بعد مسٹر بروا ہاتھ میں ''لندن ٹائمز'' کا وہ شمارہ لے کر داخل ہوئے کہ جس میں الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے پر ایک اداریہ شایع ہوا تھا۔ اس اداریہ میں محض چند تکنیکی بنیادوں پر عوامی فیصلے کورد کر کے وزیر اعظم کے انتخاب کو کالعدم قرار دیئے جانے کی نکتہ چینی کی گئی تھی اور مسٹر بروا اس پر بہت خوش نظر آرہے تھے۔ ان کے خیال میں ٹائمز کا یہ اداریہ الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے پر بھاری تھا اور انہوں نے مسکراتے ہوئے اخبار میری طرف بڑھا دیا۔ میں مسٹر بروا اور شیخ صاحب کو وہیں چھوڑ کر کمرے سے باہر آیا دونوں لیڈروں کے درمیان ایک گھنٹے تک کیا بات چیت ہوئی، مجھے اس کا علم نہیں، لیکن شیخ صاحب اور مسز گاندھی کے درمیان آدھے گھنٹے تک جو گفتگو ہوتی رہی، اس کے بارے میں مجھے شیخ صاحب نے وہاں سے لوٹتے ہی سب کچھ بتادیا۔ اس ملاقات میں مرزا محمد افضل بیگ بھی ان کے ہمراہ

تھے اور دونوں لیڈروں کا خیال تھا کہ مسز گاندھی الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے سے پیدا شدہ صورت حال سے پریشان سی، گھبرائی ہوئی اور سہمی ہوئی ہوں گی اور وہ اس پریشانی اور مصیبت کی گھڑی میں انہیں تسلی دیں گے، اپنے قیمتی مشوروں سے نوازیں گے اور اس طرح اپنی دوستی، وفاداری اور وابستگی کا اظہار کریں گے۔ بیگ صاحب تو یہ سوچ کر بھی گئے تھے کہ ضرورت پڑھی تو وہ بحیثیت وکیل انہیں اپنی خدمات بھی پیش کریں گے۔ لیکن یہ سب باتیں کہنے کا موقع ہی نہیں ملا یا یوں کہیے کہ مسز گاندھی نے موقع ہی نہیں دیا۔ میں نے نمبرا صفدر جنگ روڈ سے کشمیر ہاؤس لوٹتے ہی شیخ صاحب سے پوچھا کہ ملاقات کیسی رہی اور آپ نے کیا مشورہ دیا؟

''مشورہ کیسا؟ اس کی تو نوبت ہی نہیں آئی۔ وہ تو اس طرح غصے سے بھری بیٹھی ہیں کہ بات کرو تو کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں''۔ شیخ صاحب نے بڑے مایوس کن لہجے میں کہا اور میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ انہیں مسز گاندھی کے نا معقول رویے سے مایوسی ہوئی ہے یا اس خیال سے کہ اس نازک موقع پر بھی اندرا گاندھی نے انہیں ہمدردی اور تعزیت کے اظہار کا موقع نہیں دیا۔

''کیا وہ اپنے مستعفی ہونے کے بارے میں سوچ رہی ہیں'' میں نے دریافت کیا۔ ''مجھے اس کی باتوں سے تو ایسا نہیں لگا۔ بلکہ وہ تو پہلے سے بھی زیادہ مغرور اور سخت گیر دکھائی دیتی ہیں، کہہ رہی تھیں کہ اپوزیشن نے میری شرافت کو میری کمزوری سے تعبیر کر کے اس کا ناجائز فایدہ اٹھا ہے اوراب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں ان سے سختی سے نپٹوں گی۔ برداشت کی بھی حد ہوتی ہے'' شیخ صاحب نے مسز گاندھی کے الفاظ

دہرائے اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ان کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر کچھ سہمے ہوئے تھے، ”لیکن وہ کریں گی کیا آخر جب تک عدالتی فیصلہ.....“

”میں نہیں جانتا وہ کیا کرنے والی ہیں۔ لیکن اس نے کہا کہ طاقت بہت بڑی چیز ہے اور میں اپنی طاقت کو استعمال کر کے اپوزیشن کو بتادوں گی کہ میں کمزور نہیں ہوں۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اینٹ کا جواب پتھر سے دوں گی“۔ شیخ صاحب نے ایک بار پھر مسز گاندھی کے الفاظ دہرائے اور ہم دونوں کچھ دیر تک اُن کی آئندہ حکمت عملی پر غور کرتے رہے۔ یہ بات ہم میں سے کسی کے ذہن میں نہیں آئی کہ مسز گاندھی اندرونی ایمرجنسی کا سہارا لے کر ملک کے سیاسی اور آئینی نظام میں اتھل پتھل پیدا کر دیں گی۔ میرا خیال تھا کہ وہ سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر کے عدالت کے فیصلے کا انتظار کریں گی اور اگر عدالت نے فیصلہ ان کے حق میں دیا تو وہ اُسی دن پارلیمنٹ توڑ کر نئے انتخابات کی تاریخوں کا اعلان کر دیں گی۔ لیکن اگر عدالت کا فیصلہ اُن کے حق میں نہ ہوا تبِ وہ کیا کریں گی؟ اس سوال کا نہ میرے پاس کوئی تسلی بخش جواب تھا نہ شیخ صاحب کے پاس۔ ہم دونوں قیاس کے گھوڑے دوڑاتے دوڑاتے تھک گئے۔

دوسرے دن میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ نمبرا صفدر جنگ روڈ پر وزیر اعظم کی رہائش گاہ کے قریب سے گذرا، تو ٹریفک آئی لینڈ پر دو تین سو مرد عورتیں اور بچے اندرا گاندھی زندہ باد کے نعرے بلند کرتے ہوئے دیکھے ان کے ہاتھ میں طرح طرح کے ماٹوز تھے۔ میرے ایک ساتھی سلیم بیگ نے ایک بچے سے دریافت کیا کہ اس کے ہاتھ میں جو

ماٹو ہے اس پر کیا لکھا ہے تو اس نے جواب دیا کہ مجھے کیا معلوم، میں نے ایک آدمی سے پوچھا کہ بات کیا ہے؟ اور وہ یہاں کیا کرنے آیا ہے تو مجھے اس کا جواب سن کر حیرت ہوئی ۔ اسے صرف یہ بتایا گیا تھا کہ اندراجی نے ہر روز غریبوں کو درشن دینے کا فیصلہ کیا ہے دو تین سو کے اس مجمع میں شاید دو تین آدمیوں کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ زیادہ تر لوگ یا تو تماشا دیکھنے آئے تھے یا تماشا کروانے کے لئے لائے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد مجمع میں ہل چل مچ گئی اور آئی لینڈ پر بکھرے ہوئے سبھی لوگ ایک جگہ جمع ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ اندراجی آنے والی ہیں اور جونہی وزیراعظم کی رہائش گاہ سے برآمد ہونے والی ایک بھاری بھرکم خاتون نے یہ خوش خبری سنائی۔ ساری فضا اندرا گاندھی زندہ باد اور دیش کی نیتا اندرا گاندھی زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگی، اور نعروں کی اس گونج میں مسز گاندھی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ٹریفک آئی لینڈ میں داخل ہوئیں۔ پہلے ایک کھدر پوش نوجوان نے ایک مختصر سی تقریر میں اندرا گاندھی کو یقین دلایا کہ ہندوستان کے غریب عوام انہیں اپنی ماں سمجھتے ہیں اور وہ اپنی ماں کی عزت بچانے کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دینے کے لئے تیار ہیں، اس کے بعد مسز گاندھی نے تقریر کی۔ اس نے کہا کہ میں آپ لوگوں کی محبت سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔ صبح سے شام تک ہندوستان کے دور دراز دیہات سے لوگ میرے پاس آکر مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ آپ سبھی لوگ میری پونجی اور میری شکتی ہیں اور جب تک آپ میرے ساتھ ہیں۔ عدالتوں کے فیصلے یا اپوزیشن لیڈروں کی چیخ و پکار میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے''۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ ایک ڈرامہ ہو رہا ہے جس میں کام کرنے والے سبھی اداکاروں نے اپنے اپنے مکالمے رٹ لیے ہیں جو وہ بار بار ادا کر رہے ہیں۔ عام لوگ تو یہ جانے بغیر کہ قصہ کیا ہے۔ اندرا جی کے درشن کرنے آئے تھے، لیکن ان کو لانے والے اندرا جی کو یہ یقین دلاتے تھے کہ یہ سب لوگ الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف اپنی ناراضگی اور آپ سے اپنی گہری وابستگی کا اظہار کرنے کے لئے آئے ہیں۔ اندرا جی سب کچھ جانتے ہوئے بھی یہ تاثر دینا چاہتی تھیں، کہ یہ سب لوگ ان کی حمایت اور محبت میں ان کی قیام گاہ پر آتے ہیں۔ یہ ڈراما ۱۲ جون شروع ہوا تھا۔ دن میں اس کے کئی شو ہوا کرتے تھے اور یہ برابر ۲۴ جون تک جاری رہا۔

خدا بہتر جانتا ہے کہ مسز گاندھی کے خلاف راج نراین کی دایر کردہ انتخابی عذرداری کا فیصلہ صادر کرتے وقت آباد ہائی کورٹ کے جج جسٹس جگ موہن سنہا کو اس بات کا احساس اور اندازہ تھا یا نہیں کہ ان کے فیصلے سے ہندوستان ی سیاست اور اس ملک کی تاریخ ایک دوسرا ہی رخ اختیار کرے گی، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ آزاد ہندوستان کی تیس سالہ تاریخ میں ہندوستان کے کسی جج یا کسی عدالت نے اتنا جرأت مندانہ اور دور رس نتائج کا حامل فیصلہ صادر نہیں کیا ہے۔ اس ایک فیصلے نے ہندوستان کے سیاسی ڈھانچے میں ایک ایسا زلزلہ پیدا کیا کہ جمہوریت اور جمہوری اداروں کی جس عمارت کی پایداری اور استحکام سے ہم مطمئین ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ اس کی بنیادیں ہل گئیں۔ ابھی تک مسز گاندھی اپنی پارٹی کے اتحاد اور اسکی واحد لیڈر ہونے کے بل بوتے پر حزب مخالف کا ہر دار برداشت کر رہی تھیں۔ جسٹس سنہا کے فیصلے نے

پارٹی کے اتحاد اور واحد لیڈر کے تصور کو پہلی بار اتنا مجروح اور مشکوک کر دیا کہ مسز گاندھی جو اس سے پہلے خود اعتمادی اور خود داری کا پیکر نظر آتی تھیں، اب اپنے سایے سے بھی ڈرنے لگیں۔ انہیں اپنے ہر ساتھی پر شبہ ہونے لگا اور وہ یہ سوچنے لگیں کہ اپوزیشن پارٹیوں سے زیادہ خود ان کی پارٹی میں بہت سے لوگ ان کی جگہ لینے کے لئے بے چین اور کوشاں ہیں۔ جسٹس سنہا کے فیصلے نے ان سب لوگوں کو ایک سنہری موقع فراہم کر دیا تھا اور چندر شیکھر، کرشن کانت، رام دھن اور دوسرے کئی سرکردہ کانگریسی ممبران پارلیمنٹ بڑے مدھم مگر بہت سنجیدہ لہجے میں مسز گاندھی کے استعفیٰ کا مطالبہ کرنے لگے اور مسز گاندھی کو محسوس ہونے لگا کہ ان کا سب سے بڑا سہارا ٹوٹ رہا ہے اور ان کے دشمنوں کو ان کی پارٹی کے اندر سے بھی مدد ملنے والی ہے پھر..... جون کے اخبارات کی یہ خبر شائع ہوئی کہ ۴۰ کے قریب کانگریسی ممبران نے چندر شکھر کے گھر پر الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے سے پیدا شدہ صورت حال پر غور کیا۔ مسز گاندھی کے لئے یہ خبر بڑی پریشان کن تھی چالیس کا عدد پچاس، ساٹھ اور ستھر بھی ہوسکتا ہے۔ انہوں نے سوچا اور وہ اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی تدبیروں پر غور کرنے لگیں۔ پریشانی بے اطمینانی، بدحواسی اور سخت مایوسی کے اس نفسیاتی لمحے میں ماں کو اپنے بیٹے نے سہارا دیا۔ اور اس طرح سنجے گاندھی کا سیاسی جنم ہوا۔

❀❀❀

۲۸/ستمبر ۱۹۷۷ء

نئے وزیروں کا تربیتی کورس

تعارف........

ریاست کے وزیر اعلیٰ جناب شیخ محمد عبداللہ نے پچھلے ہفتے ریاستی اسمبلی میں اپنی وزارت کی مانگوں پر بحث کا جواب دیتے ہوئے مخالف ممبروں کی طرف سے اٹھائے گئے تمام نکات کے بڑے معقول جوابات دئے۔ لیکن سب سے معقول اور دلچسپ جواب وزیروں کی تعداد کے بارے میں تھا۔ انہوں نے کہا کہ کابینہ میں ۲۴ وزیر بھرتی کرنے کی دو وجوہات ہیں ایک یہ کہ تمام ضلعوں کو حکومت میں نمائندگی ملے اور دوئم نوجوانوں کو مستقبل کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی تربیت دی جائے۔ وزیر اعلیٰ کے دونوں ہی ارادے نیک ہیں اور چراغ بیگ شیخ صاحب کی انصاف پسندی اور دور اندیشی کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وزیروں کے بارے میں شیخ صاحب کے خیالات ہمیشہ اوریجنل ہوتے ہیں۔ فروری ۱۹۷۵ء میں اقتدار سنبھالنے کے بعد ہی جب انہوں نے اسمبلی میں کابینہ کے وزیروں کی تنخواہوں میں اضافے کا بل پیش کیا تو انہوں نے اس اضافے کے لیے یہ دلیل پیش کی، کہ اگر وزیروں کو معقول تنخواہیں دی جائیں، تو وہ کورپشن اور بددیانتی کی طرف مائل ہونے سے محفوظ رہیں گے۔ اب

کی بار انہوں نے وزیروں کی ایک پوری پلاٹون کے لیے یہ جواز پیش کیا ہے کہ ایسا کرنے سے نوجوانوں کو مستقبل کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے تربیت دینا ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے اور میری خواہش ہے کہ نوجوان وزیروں کو مستقبل کے لیے تیار کرنے کے لئے باقاعدہ ایک منصوبہ تیار کیا جائے اور گزشتہ سال خوراک پر دی جانے والی سب سڈی کم کرنے سے جو ساڑھے چار کروڑ روپے کی بچت ہوئی ہے اس میں کروڑ، سوا کروڑ روپے نئے وزیروں کو تربیت دینے پر صرف کیے جانے چاہئیں۔ صرف اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ کہیں ۱۹۵۳ء کے تربیت یافتہ وزیروں کی طرح نئے وزیر بھی شیخ صاحب کے خلاف سازشیں کرنے میں پہل نہ کریں۔ آخر ۱۹۵۱ء میں بھی تو شیخ صاحب نے اپنے پسندیدہ ممبران اسمبلی کا ہی انتخاب کیا تھا اور یہ پسندیدہ اس درجہ پسندیدہ تھے کہ ان کے لئے اصلی تو کیا کسی نقلی مقابلے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ بہر کیف یہ تو رہا ماضی کا قصہ، آیئے اب مستقبل کی بات کریں اور شیخ صاحب کے نوجوانوں کو مستقبل کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی تربیت دینے کے لئے کوئی ٹھوس اور تعمیری پروگرام مرتب کریں۔ آپ پوچھیں گے، آپ پوچھیں گے کہ شیخ صاحب کے نوجوانوں کو تربیت دینے سے چراغ بیگ کو کیا دل چسپی؟ سوال معقول ہے لیکن آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ چراغ بیگ کا جواب اس سے بھی زیادہ معقول ہے۔ شیخ صاحب نے نوجوانوں کے ساتھ مستقبل کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس لفظ پر شیخ صاحب اور ان کے بوڑھے نوجوانوں سے زیادہ میرا اور مجھ جیسے نوجوانوں کا حق زیادہ ہے ماضی اور حال، یہ دونوں عہد ہم نے شیخ

صاحب کو بخش دیئے ہیں، لیکن خوش قسمتی سے مستقبل ان نوجوانوں کا ہے کہ جنہوں نے اپنے ماضی اور اپنے حال کو شیخ صاحب کی مبہم سیاست، ان کے موہوم نعروں اور معصوم ارادوں پر قربان کر کے اپنی جوانی اور زندگی کا بیشتر حصہ برباد کردیا۔ نوجوان وزیروں کو مستقبل کے لیے تیار کرنے میں مجھے اسی لیے دلچسپی ہے اور اسی لئے میں خلوص نیت کے ساتھ ایک تربیتی پروگرام کا سیلبس پیش کرنے کی سعی کر رہا ہوں۔

گر قبول افتدز ہے غرو شرف

ابتدائی تیاری: نوجوان وزیروں کو تربیت دینے کے لئے ہمیں سب سے پہلے تربیت دینے والوں کی ایک فہرست تیار کرنا ہوگی اور اس کے لیے میں محترم شیخ صاحب، جناب بیگ صاحب، ٹھاکر دیوی داس اور شری صنم نربو کے اسمائے گرامی پیش کرتا ہوں۔ ابتدائی تربیت کے بعد اور تربیتی کورس مکمل کرنے کے دوران خواجہ غلام محمد شاہ، شری موہن کشن تکو اور خواجہ عبدالرحمان سوداگر بھی اپنے تجربات کی روشنی میں ان کی تربیت کرنے میں مدد دیں گے۔

پہلا سبق: تربیت کا آغاز یقیناً شیخ محمد عبداللہ کریں گے اور وہ نوجوان وزیروں کو مستقبل کے لیے تیار کرنے کیلئے یہ بتائیں گے کہ انہیں اپنے قول اور فعل میں کس طرح تضاد پیدا کرنا چاہیے اور کس طرح کردار، ایمان داری، دیانتداری اور اصول پرستی کے لیے دو قسم کے معیار مقرر کرنے چاہئیں۔ ایک اپنے لیے اور دوسرا باقی دنیا کے لئے۔ وہ انہیں ہدایت دیں گے، کہ انہیں ہرگز ان باتوں پر عمل نہیں کرنا چاہیے کہ جن پر عمل کرنے کی تلقین وہ اور لوگوں کو کریں۔

دوسرا سبق: یہ سبق مرزا محمد افضل بیگ دیں گے اور وہ نوجوان وزیروں کو اپنی مثالی دے کر یہ سمجھائیں گے کہ انہیں اپنے لیڈر کی موجودگی میں کبھی اپنے دل کی بات زبان پر لانے کی عادت نہیں ڈالنا چاہیے۔ وہ ان سے کہیں گے کہ لیڈر کی ہر بات پر ''ہاں'' کہنے سے کیا کیا سیاسی، مادی اور روحانی فواید حاصل ہوتے ہیں۔ بیگ صاحب نوجوان وزیروں کو بڑے بڑے سنجیدہ معاملات کو لطیفوں میں ٹالنے کا گر بھی سکھائیں گے....

تیسرا سبق: اس کے لئے موجودہ وزیر خزانہ ٹھاکور دیوی داس موزون رہیں گے۔ ٹھاکر صاحب زیر تربیت وزیروں کو یہ بتادیں گے کہ سیاست میں ایمانداری، قربانی، سیاسی شعور، تجربے اور اسی قسم کی خرافات کا کوئی عمل دخل نہیں۔ یہ سب قسمت کا کھیل ہے۔ وہ ان پر یہ بھی واضح کردیں گے کہ قانون ساز اسمبلی کا ممبر ہونے سے زیادہ قانون ساز کونسل کا ممبر ہونا زیادہ فائدہ مند اور محفوظ ہوتا ہے۔ ٹھاکر صاحب نئے وزیروں کو آئین ہند کی دفعہ ۳۷۰ اور رنبیر پینل کوڈ کی دفعہ ۴۲۰ کا فرق سمجھائیں گے کیونکہ دفعہ ۳۷۰ کے اکثر محافظوں اور مجاہدوں کو ان دونوں کا فرق معلوم نہیں...

چوتھا سبق: موجودہ وزیر تعمیرات صونم نربو وزارتی کیڈٹوں کو چوتھا سبق دیں گے۔ وہ انہیں موزوں وقت پر پارٹی بدلنے اور موزون پارٹی میں شامل ہونے کے گر بتائیں گے۔ وہ ان پر یہ واضح کردیں گے کہ جو پارٹی بھی انہیں وزارت میں شامل کرنے کی پیش کش کرے انہیں سوچے سمجھے اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس میں شامل ہو جانا چاہیئے۔ نربو صاحب وزیروں کو ہر معاملے میں اور ہر مسئلے پر خاموش

رہنے کے فائدے بھی بتائیں گے۔ وہ ان سے کہیں گے کہ ان کا سیدھا پن، ان کی سادگی اور ان کی خاموشی ان کے موجودہ منصب تک پہنچنے کے لیے ذمہ دار ہے۔

ریفریشر کورس: ان چار اسباق کے بعد نوجوان وزیروں کو ریفریشر کورس کرایا جائے جسکے دوران خواجہ غلام محمد شاہ انہیں ایمانداری سے دولت کمانے کے طریقے، دوسرے سے نرمی اور اخلاص برتنے کے فایدے اور اپنے سے لائق آدمیوں کے خلاف سازشیں کرنے کے گر بتائیں گے۔

موھن کشن تکو: ہر بات پر ''ہاں'' کہنے کے فوائد، ہر شخص سے اسکے مزاج کے موافق بات کرنے کی اہمیت اور ہر غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کی صلاحیت پر زور دیں گے۔ تکو صاحب نئے وزیروں کو پنشن کے تحفظ اور پرویونڈنٹ فنڈس میں اضافے کی سکیموں سے بھی روشناس کریں گے۔

عبدالرحمان سوداگر: نئے وزیروں کو زندہ باد اور آگیا جی آگیا، کی تربیت دیں گے وہ خاص طور پر جموں کے نئے وزیروں پر مانند، اتری اور ڈاکٹر ہربجھن سنگھ پر اپنی توجہ مرکوز کریں گے۔ ڈاکٹر ہربجھن سنگھ انہیں نعرے بلند کرنے سے پیدا شدہ خراش کے لئے صحیح ادویات کا استعمال بتائینگے۔

سیلبس: نئے وزیروں میں سے کئی وزیروں کو اپنے دستخط کرانے کی بھی تربیت دینا ہوگی، اس مقصد کے لیے خصوصی انتظامات کرانا ہوں گے۔

تاریخ: نئے وزیروں کو تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن انہیں

نیشنل کانفرنس کی تحریک اور تاریخ سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت تحریک کے سب سے بڑے مجاہد شری نربو پوری کر سکتے ہیں۔

جغرافیہ: نئے وزیر ریاست کا جغرافیہ تو سمجھ نہیں سکتے ، اس لیے یہ جغرافیہ انہیں سمجھانے پر وقت برباد نہیں کیا جانا چاہیے۔ انہیں صرف یہ بتانا کافی ہوگا کہ جس طرف سے سورج چڑھتا ہے اس طرف منہ کر کے اگر وہ کھڑے ہو جائیں۔ تو سامنے مشرق ہوگا، پیچھے مغرب، دائیں طرف جنوب اور بائیں طرف شمال....!

پولیٹیکل سائنس: اس کی جگہ انہیں مشہور ومعروف جنتری پڑھانا چاہیے تاکہ وہ اپنے تعاون کی مدد سے اپنے وزیر ہونے کا راز سمجھ لیں۔ انہیں غلطی سے بھی پولیٹکل سائنس کی کوئی کتاب پڑھنے کی اجازت نہیں دینا چاہیئے۔

قانون: انہیں یہ بتایا جائے گا کہ ہندوستان کے آئین میں صرف ایک دفعہ ہے اور اس کا نام ہے دفعہ ۳۷۰ وہ اگر یہ پوچھیں کہ باقی دفعات کا کیا ہوا تو ٹھاکر دیوی داس نے انہیں بتائیں گے کہ آئین کی باقی سب دفعات دفع ہو گئی ہیں۔ اس لیے ہمیں صرف اسی ایک دفعہ کا تحفظ کرنا چاہیے۔ اگر کچھ شر پسند وزیروں نے اس دفعہ کے معنی اس کے مقاصد اور اس کی موجودہ ہیت کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کی تو انہیں شیخ صاحب کے روبرو پیش کیا جانا چاہئے۔ وہ ان کے ہوش ٹھکانے لگائیں گے.....

❁❁❁

یکم مئی ۱۹۸۲ء
(یادگار شمارہ)

بھٹو کی اہمیت اور عظمت

بھٹو کو پھانسی دی جائے گی اس کا یقین مجھے ۶/فروری ۷۹ء کو پاکستان کی سپریم کورٹ کا فیصلہ سننے کے بعد ہی ہوا تھا۔ لیکن سب کچھ جانتے ہوئے بھی میرا دل یہ ماننے کے لئے تیار نہ تھا کہ بھٹو کو پھانسی دی جائے گی۔ ایک طرف پاکستان کے حالات تھے، ضیا الحق کے بیانات تھے۔ پاکستان قومی اتحاد کے لیڈروں کے منصوبے اور ان کی سرگرشیاں تھیں اور بھٹو کو پھانسی کے تختے کی طرف لے جانے کے لئے عدالتوں اور فوجی جنرلوں کی سازشیں تھیں، کہ جو موت اور صرف موت کی نشاندہی کر رہی تھیں اور دوسری طرف محض ایک موہوم امید، ایک بے نام سی خواہش اور ایک معصوم سی آرزو تھی کہ جو موت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی بھٹو کی زندگی کا چراغ روشن کئے ہوئے تھی۔ بھٹو کی زندگی کے آخری لمحے کے کچھ لمحوں کے بعد تک بھی امید اور آرزو کا یہ چراغ ٹمٹماتا رہا۔ میں یہی سوچتا رہا کہ آخری لمحے پر کوئی نہ کوئی ایسا معجزہ رونما ہوگا کہ جس سے بھٹو کی جان بچ جائے گی۔ افسوس! کہ دل کی ساری وکالت دماغ کی عدالت میں بے کار گئی اور وہی ہوا کہ جس کے تصور سے بھی خوف آتا ہے۔ نہ کوئی معجزہ ہوا نہ عین وقت پر کوئی غیر

متوقع حادثہ ہوا، نہ قاتل کے ہاتھ سے خنجر چھوٹا اور نہ اس کے دل میں رحم یا انسانیت کی کوئی کرن پھوٹی۔ سقراط کو ایک بار پھر زہر کا پیالہ پلایا گیا۔ عیسیٰ کو ایک بار پھر صلیب پر چڑھا دیا گیا اور امام حسین کو ایک بار پھر یزید نے شہید کر دیا۔

جو لوگ بھٹو کو صرف نام سے جانتے تھے وہ ان کا ماتم کر چکے، کسی نے اخباری بیان دے کر، کسی نے چھاتی پیٹ کر، کسی نے گرجا جلا کر، کسی نے مسجد مسمار کر کے اور کسی نے اپنے پڑوسی کا گھر خاکستر کر کے بھٹو کے غم کا قرض ادا کر دیا لیکن میں نے ابھی ذوالفقار علی بھٹو کے قتل پر نہ کوئی بیان دیا ہے اور نہ کسی مظاہرے میں شرکت کی ہے۔ میں اب بھی اس الجھن میں ہوں کہ اتنے بڑے غم، اتنے عظیم سانحے اور اتنی بڑی قیامت کے لئے اظہار کا وہ کونسا اسلوب اور پیمانہ منتخب کروں کہ جو اس درد، اس کرب، اس محرومی اور کسک کا احاطہ کر سکے کہ جو ذوالفقار علی نام کے اس خوب رو، خوش پوش، خوش کلام اور خوش اندام شخص کی موت سے وابستہ ہے کہ جس میں زندگی میں صرف ایک بار ملا ہوں۔ میری نگاہوں میں رہ رہ کر سفید قمیض اور پتلون میں ملبوس، بکھرے بالوں والے چہرے پر تھکن مگر ہونٹوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ سجائے ہوئے اس نوجوان کی شبیہہ اُبھر آتی ہے کہ جو آج سے ٹھیک دس سال پہلے کراچی میں اپنی شاندار قیام گاہ کے ڈرائینگ روم میں مجھ سے پہلی اور آخری بار ملا تھا۔ میرے لئے یہ تصور بھی روح فرسا ہے کہ وہ بانکا، سجیلا اور سج دھج والا نوجوان، جس نے بعد میں صرف پاکستان ہی نہیں ساری دنیا میں اپنی سیاست اور خطابت سے تہلکہ مچا دیا تھا، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت

کی گہری نیند سلا دیا گیا ہے۔ ان کے بغیر یہ دنیا کتنی ویران اور سونی سونی سی لگ رہی ہے۔ جن لوگوں نے بھٹو کر اپنی راہ کا کانٹا سمجھ کر اسے تختہ دار پر لٹکا دیا ہے، مجھے یقین ہے کہ انہیں بھی ایک کمی، ایک خلا کا سا احساس ہو رہا ہوگا۔ یہی میرے بھٹو کی شانِ دلربائی ہے!

میں ذوالفقار علی بھٹو سے اپنی ایک ملاقات کی بنیاد پر ان سے کسی قربت، نسبت یا وابستگی کا دعویٰ نہیں کر رہا ہوں۔ یہ ملاقات اتنی مختصر، رسمی اور خالص سیاسی تھی کہ میرے لئے اس کی اہمیت محض تاریخی ہے، لیکن مجھے یہ دعویٰ کرنے کی اجازت دیجئے کہ میں بھٹو کو صرف ان کے نام، ان کے سیاسی رتبے اور مسئلہ کشمیر سے ان کی گہری دلچسپی کے تعلق سے ہی واقف نہیں ہوں۔ میری نظر ان کی بھرپور شخصیت، ان کی بے پناہ ذہانت، ان کی تخلیقی سیاست اور ان کے اس جمالیاتی پیکر پر ہے کہ جس نے ان کے چاہنے والوں کو ان کا عاشق اور ان کے دشمنوں کو ان کی جان کا دشمن بنا دیا تھا۔

وہ محض ایک سیاست دان یا پاکستان کے ایک سابق وزیراعظم ہی ہوتے تو ان کی شخصیت اور ان کے انجام پر مجھے افسوس ضرور ہوتا، لیکن میرے دل پر وہ گھاؤ میری روح پر وہ ضرب اور میری رگ رگ میں وہ درد نہ ہوتا کہ جس نے میری ہی طرح ایک دنیا کو بے قرار کر دیا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ وہ صرف سیاست دان ہی نہیں شاعر بھی تھا۔ وزیراعظم ہی نہیں بلکہ انقلابی بھی تھا۔ ایک رہنما ہی نہیں، ایک مفکر بھی تھا اور یہ سب کچھ ہونے کے علاوہ ایک بڑا ہی خوبصورت اور خوش مزاج نوجوان بھی تھا۔ وہ ہمارے جانے پہچانے آج کل کے روایتی سیاست دان کی

طرح کھوکھلا، گونگا، روکھا پھیکا، ان پڑھ، تنگ نظر اور ریاکار نہ تھا۔ اس کے سیاسی عقائد اور نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن اس پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ اس کا اپنا کوئی عقیدہ یا نظریہ نہیں تھا۔ وہ تقریر کرنے پر آتا تو خطابت کے دریا بہاتا، لکھنے پر آتا، تو قلم توڑ کے رکھ دیتا۔ وہ بڑا رنگین اور شوقین مزاج آدمی تھا، جسے زندگی کی خوبصورتیوں کا احساس اور اس کی رعنائیوں سے عشق تھا۔ وہ علامہ اقبال کے بعد غالباً مسلمانوں کے پہلے لیڈر تھے کہ جس کی نظر صرف مشرق تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ مغرب کی فکر اور نظریات پر بھی حاوی تھی۔ اس کی کتابوں کے مطالعے سے جو بصیرت ملتی ہے وہ پولٹکل سائینس کی بڑی بڑی کتابوں سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی ۔ مجھے یاد ہے کہ دس سال قبل اپنی پہلی ملاقات میں نے بھٹو سے جب یہ کہا کہ ہمسائیہ ملک میں آپ کی امیج یہ ہے کہ آپ کی ساری سیاست اور فلسفے کی بنیاد ہندوستان سے نفرت پر مبنی ہے اور آپ کو صرف ہندوستان سے ہی نہیں، ہندوؤں سے بھی نفرت ہے تو بھٹو صاحب نے یہ جواب دیا تھا۔

"جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، میں دور جدید کی پیداوار ہوں اور میں فرقہ پرست نہیں ہوں اور پھر ہندوستان سے نفرت کا سوال اس لئے بھی پیدا نہیں ہوتا کہ ہماری تاریخ اور ہمارا جغرافیہ ایک رہا ہے۔ البتہ میں کشمیری عوام کے حق خودارادیت کے سوال پر کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔" میں نے کہا تھا۔

"بھٹو صاحب! پاکستان کی موجودہ سیاسی صورتحال کا ایک مایوس کن پہلو یہ ہے کہ آج بیس بائیس سال بعد بھی یہاں مُلاازم کا بڑا زور

ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ ملاؤں کے لئے بنا تھا۔ پاکستان کی یہ تصویر یقیناً کسی ترقی پسند اور روشن دماغ انسان کے لئے پُرکشش نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ یہاں اسلام اور مُلاازم کو تقریباً ہم معنی سمجھا جانے لگا ہے'' تو بھٹو صاحب نے بڑے اعتماد اور یقین بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''یہ ٹھیک ہے لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ مُلاازم یہاں نہیں چل سکے گا۔ اگر ہم عوام کی طاقت کے بھروسے پر ملک میں انقلاب لانے میں کامیاب ہو جائیں تو مُلااِزم کا مقابلہ بڑی آسانی کے ساتھ ہوگا۔ میں نہیں کہتا کہ ملاؤں کی کوئی طاقت نہیں لیکن عوامی طاقت کے مقابلے میں یہ لوگ ٹھہر نہیں سکتے''

بھٹو نے یہ بات اس وقت کہی تھی کہ جب ایوب خان کے اقتدار اور اس کی آمریت کا طلسم تو ٹوٹ چکا تھا لیکن ابھی اس نے اس عوامی یلغار کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے تھے کہ جس کی قیادت بھٹو کر رہے تھے لیکن صرف ایک سال کے اندر اندر بھٹو کی پُرجوش قیادت اور اس کی دلنواز شخصیت نے ثابت کر دیا کہ پاکستان کے مُلا عوامی طاقت کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتے۔ ۱۹۷۱ء کے عام انتخابات میں ایک طرف پاکستانی ملاؤں کی تمام تر طاقت، ان کا مذہبی جنون، ان کی فرقہ وارانہ سیاست اور ان کا انتہائی شر انگیز پروپگنڈا تھا اور دوسری طرف بھٹو اور اس کی پیپلز پارٹی، غریب بھٹو کے خلاف وہ سارے ہتھکنڈے استعمال کئے گئے کہ جو بالعموم تنگ نظر مولوی اور خودغرض سیاست دان ہر روشن دماغ، ترقی پسند اور دور اندیش مسلمان رہنما کے خلاف استعمال کیا

کرتے ہیں۔ کہا گیا کہ وہ مسلمان نہیں، اسے نماز پڑھنا نہیں آتی، وہ شراب پیتا ہے، وہ اسلام کا دشمن ہے اور کمیونسٹوں کا ایجنٹ، پاکستان میں کسی بھی لیڈر کے خلاف اس قسم کا پروپگنڈا اس کے سیاسی کردار اور مستقبل کے لئے تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے اور خاص طور پر اس وقت کہ جب ایسا کہنے والے مولوی ہوں اور بزرگان دین... لیکن بھٹو عوامی طاقت کے بل بوتے پر بڑی شان سے ان لیڈروں کو پاؤں تلے روندتا ہوا اس طرح آگے بڑھ گیا کہ مولوی صاحبان اپنی پگڑیاں اور جوتے چھوڑ کر میدان سے بھاگ گئے۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک لیڈر نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اس ملک میں ایک جدید تہذیب یافتہ ترقی پسند اور سوشلسٹ سماج تعمیر کیا جاسکتا ہے اور اس موقع پر میں نے پاکستان زندہ باد کے عنوان سے ایک اداریہ سپرد قلم کر کے بھٹو صاحب کو خراج عقیدت اور ان کی قیادت کوخراج تحسین پیش کیا تھا۔ ٹھیک نو سال بعد راولپنڈی جیل کی ایک کالی کوٹھری میں پاکستان کے مولویوں، ملاؤں، اسلام فروشوں اور مذہب کا کاروبار کرنے والے سوداگروں نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں اپنی شکست کا انتقام لینے کے لئے بھٹو کے گلے میں پھانسی کا پھندا لٹکا کر اسے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔ بھٹو نے مجھ سے کہا تھا کہ "پاکستان میں مُلا ازم نہیں چل سکے گا" بھٹو کے قاتلوں کا خیال ہے کہ بھٹو کے قتل کے بعد پاکستان میں مُلا ازم کا مستقبل محفوظ ہو گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قاتلوں کے منصوبے پورے ہوتے ہیں یا مقتول کے خواب؟

میرے نزدیک بھٹو کی اہمیت اور عظمت کا راز اس حقیقت میں

پوشیدہ ہے کہ اس نے پاکستان کو مملکت اور قومیت کا ایک جدید تصور دیا۔
اس نے تعصّبات اور توہمات میں جکڑے ہوئے لوگوں کو ایک نئے اور
مثبت اقتصادی اور معاشی نظام سے روشناس کر دیا۔ اس نے روٹی، کپڑا
اور مکان کا نعرہ دیکر امیری اور غریبی کو خدا کی دین سمجھنے والے لوگوں کو
جدوجہد کا حوصلہ دیا۔ اس نے پاکستان کو مولویوں کی قید اور ملاؤں کے
چنگل سے چھڑانے کے لئے عوامی طاقت کے بل بوتے پر ان کے
خلاف جہاد کیا اور پاکستان جیسے ملک میں یہ سب کچھ کرنا اتنا آسان
نہیں کہ جتنا ہمیں نظر آتا ہے۔ اسے اپنے بنیادی مقصد کے حصول کے
لئے بارہا ایسے ایسے سمجھوتے کرنا پڑے کہ جو اس کے ذہن اور ضمیر
دونوں کو ناگوار تھے اور بعض اوقات ملاؤں کی یلغار کو روکنے کے لئے
خود مولوی بننا پڑا لیکن پاکستان کو ایک جدید ترقی پسند اور طاقت ور ملک
بنانے کا بنیادی مقصد اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوا۔ اس کی موت
کی سازش دراصل اس بنیادی مقصد کے خلاف ہی سازش تھی اور اس
کے قاتلوں کو اس بات کا احساس تھا کہ بھٹو کو قتل کئے بغیر جدید پاکستان
کے خواب کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے الفاظ میں بھٹو کا قتل ایک فرد
اور ایک ذات کا نہیں، ایک تصور، ایک عقیدے ایک خواب اور ایک
ملک کا قتل ہے!

میرا یہ دعویٰ نہیں کہ بھٹو میں کوئی کمزوری یا خامی نہ تھی۔ بلکہ مجھے
یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ان میں بہت سی ایسی کمزوریاں اور کوتاہیاں
تھیں کہ جن کی وجہ سے وہ اقتدار میں آنے کے بعد بارہا اپنا توازن
برقرار نہ رکھ سکے۔ اقتدار کے استعمال اور اقدار کے تحفظ دونوں میں

انہوں نے بڑی لاپروائیاں برتیں اور خاص طور پر اپنے مخالفوں سے نمٹنے کے لئے انہوں نے کئی بار جمہوری حدود سے تجاوز کیا اور قانونی ضابطوں سے تغافل برتا لیکن یہ وہ خامیاں ہیں کہ جن سے کوئی سیاست دان اور خاص طور پر جب وہ برسراقتدار ہو مُبرا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اپنے حریفوں اور اپنے قاتلوں کے مقابلے میں ان کا مرتبہ، ان کا منصب اور ان کا کردار کیا ہے؟ یہ دیکھنے کے لئے بھٹو کی اس تاریخی دستاویز کا مطالعہ کرنا ضروری ہے کہ جو انہوں نے راولپنڈی جیل کی کالی کوٹھری میں ''اگر میں قتل کیا گیا۔'' کے عنوان سے مرتب کی ہے اور جسے خفیہ طریقے پر ہندوستان میں درآمد کر کے یہاں شائع کیا گیا ہے۔ موت کی وادیوں میں لکھی ہوئی یہ کتاب بھٹو کی بے پناہ ذہانت، عالمی سیاست پر اس کی گہری نظر، اس کی تحریر کی شوخی، اس کی استدلال کی خوبصورتی اور زبان وبیان پر اس کی بے پناہ قدرت کا زبردست ثبوت تو ہے ہی، لیکن اس سے زیادہ بھٹو کے قاتلوں کے خلاف ایک ایسی فرد جرم ہے کہ اسے پڑھ کر وہ اپنی تمام تر کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود اپنے حریفوں کے مقابلے میں ایک ایسی عظیم شخصیت کے طور پر ابھرتا ہے کہ پڑھنے والا اس کی کمزوریوں سے بھی عشق کرنے لگتا ہے۔ بھٹو لکھتے ہیں کہ ''مجھ پر انتخابات میں دھاندلیوں کا الزام ہے، قطع نظر اس کے کہ یہ بڑا جرم ہے یا قرآن پاک کی تلاوت کے بعد قوم سے نوے دن کے اندر اندر انتخابات کرانے کا وعدہ کرنے کے بعد انتخابات کو غیر معین عرصے تک اٹھائے رکھنا زیادہ بڑا جرم ہے؟ اسی طرح اپنے خلاف عائد ہر الزام کے جواب میں بھٹو نے اپنے قاتلوں کی ریاکاری،

ان کی بے ایمانی، عہد شکنی اور دغابازی کو اس طرح بے نقاب کر دیا ہے کہ فوجی وردیوں اور تمغوں میں چھپے ہوئے بڑے بڑے جنرل الف ننگے نظر آتے یں۔ یہ بھٹو کے قلم اور اس کے بیان کا ہی اعجاز نہیں، اس کی معصومیت، اس کے خلوص، اس کی صداقت اور اس کی جرأت کا بھی ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔

بھٹو جواہر لال نہرو کے بعد برصغیر کے دوسرے رہنما ہیں کہ جن کی کتابوں تحریروں اور تقریروں سے ایک مربوط سیاسی فکر اور ٹھوس سیاسی نظریات ابھرتے ہیں۔ جواہر لال نہرو کی ہی طرح وہ ایک ایسے جدید ذہن کے مالک تھے کہ جس میں تعصّبات توہمات اور خرافات کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

نوٹ : بھٹو مرحوم پر شمیم صاحب کا یہ مضمون اُن کی علالت کی وجہ سے مکمل نہیں ہو سکا تھا۔ ۱۹۸۲ء کے شمیم یادگاری شمارہ میں اسے شامل کرلیا گیا تھا۔

گائے کے فائدے

خاکسار چراغ بیگ نے تیسری جماعت میں یہ شعر زبانی یاد کر لیا تھا (چراغ بیگ پرائمری پاس ہے)

رب کا شکر ادا کر بھائی   جس نے ہماری گائے بنائی

اُن دنوں والد صاحب کہیں سے ایک موٹی تازی گائے خرید کر لائے تھے اور میں دن میں کئی مرتبہ گائے کے سامنے یہ شعر دُہراتا۔ میرا خیال تھا کہ اپنی تعریف سُن سُن کر گائے زیادہ دُودھ دے گی اور اس طرح میرے دُودھ کا کوٹا بھی بڑھ جائے گا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ گائے صاحبہ نے دُودھ کی مقدار میں اضافہ کیا یا نہیں، لیکن ایک بات طے ہے کہ یہ گائے بڑی شعر فہم تھی۔ کیونکہ جب بھی میں اس کے سامنے کسی نا معلوم شاعر کا یہ شعر پڑھ دیتا، وہ فرطِ محبت سے میرا سر چاٹنا شروع کر دیتی (پُرانے وقتوں کی گائیں بھی کیا چیز تھیں، آج بڑے بڑے منسٹر بھی شعر نہیں سمجھ سکتے)۔ ہاں تو میں اپنی گائے کا ذکرِ خیر کر رہا تھا کہ بڑی پیاری، صحت مند اور مفید گائے تھی۔ اُن ہی دنوں ماسٹر صاحب نے مجھ سے یہ پوچھا تھا کہ گائے کے کیا کیا فائدے ہیں۔ میں نے جھٹ سے جواب دیا تھا کہ گائے دُودھ دیتی ہے اور میرا سر چاٹتی ہے۔ یہی اس کے فائدے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ماسٹر
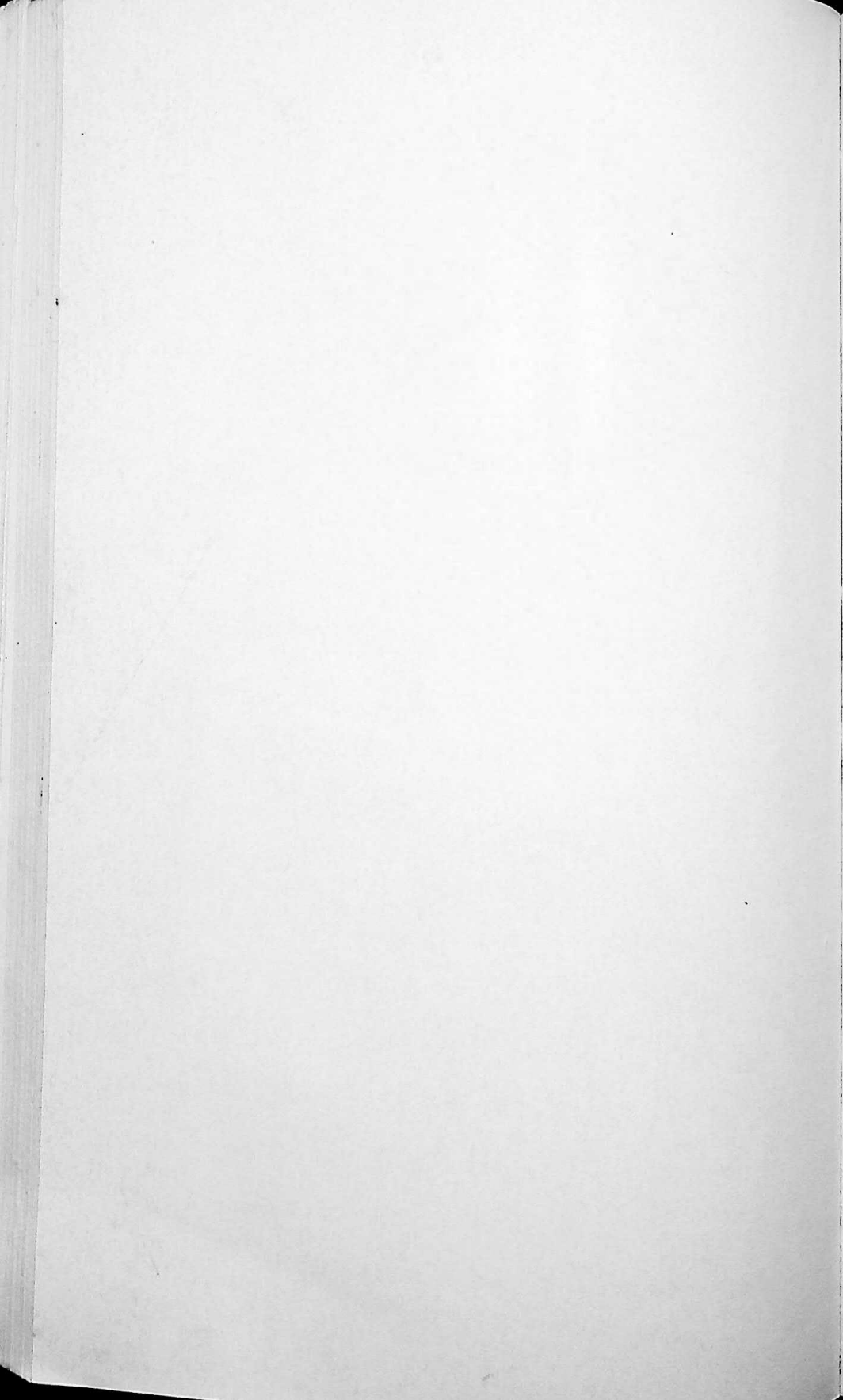
صاحب نے گائے کے اور بھی بہت سے فائدے بتائے تھے ۔ مثلاً یہ کہ گائے کا گوبر جلایا جاتا ہے ۔ گائے سال میں ایک بار ایک بچھڑا دیتی ہے ، مرنے کے بعد گائے کے چمڑے سے جُوتے بنتے ہیں ، وغیرہ وغیرہ ۔ میں ماسٹر صاحب کی علمیت کا بے حد قائل ہوا کہ ان کی دُور بین نگاہوں نے گائے کے متعلق کتنی معلومات فراہم کیں ۔ جب سے آج تک بیس بائیس برس کا عرصہ گزرا ہے ۔ میرے دل میں ماسٹر صاحب کی عزت و احترام کا جذبہ بدستور موجود ہے ۔ لیکن پچھلے دو ایک ہفتوں سے اس جذبے میں کسی قدر کمی واقع ہوئی ہے بلکہ میں ماسٹر صاحب سے ناراض بھی ہوں کہ گائے کے بہت سے فائدے بتاتے ہوئے اُنہوں نے " اصلی گائے " سے مجھے ناواقف رکھا ۔ ابھی حال ہی میں مجھ پر یہ راز کھل گیا کہ گائے کا سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ اس کے نام پر الیکشن لڑا جا سکتا ہے ۔ پچھلے دنوں بھارتیہ جن سنگھ نے گائے کے تئیں اپنی محبت ، عقیدت اور شجاعت ، کا جو مظاہرہ کیا ، اس سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ گائے میں انتخابات جتوانے کی بڑی غیر معمولی صلاحتیں ہیں ، ورنہ ہر بار الیکشن سے چند ماہ پہلے جن سنگھیوں اور مہابھارتیوں کو گائے کا عشق کیوں ستانے لگتا ہے ۔ ۷؍ نومبر کو جب ہزاروں ننگ دھڑنگ سادھوؤں نے پارلیمنٹ پر ہلہ بول کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس مُلک کو صرف یہ مسئلہ درپیش ہے کہ گائے کو قصائی کی چھری سے بچا لیا جائے ، عین اُسی وقت بہار اور یو ۔ پی میں ہزاروں ننھے ننھے بچّے بھوک کی شدّت سے بلک رہے تھے ۔ لاکھوں گائیں ہندوستان کے گلی کوچوں میں اپنے وجود کا ناقابلِ برداشت بوجھ

اُٹھائے بھوک سے نِڈھال ہو رہی تھیں ۔ دلّی کے فُٹ پاتھوں پر کچھ مائیں ہندوستان کے نئے شہریوں کو جنم دے رہی تھیں ۔ ہسپتالوں کے باہر لاکھوں ہندوستانی نوجوان خون تھوک رہے تھے ، ملک کے ہر بڑے شہر میں سیتا اور مریم اپنا جسم بیچ رہی تھیں ، لیکن دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے والے ان '' انقلابیوں '' کو یہ سب کچھ دکھائی نہ دیا ۔ وہ دیوانہ وار ملک کے سب سے مقدس ایوان پر صرف اس لیے حملہ آور ہوئے کہ ذبیحہ گاؤ پر پابندی عائد کر دی جائے ۔ یعنی انسان مرتا ہے تو اسے مرنے دو ۔ گائے بھوکی ہے ، بیمار ہے ، نحیف و لاغر ہے تو اس کی کوئی فکر نہیں ، صرف اس کے ذبح کرنے پر پابندی لگاؤ ۔ یہ سِسک سِسک کر مر جائے تو کوئی بات نہیں ، یہ خوراک کے ایک دانے کے لیے تڑپتی رہے تو کوئی غم نہیں ۔ لیکن اسے کوئی ذبح نہ کرنے پائے ۔ گائے کے '' تقدس '' اور '' عظمت '' کو بچانے کے لیے جن سنگھی سور ماؤں نے ملک کی عظمت اور تقدس کو پاؤں تلے روند دیا ۔ پیشہ ور ڈاکوؤں کی طرح دلی کی آبرو لوٹ ڈالی اور دُنیا ہنستی رہی کہ جواہر لال نہرو کا ہندوستان بھی کیا ہندوستان ہے کہ جہاں انسان تو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے تو اس کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا ، لیکن '' گائے ماتا '' کی رکھشا کے لیے ہزاروں بھکاری خون کے پیاسے نظر آتے ہیں ۔ ہم دُنیا کو کیوں کر بتائیں کہ گائے کی رکھشا در اصل ایک پُر فریب نعرہ ہے ۔ یہ صرف آئندہ انتخابات کی ایک چھوٹی سی کرامت ہے ۔

❁❁❁

۸/ستمبر ۱۹۶۴ء

رفیق صادق کے نام

پیارے رفیق!

تمہاری شادی میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ مجھے افسوس ہے کہ چند ناگزیر مجبوریوں کی وجہ سے شریک نہ ہو سکا۔ میری اقتصادیات تمہیں کوئی قیمتی سا تحفہ دینے کی متحمل نہیں ہو سکتی اور تار دیکر میں اپنے معاشی نظام کو درہم برہم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تمہیں ایک بے تکلف سا خط لکھ کر ''رموز شوہریت'' سمجھانا بھی بے معنی ہوگا، کیونکہ سب کچھ تم نے ''ہدایت نامہ خاوند'' وغیرہ قسم کی کتابوں میں پڑھ لیا ہوگا۔ اسی لئے شادی کی اس پر مسرت اور فیصلہ کُن تقریب پر میں نے تمہیں آئینہ کی معرفت یہ کھلی چھٹی لکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ میرا تحفہ بھی ہے اور تمہارے دعوت نامے کی رسید بھی۔!

میرے بھائی! ۲۸ فروری کو تم ایک عام سے نوجوان تھے۔ شہر کے اور بہت سے رفیقوں کی طرح تم میں کوئی ایسی خاص بات نہ تھی جو کسی کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ تمہیں شہر کی سڑکوں پر اپنے ہم عمروں اور ہم جماعتوں کے ساتھ گھومتے پھرتے دیکھ کر میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ میں تم سے کبھی یوں مخاطب ہو سکتا ہوں۔ لیکن ۲۸ فروری کو تمہاری آزادی، تمہاری ''عمومیت'' تمہارے لا ابالی پن اور بہت حد تک تمہاری انفرادیت کا آخری دن تھا۔ اس دن کے بعد تم رفیق صادق ہو گئے۔ وزیر اعظم جموں و کشمیر کے صاحبزادے! تم ایک عام سے نوجوان سے

ایک ''خاص فرد'' ہو گئے۔ یکم مارچ کو جب میں نے پہلی مرتبہ تمہیں
دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ تم رفیق سے رفیق صاحب ہو گئے
ہو۔تمہاری آنکھوں میں بھی ایک تبدیلی آ گئی تھی۔ یہ سب کچھ فطری تھا،
یہ نہ ہوتا تو مجھے حیرت ہوتی۔تم نے محسوس کیا ہوگا کہ اس دن کے بعد
تمہارے دوستوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔ وہ لوگ جو
تمہیں اس طرح نظر انداز کر دیتے تھے کہ جیسے تمہارا وجود کوئی حقیقت
ہی نہ رکھتا ہو، اب تمہاری ہر ادا کے عاشق ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگوں کو تم
سے بے پناہ عقیدت اور محبت ہو گئی ہو گی۔ بعض لوگوں کو دفعتاً تمہاری
ذہانت،شوخی اور حاضر جوابی کا احساس ہو گیا ہوگا۔ کچھ تجربہ کاروں نے
تم سے ایسی صفات منسوب کی ہوں گی جن کے تم قیامت تک بھی سزا
وار نہیں ہو گے۔ کافی ہاؤس میں تمہاری کافی کا بل دینے کے لئے
تمہارے کئی دوست آپس میں لڑتے جھگڑتے بھی ہوں گے۔ تمہاری
معمولی معمولی باتوں پر قہقہے لگانے والے دوستوں نے تمہیں اس بات کا
بھی یقین دلایا ہوگا کہ تم بے پناہ خوش مذاق ہو۔صرف پچھلے چھ ماہ ہی
میں تمہارے سیاسی شعور، ادبی مذاق اور مصورانہ صلاحیتوں کے قدر داں
پیدا ہو گئے ہوں گے۔تمہارے نئے دوستوں کے لئے اب تم سے لمحہ بھر
کے لئے جدا رہنا قیامت سے کم نہ ہوتا ہوگا۔ بعض بزرگوں نے قرآن
شریف کی قسمیں کھا کھا کر یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہوگی کہ تم انہیں
اپنے بیٹوں کی طرح عزیز ہو۔ بعض عیاروں نے جھوٹی قسمیں کھانے
کے لئے بھی تمہارا ہی انتخاب کیا ہوگا۔غرض یہ کہ طرح طرح سے تمہیں
تمہاری عظمت، بزرگی، دانائی، شرافت اور ذہانت کا یقین دلانے کی کوشش

ہو رہی ہوگی۔ انسان بڑا خودفریب ہے۔ بعض مرتبہ جان بوجھ کر بھی دھوکا کھاتا ہے۔ تم ابھی کم سن ہو، نادان ہو، ناتجربہ کار ہو۔ ہوسکتا ہے کہ تم اس دھوکے میں آکر ان کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر رہ جاو۔ اسی لئے تم سے دو ایک باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اگر چہ تمہارا بزرگ نہیں، تمہارا دوست بھی نہیں لیکن میرے پاس مشاہدات اور تجربات کی پونجی تم سے زیادہ ہے۔

برادر عزیز! طاقت ایک عجیب وغریب شے ہے۔ یہ ایک قسم کا شہد ہے جس کے اردگرد مکھیاں جمع ہوتی ہیں۔ ان مکھیوں کو جہاں بھی یہ ''شہد'' نظر آئے، یہ اسکے گرد منڈلانا شروع کرتی ہیں۔ تمہارے والد کے پاس طاقت آگئی ہے۔ ان میں اگر چہ تمہارا کوئی دوش نہیں ہے لیکن تم چونکہ وزیراعظم کے صاحبزادے ہو، اس لئے شعوری یا غیرشعوری طور پر تمہیں بھی اس شہد سے وابستہ سمجھا جائیگا اور پھر مکھیاں تمہارے اردگرد منڈلانا شروع کرینگی۔ اب تم رفیق نہیں رہے ہو، کچھ اور ہوگئے ہو، اب تمہاری ہر بات تنقید واحتساب کا موضوع بن سکتی ہے۔ تمہاری ہر شرارت یا شوخی اسی پس منظر میں دیکھی جائے گی کہ تم وزیراعظم کے فرزند ہو۔ بعض لوگ تمہیں سفارشوں کے لئے استعمال کریں گے۔ تمہارے ذریعہ قانون، عدل اور انصاف کو متاثر کرنے کی کوشش کریں گے تمہارے بھولپن اور کمسنی کا فائدہ اٹھا کر تمہیں مقاصد کے لئے استعمال کرنے سے بھی دریغ نہ کریں گے۔ یہ میں بے پر کی نہیں اڑا رہا ہوں۔ یہ ہوا ہے تمہارے کشمیر میں ہوا ہے، پنجاب میں ہوا ہے، دلی میں ہوا ہے، بمبئی میں ہوا ہے۔ پنجاب کا واقعہ تو ابھی تک تمہارے ذہن میں بھی تازہ ہی ہوگا۔ خود میں نے تمہارے اردگرد ایسے لوگوں کا جمگھٹا

دیکھا ہے، جن کا مقصد تم سے سفارشیں کرانا ہے اور لوگوں پر دھونس جمانا ہے۔ جو تمہیں تمہاری دوستی کا واسطہ دے کر تم سے کوئی غلط یا ناجائز کام کرانے کی تاک میں ہیں۔ ابھی ہماری ریاست میں فرض اور ذمہ داری کا وہ احساس پیدا نہیں ہوا ہے کہ لوگ صرف قانون ہی کا احترام کریں۔ ابھی تک شخصیتوں سے مرعوب ہونے کا سلسلہ جاری ہے۔ اس لئے اپنا ہر قدم پھونک کر اٹھانا، جب بھی کوئی تمہاری تعریف کرے، جان لو کہ اسکے پیچھے کوئی مقصد ہے، جب بھی کوئی تم سے دوستی جتائے، سمجھ لو کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ طاقت اور اقتدار سے وابستگی کے لئے بہت بڑی قیمت دینا پڑتی ہے۔ انسان کو بچپن میں ہی بزرگ بننا پڑتا ہے۔ یہ قیمت تمہیں بھی ادا کرنا ہوگی۔ تم جانتے ہو کہ اقتدار ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں۔ جو اقتدار کو موروثی سمجھ کر انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے بے نیاز ہو گئے ہیں اور ہو گئے تھے ان کا انجام تم نے دیکھ لیا۔ ایسا نہ ہو کہ تم ان کی غلطیاں دہراؤ۔ تمہیں اپنے نفس پر جبر کرنا ہوگا۔ تم اگر جائز طور پر بھی دولت کماؤ، تو اسکے بارے میں شبہ پیدا ہو سکتا ہے تم سے اگر کوئی معمولی سی لغزش بھی ہو تو وزارت عظمیٰ کا سنگھاسن ہل سکتا ہے۔ وزیر اعظم کے صاحبزادوں کو وہ آزادی حاصل نہیں ہو سکتی جو عام انسانوں کا پیدائشی حق ہے اور ہاں یہی بات ان وزیر زادوں کے ذہن نشین بھی کراؤ جو اپنے آپ کو شاہزادے سمجھ کر شرافت اور انسانیت کی اقدار کو پائمال کرتے رہتے ہیں۔

بھائی کو میری طرف سے آداب کہہ دینا!

فقط تمہارا

چراغ بیگ

❀❀❀

۷/اکتوبر ۱۹۶۴ء

بھک منگوں کے نام

پیارے بھک منگو!

تمہیں پتہ چل ہی چکا ہوگا کہ تمہاری سرکار نے یکم جنوری ۱۹۶۵ء سے بھیک مانگنا جرم قرار دیا ہے۔ اس دن کے بعد شہر کی سڑکیں تہارے متعفن وجود سے پاک ہو جائینگی۔ تمہارے درد انگیز نالے اور تمہاری پریشان کُن صدائیں اس کے بعد سنائی نہیں دیں گی۔ سری نگر کے ماتھے سے تمہارے وجود کا کلنک مٹ جائے گا اور جموں کی چوڑی چکلی پتھریلی سڑکیں تمہارے پیشے کی غلاظت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صاف ہو جائینگی۔ تمہارے جسموں کے رستے ہوئے ناسور ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائینگے اور تمہاری زندگی کی سڑانڈ اور عفونت ہمارے معاشرے کی فضا کو مسموم نہ کر سکے گی۔ تم اپنے زخموں کی نمائش کر کے ہمارے ضمیر میں ایک کسک پیدا کر دیتے تھے۔ تم اپنی دلدوز آہوں سے ہمارے آرام اور سکون میں مخل ہوا کرتے تھے۔ تم ہماری عالیشان عمارات کے سایوں میں بیٹھ کر ان کے حُسن کو ماند کر دیا کرتے تھے۔ تم ہمارے ہوٹلوں کے باہر اپنے نحیف اور لاغر جسموں کا بوجھ لئے ہماری ترقی اور خوشحالی کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ تم ہمارے شہر کی شاہراہوں پر سیاحوں کے سامنے دستِ سوال دراز کر کے ہمارے جھوٹ کا پول کھول دیا کرتے تھے۔ ہم نے قانون کا سہارا لے کر اپنے جھوٹ کا بھرم رکھنے کا

فیصلہ کیا ہے ہم نے اپنے ضمیر کو جھوٹی تسلی دینے کے لئے تمہیں شاہراہوں سے اٹھا دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم نے تمہاری دلخراش چیخوں سے بچنے کے لئے تمہاری زبان پر قانون کے تالے لگا دیئے ہیں۔ تمہاری ''دست اندازی'' سے محفوظ رہنے کے لئے ہم نے تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنانے کا فیصلہ کیا ہے۔

فٹ پاتھ کے شہزادو! یہ اکتوبر کا دوسرا ہفتہ ہے۔ تمہیں زندہ رہنے کے لئے قانون نے تین مہینے دیئے ہیں۔ ان تین مہینوں کا پورا پورا فائدہ اٹھاؤ۔ ان تین مہینوں کے لئے قانون نے تمہارے بھیک مانگنے کے حق کو تسلیم کر دیا ہے۔ اپنی تمام تر قوتیں اور صلاحیتیں داؤ پر لگا کر بھیک مانگو، اتنا مانگو کہ پھر مانگنے کی حسرت ہی نہ رہے۔ اتنا چیخو کہ پھر چیخنے کی ہمت ہی نہ رہے، اتنے دروازوں پر دستکیں دو کہ پھر دستک دینے کی ضرورت ہی نہ رہے۔ اپنے ہاتھ پھیلاؤ، اپنے کشکول آگے بڑھاؤ، اپنے زخموں کو عریاں کردو، ہمارے جذبۂ ترحم کو تازیانے دے دے کر بیدار کردو۔ اپنی آہوں میں اتنا اثر پیدا کردو کہ ہم اپنی ریاکاری بھول کر تمہارے سینوں میں جھانک سکیں، اس درد کو پہچان سکیں، جس نے تمہاری زندگی کو جہنم اور تمہارے وجود کو ہمارے لئے ناقابل برداشت بنادیا ہے۔ تم میں سے یقیناً اکثریت ان لوگوں کی ہے، جو گداگر ہی پیدا ہوتے ہیں اور گداگر ہی مرتے ہیں۔ تم میں سے بہت سوں نے کسی فٹ پاتھ پر، کسی خانقاہ کے باہر، کسی عالیشان عمارت کے عقب میں جنم لیا ہوگا۔ تمہیں کبھی یہ سوچنے کا موقع بھی نہ ملا ہوگا کہ زندگی گداگری کے علاوہ بھی کسی چیز کا نام ہوسکتا ہے۔ تمہیں اپنے دکھوں کا احساس بھی نہ

ہوتا ہوگا۔تمہاری زندگیاں اپنے رحم دل ہمسایوں اور خداترس بندوں کے ٹکڑوں پر گذری ہیں اور جانتے ہو کہ تمہاری اس زندگی کو جہنم زار بنانے والے کون ہیں؟ جانتے ہو کہ تمہیں گداگر بنانے والے کون ہیں؟ یہ ہم ہیں جنھوں نے تمہارے جسم اور تمہارے سارے وجود کو زخمی کر دیا ہے اور آج ہم ہیں ایک قانون بنا کر اپنے آپ کو ایک فریب میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ شہر کی شاہراہوں سے مٹا کر تمہارا وجود ختم ہو جائیگا۔ تمہاری آواز کو دبا کر یہ آواز ہمیشہ کے لئے دب جائیگی۔ تمہارے دستِ سوال کو زنجیروں میں کسنے کے بعد پٹڑی پر کوئی نہ ہوگا، یہ ہماری بھول ہے ہمیں کون سمجھائے کہ ہمارے سماج کے ناسور قانون کے غلاف پہنائے جانے سے چھپ سکتے ہیں، لیکن ٹھیک نہیں ہوسکتے۔ ہمیں کون بتائے کہ ہمارے جسموں کی بدبو قانون کا سہارا لے کر خوشبو نہیں بن سکتی۔ جب تک تمہارے پیٹ خالی ہیں، جب تک تمہارے جسم بے خون ہیں، جب تک تمہیں روزگار نہیں ملتا، جب تک تمہیں باعزت زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں ہوتا، دنیا کا کوئی قانون تم سے بھیک مانگنے کا حق بھی نہیں چھین سکتا ہے۔

بھک منگو! تمہاری سرکار بڑی ترقی پسند سرکار ہے۔ وزیر اعظم معاشیات کا ماہر ہے۔ وزیر داخلہ اشتراکی فلسفہ پر گہری نظر رکھتا ہے۔ وزیر خزانہ مالیات اور اقتصادیات کا طالب علم ہے۔سرکار نے تمہارے بھیک مانگنے پر پابندی لگادی ہے، تو ضرور اس میں کوئی مصلحت ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے پیشے کو خلاف قانون قرار دے کر سرکار یہاں کی معیشت، سیاحت اور سیاست کو مستحکم بنیادوں پر قائم کرنا چاہتی ہو۔ اس

لئے تمہیں اس قانون کے خلاف احتجاج کرنے کی بجائے اس کا احترام کرنا چاہیئے۔ اگلے سال تک چراغ بیگ وکیل ہو جائیگا اور تمہیں یہ بتائیگا کہ قانون کا احترام کرتے ہوئے قانون کی دھجیاں کیسے اڑائی جاتی ہیں لیکن فی الحال تم ایک کنونشن بلا کر یہ مطالبات حکومت کے سامنے پیش کردو۔

۱۔ اس قانون پر بڑی سختی کے ساتھ عمل ہونا چاہیئے۔

۲۔ ہر قسم کی بھیک مانگنا جرم قرار دیا جانا چاہیئے۔

۳۔ الیکشن میں ووٹوں کی بھیک مانگنا بھی اس قانون کے تحت جُرم قرار دیا جائے۔

۴۔ سیاسی جماعتوں کے لئے چندے کے نام پر بھیک مانگی جاتی ہے، وہ بھی ممنوع قرار دی جائے۔

۵۔ سرکاری دفاتر میں افسران اپنے فرائض انجام دینے کے لئے جو بھیک مانگتے ہیں، اسے بھی انسدادِ گداگری کے تحت جرم قرار دیا جائے اور ان افسراں کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے جوفٹ پاتھ پر بھیک مانگنے والوں کے ساتھ کیا جائے۔

۶۔ حکومت سے رحم اور انصاف کی بھیک مانگنے والوں کے خلاف بھی اسی قانون کے تحت چارہ جوئی کی جائے۔

۷۔ اپنی محبوباؤں سے محبت کی بھیک مانگنا بھی خلاف قانون قرار دیا جائے۔

فقط تمہارا

چراغ بیگ

❁❁❁

۳۰ اکتوبر ۱۹۶۴ء

ایڈمنسٹریٹر میونسپلٹی کے نام

پیارے ایڈمنسٹریٹر!

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے اور یہ خط پہنچنے تک خیریت سے ہی رہیں گے۔ میری خیریت کے بارے میں کچھ نہ پوچھئے۔ اسی سے میری سخت جانی کا اندازہ لگائیے کہ بدستور زندہ ہوں۔ حالانکہ جس ماحول اور جس فضا میں رہ رہا ہوں اس پر زندگی کی روشنی سے زیادہ موت کا اندھیرا مسلط ہے۔ آپ کا شہر جو دنیا کے کونے کونے سے آئے ہوئے سیاحوں کی پہلی منزل اور آخری تاثر ہے، آپکی کارکردگی کا ایک ایسا اشتہار ہے جسے پڑھنے کے لئے دنیا کی کوئی زبان جاننا ضروری نہیں۔ آپ اگر دنیا کے کسی مہذب اور متمدّن ملک میں ہوتے تو آپ کو شہر کے کسی بڑے بازار میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہوتا تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ لیکن آپ اس مادرِ کشمیر کے فرزند ہیں جس کی ہر چیز نرالی ہے۔ اس لئے اس بات کا زبردست امکان ہے کہ میونسپلٹی کے ایڈمنسٹریشن سے فارغ ہوکر آپ کو کلچرل اکاڈمی کا نگران بنا دیا جائے گا۔

ایڈمنسٹریٹر صاحب! میں یہ نہیں جانتا کہ شہر کی موجودہ زبوں حالی، بدصورتی اور بے ترتیبی کے لئے آپ ذمہ دار ہیں یا اور کوئی، آپ چونکہ اپنے قصور کے لئے دوسروں کو گنہگار ثابت کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے اسلئے ہوسکتا ہے کہ دلائل وبراہین سے یہ ثابت کردیں کہ شہر کی صفائی، خوبصورتی اور تزئین کے لئے تو آپ ذمہ دار ہیں، لیکن اسکی

عفونت، غلاظت اور بدصورتی کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر ہے۔ ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ آپ کے اور حکومت کے کیا تعلقات ہیں، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ حکومت اور آپ کے درمیان ایک قدر مشترک یہ ہے کہ آپ دونوں غیر جمہوری طریقوں سے برسر اقتدار آئے ہیں۔ مہاراجہ بہادر کے دورِ استبداد میں کم از کم میونسپل سطح پر ہمیں جمہوری حقوق حاصل تھے، لیکن عوامی دور حکومت میں ''انسداد جمہوریت'' کے لئے میونسپلٹی کے انتخابات کی بجائے ایک ایڈمنسٹریٹر مسلط کرنا ضروری سمجھا گیا۔ اس اعتبار سے آپ اتنے ہی عوامی نمائندہ ہیں جتنے آپ کے وزیر داخلہ... سو اس بحث میں پڑے بغیر کہ بندہ وآقا کے درمیان کیسے تعلقات ہیں، ہم آپ سے پوچھنا چاہیں گے کہ شہر سرینگر کی شہرت کو زخمی کرنے کے لئے آپ کے ترکش میں ابھی کتنے تیر باقی ہیں؟ یہاں کی غلاظت اور سڑاند کو دور دور تک پھیلانے کے لئے آپ کو کتنی گاڑیوں کی ضرورت ہے؟ اس کے رہے سہے حُسن کو پامال کرنے کے لئے آپکو ابھی کتنی مدت درکار ہے؟ یہاں کی سڑکوں کو قطعی طور ناقابل استعمال بنانے میں آپ کو کتنی رقم کی ضرورت ہے؟ سرینگر کی فضا کو بدبو اور تعفن سے بھر دینے کے لئے آپ مزید کون کون سے ذرائع استعمال کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ شاہراہوں پر تعمیر شدہ پیشاب گاہوں کی ''صفائی'' اور ''قرینے'' سے آپ کی میونسپلٹی نے ہماری شہرت کو جو چار چاند لگائے ہیں ان چار چاندوں کی حفاظت کے لئے آپ کیا اقدامات کرنے والے ہیں؟

خاکروبوں کے شہنشاہ ! آپ کو معلوم ہے کہ مدراس، بنگال، بمبئی، اڑیسہ اور کیرالہ سے آئے ہوئے سیاح کشمیر کی خوبصورتی کے

متعلق کیا کیا تصورات لے کر آتے ہیں؟ یورپ، امریکہ، جرمنی، فرانس اور روس سے آنے والے سیاح سوئٹزر لینڈ کی سیاحت کے بعد جب کشمیر آتے ہیں تو ان کے ذہن میں کشمیر کا کیا خاکہ ہوتا ہے؟ اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ سرینگر کی شاہراہوں سے گزرتے ہوئے جب انکی نگاہیں غلاظت کے ان ڈھیروں اور عفونت کے ان مرکزوں کی طرف اٹھتی ہیں جو آپ کی عنایات سے ہمارے وجود کا ایک حصہ ہو کر رہ گئی ہیں، تو انکے حسین خوابوں پر کیا گزرتی ہوگی؟ اور پھر اگر خدانخواستہ وہ سول لائنز کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر اندرون شہر کا رُخ کرتے ہوں گے (اکثر سیاح کرتے ہیں) تو وہ کشمیر کی خوبصورتی اور اسکے لازوال حسن کے متعلق کونسا تصور لیکر جاتے ہوں گے؟ سڑکوں کی خستہ حالی کے لئے غالباً آپ کو ذمہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن ان سڑکوں پر بکھری ہوئی نجاست اور میونسپلٹی کی تعمیر کردہ بیت الخلاؤں کی بدبو کو کس کے حساب میں لکھا جائیگا؟ پُر پیچ گلیوں کے اندھیروں میں بھٹکنے والے مسافر کی ٹھوکروں کو کس کے نام معنون کیا جائیگا؟ گندی نالیوں میں لت پت ہونے والے بچوں کے جسموں کی غلاظت کس کے چہرے پر مل دی جائے گی؟ بازار میں دودھ کے نام پر بکنے والے گندے پانی کو کس کے اعمالنامے میں درج کیا جائیگا؟ سڑے گوشت کی فروخت کا کاروبار کس سے، منسوب کیا جائیگا؟ مجھے افسوس ہے کہ یہ سب تمغے آپکی ذات گرامی ہی کے لئے مخصوص ہیں۔

سٹی فادر! چراغ بیگ آپ کے شہر کا ایک حقیر اخبار نویس ہے۔ اس کا دفتر شہر کے اس حصے میں واقع ہے جو آپ کے شہر کا اہم ترین اور خوبصورت حصہ ہے۔ چراغ بیگ سے ملنے کے لئے بیرون ریاست

کے سیاستدان، اخبارنویس، ادباوشعراء اور دوست واحباب بھی آتے رہتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ چراغ بیگ کے دفتر میں آتے ہوئے ان کا استقبال کون کرتا ہے؟ میرے دفتر کے ساتھ میں بہنے والی گندی نالی! جسکی سڑان اور بدبو سے رستم زماں بھی بے ہوش ہو جاتا (پھر میری سخت جانی کی داد دیجئے) اسکی بدبو اور اسمیں تیرتی ہوئی غلاظت میرے ماتھے کا نہیں، آپ کے ماتھے کا کلنک ہے۔آپ کی سرکار کے ماتھے کا کلنک ہے نہیں.... یہ ہم سب کے ماتھے کا کلنک ہے۔ ایڈمنسٹریٹر صاحب! آپ کو تو وزیروں کے مکانات کے گردونواح کو صاف وشفاف رکھنے سے ہی فرصت نہیں۔لیکن اگر کبھی وزیروں کی آنکھ بچا کر آپ پانچ منٹ کے لئے چراغ بیگ کے دفتر تشریف لائیں تو آپ کو یہ اندازہ ہوگا کہ آپ کا شہر کتنا غلیظ ہے، میونسپلٹی کتنی ذلیل ہے، آپ کتنے نااہل ہیں اور آپ کی حکومت کتنی ناکارہ ہے۔ غلاظت کا یہ سیلاب شہر کے اس حصے میں بہہ رہا ہے جو سول لائنز کے نام سے مشہور ہے۔ اندازہ کیجئے کہ شہر کے ان حصوں کا کیا حال ہوگا، جو آپ کی نگاہوں کے فیض سے بھی محروم ہیں۔

غلاظت اور عفونت کے بادشاہ! یقین کرو کہ اگر اس شہر میں سب سے زیادہ بدبو پھیلانے کے لئے کوئی انعام مقرر کیا جائے تو اس کا حقدار آپ اور آپ کی میونسپلٹی کے سوا کوئی نہ ہوگا۔ اگر اپنی بے پناہ مصروفیات سے فارغ ہوکر چند لمحے نکال سکو تو شہر کا ایک دورہ کر لینا۔

فقط تمہارا

چراغ بیگ

۱۱رفروری ۱۹۶۵ء

ڈاکٹر طاہر مرزا کے نام

ڈاکٹر صاحب! تسلیم! مجھے معلوم ہے کہ آپ میری اس گستاخی پر ناراض ہوں گے۔نہیں، میں غلط لفظ استعمال کر گیا۔ ناراض ہونا تو آپ کی سرشت میں شامل نہیں ہے، البتہ آپ کو اخبار میں اپنا نام دیکھ کر کوفت ہوگی۔ ایسی ہی کوفت جیسی آپ کو کسی نادار مریض کی بے بسی اور بیکسی پر ہوتی ہے اور آپ رات بھر بستر میں کڑھتے ہیں۔ دوستوں کے سامنے مسکراتے ہیں، لیکن خلوت میں شفقت اور مروت کے موتی رولتے ہیں...لیکن ڈاکٹر صاحب آج مجھ کو معاف کیجئے کہ کل ایک لرزہ خیز منظر دیکھ کر میرا کلیجہ پھٹ رہا ہے، میرے دل میں درد ہو رہا ہے۔ میں آپ کے ایک ہم پیشہ ڈاکٹر کی بیٹھک میں بیٹھا تھا۔ ایک نحیف ونزار خاتون میلے کچیلے کپڑوں میں وہاں بیٹھی تھی۔ اسکی حالت اتنی غیر تھی کہ وہ کسی نزاکت کا خیال کیے بغیر ہی بھری مجلس میں سیمنٹ پر ہی دھرنا مار کر دراز ہوگئی۔ اُس کی آنکھوں میں دکھی انسانیت سسک رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر انسانی روح زخمی ہو کر چیخ رہی تھی۔ کچھ دیر تک تو اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ بیماری اور انسانی بیچارگی کے ایسے منظر دیکھ دیکھ کر اب ہمارا کلیجہ پتھرا گیا ہے، لیکن پھر ڈاکٹر کا مقرر کردہ ''چوبدار'' آیا۔ اس نے بڑی رعونت سے اس کو بازو سے پکڑ کر اٹھا لیا اور پوچھا کہ کیسے آئی ہو۔ اس نے نسخہ نکال لیا اور کہا کہ میں پچھلے ایک مہینے سے

علاج کر رہی ہوں لیکن میری حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ چوبدار نے نسخے کی طرف دیکھا اور کہا کہ آج نسخے کے تیس دن پورے ہو گئے ہیں۔ نئی فیس لاؤ تو ڈاکٹر صاحب دیکھیں گے۔ اس بے چاری کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ آنسوؤں کی جھڑی برساتے ہوئے بولی کہ میرے پاس تو پھوٹی کوڑی نہیں، میں کہاں سے فیس لاؤں۔ چوبدار کے پتھر دل کو آنسوؤں کی یہ دھاریں نرم کئے بغیر نہ رہیں۔ اس نے کہا اچھا میں ڈاکٹر صاحب سے پوچھتا ہوں لیکن ایک منٹ کے بعد باہر آکر اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ خاتون کو بازو سے گھسیٹ کر کمرے سے باہر دھکیل دیا۔

ڈاکٹر صاحب! یہ عبرت انگیز تماشے یہاں روز ہوتے ہیں۔ جس پیشے کو آپ نے اپنی لگن سے عبادت کے درجے تک پہنچا دیا ہے، اس پیشے کو ان انسان نما بھیڑیوں نے قصائیوں کا پیشہ بنا دیا ہے، جلادوں کا کاروبار بنا دیا ہے۔ یہ لوگ سر سے لے کر پاؤں تک روپے میں غرق ہو چکے ہیں۔ انہوں نے عالی شان محل بنوائے ہیں۔ ان کے پاس ہر سال نئی ماڈل کی کار پہنچ جاتی ہے۔ ان کے بینک بیلنس کا حساب نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ سر سے پاؤں تک عیش و عشرت میں ڈوب گئے ہیں۔ ایک ایک شام کو "مئے ناب" کے لئے تین تین سو روپیہ خرچ کرنا ان کے لئے معمولی بات ہے، لیکن کسی بے کس مریض کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں حرص اور لالچ کا خون اتر آتا ہے۔ اگر ان کا بس چلے تو یہ اس کے کپڑے تک بیچ کھائیں۔ اتنا ہی نہیں یہ نمونے کے لئے آئی ہوئی دواؤں کو بیچکر پیسے بٹورتے ہیں۔ ہسپتال سے ٹکے آنے کی دوائیاں چرا کر گھروں میں بیچتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی مفلس ایک دن فیس

کی ادائیگی میں دیر کرے تو یہ بھوکے درندے کی طرح اس پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ اگر کوئی شخص دم توڑ رہا ہو تو یہ پہلے اس کے کفن کو بیچ کر اپنی فیس کا بندبست کرانے کی فکر کرتے ہیں۔ اگر کوئی انہیں خدا، رسول، گیتا، گرنتھ اور انجیل کا واسطہ دے کر فیس میں چار آنے کی چھوٹ دینے کی استدعا کرے تو یہ اس کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیتے ہیں۔ اس کی بات ان سنی کر کے اس کی بے وقوفی پر درندوں کی طرح قہقہے لگاتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب! ان مردم خوروں کی بستی میں آپ کا شعار کتنا مختلف ہے۔ آپ صبح سات بجے سے مریضوں کو دیکھنا شروع کرتے ہیں، نمونے کے لئے آئی ہوئی دواؤں کے علاوہ آپ اپنی تنخواہ کا ایک تہائی حصہ ہر مہینے دوائیاں خرید کر انہیں مفلس مریضوں میں بانٹنے پر خرچ کرتے ہیں آپ کی درگاہ میں سیم وزر کا پاسپورٹ بے کار ہو جاتا ہے۔ سماجی رتبے کی سند حرف غلط کی طرح دھتکاری جاتی ہے۔ آپ اکیلے جیسے سارے کشمیر کے گھائل بدن کو اپنے معطر عزم سے شفایاب کرنا چاہتے ہیں۔ دس بجے ہسپتال جا کر پورے چار بجے وہاں سے لوٹتے ہیں اور پھر جلدی جلدی چائے کی ایک پیالی پی کر کسی دور افتادہ بے کس مریض کو دیکھنے کے لئے چل پڑتے ہیں۔ ٹانگے کا خرچ اپنی جیب سے ادا کرتے ہیں۔ وہاں سے واپس آ کر جب پھر آپکے دروازے پر مریضوں کی لمبی قطار کھڑی ہوتی ہے تو آپ کے چہرے پر کوئی شکن نہیں ابھرتی، آپ مجسم شفقت بن کر ان کے دکھی شریر پر شفا کا پھاہا رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب! مجھے معلوم ہے کہ آپ سال بھر میں ایک دن بھی رخصت نہیں لیتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے پھٹے پُرانے کپڑوں پر اب نئی نئی

پیوندوں کے نقش ونگار بڑھتے جا رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو نہ ستائش کی پروا ہے اور نہ صلے کی تمنا، میں جانتا ہوں کہ جب کوئی مریض آپ سے تحفے کے طور ہر حاصل کی ہوئی دوا لے کر تشکر سے شکریہ کہہ دیتا ہے یا آپ کے دعا دیتا ہے تو آپ کا چہرہ شرم سے گلنار ہو جاتا ہے اور اس وقت میرے ذہن میں فیض کے اس شعر کی کیفیت روشن ہو جاتی ہے ؎

ادائے حسن کی معصومیت کو کم کر دے

گناہگار نظر کو حجاب آتا ہے

ڈاکٹر صاحب! میرا تو پہلے یہی خیال تھا کہ آپ کو مشورہ دوں کہ آپ بھی انہی قصائیوں کی طرح خون کی مشکیں باندھنے کا کاروبار شروع کیجئے۔ روم میں رہ کر رومیوں کی طرح جینا سیکھیے۔ آپ اکیلے کس طرح بیماری اور دکھ درد کے اس اتھاہ ساگر کو پاٹ سکیں گے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب! میں نے یہ خیال پھر واپس لے لیا، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ آپ کے بس کی بات نہیں۔ آپ کا خمیر تو نیکی، حسن، شرافت، خیر اور شفا کے عناصر خمسہ سے گوندھا گیا ہے آپ سراپا نور ہیں..... سراسر روشنی۔

لیکن ڈاکٹر صاحب! شہر کے باسی آپ کو دیوتا اور فرشتہ سمجھتے ہیں۔ اس بدی سے بھرپور اندھیری دنیا میں آپ کی جاذب نظر شخصیت دیکھ کر انسانیت کی اچھی قدروں پر ہمارا کھویا ہوا اعتماد بحال ہو جاتا ہے۔ خیر اور نیکی کے اصولوں پر ہمارا ایمان پھر تازہ ہو جاتا ہے۔ آپ کا وجود ہمارے معاشرے پر ایک گہرے طنز، ایک کراری چوٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک طرف خود غرضی کی پستیاں، عفونت کے گڑھے اور بدی کی ڈھلوانیں، دوسری طرف نیکی کا یہ مینار، انسان دوستی کے بحت

سلیمان کی یہ چوٹی، خیر کا یہ بلند و بالا قصر۔ لیکن ہم اندھے ہو گئے ہیں ڈاکٹر صاحب! اس تضاد کو دیکھ کر ہم پھر بھی پستی کی ہی طرف ڈھلک جاتے ہیں۔ ہمارے ضمیر مر گئے ہیں۔ ہماری روحیں مرجھا گئی ہیں۔ ہمیں آپ کا یہ لطیف ایمائی انداز متاثر نہیں کر سکتا۔ جب تک ہمارے ضمیروں کو دہکتے ہوئے لوہے سے داغا نہیں جاتا، ہماری روحوں کو بجلی کے صاعقے سے جھٹکے نہیں دئے جاتے، جب تک ہمارے دلوں میں پگھلا ہوا سیسہ نہیں اُنڈیلا جاتا، ہم بیدار نہیں ہو سکتے، ہوش میں نہیں آسکتے۔

ڈاکٹر صاحب! آپ کی درگاہ میں میں ہندو مسلم، چھوٹے بڑے، امیر غریب، ہندوستانی اور پاکستانی سارے امتیاز ختم ہو جاتے ہیں۔ جن غریبوں کو آپ نے نئی زندگیاں عطا کی ہیں وہ اس ہندوستان کو سلام کرتے ہیں جہاں سے آپ آئے ہیں، لیکن کاش اس ہندوستان کا صرف یہی چہرہ ہم نے دیکھا ہوتا۔ ہم نے ڈاکٹر گجرال کا چہرہ بھی دیکھا ہے اور وشوانا تھن کا بھی۔ ہم نے ان فرعون مزاج آفیسروں کو بھی دیکھا ہے جو کشمیریوں سے حقارت سے بات کرتے ہیں اور ان کے علاج کے لئے صرف لاٹھی اور بندوق کا استعمال ہی کافی سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب! آپ نے برنارڈ شاہ کا وہ مقولہ سنا ہو گا کہ نیک ہونا بھی بہت ہی خطرناک ہے۔ شہر کے بہت سے ڈاکٹر آپ کے اس کاروبار شوق کو پسند نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ آپ نے ان کے پیشے کا وقار گرایا اور ان کی تجارت کو بٹہ لگایا ہے۔ یہ لوگ آپ کے اس رویے کی عجیب تاویلیں کرتے ہیں اور سورج پر تھوکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی ایسا ہی بیری ڈاکٹر یہ سطریں پڑھ کر شاید اپنے گنہگار ضمیر کو یہ کہہ کر بہلائے گا کہ یہ

تو پبلسٹی سٹنٹ ہے اور بس۔ ہمارے ضمیر کی کالک اتنی بڑھ گئی ہے کہ اس آئینے میں اب ہمیں سورج کی کرنیں بھی کالی نظر آتی ہیں۔ ہماری روحوں کی سڑاند اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ گلاب کی خوشبو بھی بدبو کا بھبھوکا معلوم ہوتی ہے۔ لیکن آپ تو ان باتوں سے اسی طرح بے نیاز ہیں جس طرح اولمپس پر بسنے والے یونانی دیوتا۔ آپ اپنے باطن کے سوز و گداز کی آنچ میں اُسی عالم میں ہیں جس کا نقشہ میر تقی میرؔ نے ان لافانی الفاظ میں کھینچا ہے۔

دل پر خوں کی اک گلابی سے

عمر بھر ہم رہے شرابی سے

خدا وہ دن کرے جب آپ کی یہ مقدس بیماری ہمارے ڈاکٹروں کو بھی لگ جائے، وہ بھی اپنی روحوں میں انسانیت کی خلش اور ہمدردی کا کانٹا محسوس کریں۔ ان کو بھی ضمیر کی روشنی اور روح کی متاع حاصل ہو جائے۔

ڈاکٹر صاحب! ہم آپ کو بدلے میں کچھ نہیں دے سکتے۔ ڈاکٹری کو ہم نے بہت ہی نفع بخش پیشہ گِنا ہے اور اسی لئے لیڈر اور منسٹر سبھی اپنے اپنے لاڈلوں کو ماہر ''قصائی بننے کی تربیت دینے کے لئے دور دور بھیج رہے ہیں... ہم جیتے جی آپ کی کچھ قدر نہیں کر سکتے۔ لیکن بت پرستی ہمارے خمیر میں شامل ہے۔ شیخ صاحب کے بُت کی طرح ہم آپ کی خانقاہ بھی تعمیر کریں گے۔ آپ کی تقلید کا حوصلہ ہم میں کبھی پیدا نہ ہوگا۔ لیکن آپ کی عبادت کے لئے ہماری گردنیں خود بخود خم ہو جائیں گی۔

فقط آپ کا

چراغ بیگ
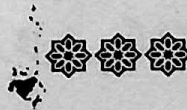
۲۸ مئی ۱۹۶۵ (کھلی چٹھی)

انور کریم کے نام

میرے محترم!

معاف کیجئے کہ آپ سے رسمی تعارف کے بغیر ہی یہ غیر رسمی خط لکھ رہا ہوں۔ فی الحال چونکہ آپ سے ملاقات کی کوئی تقریب نظر نہیں آتی، اس لئے یہ خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ خط کو آدھی ملاقات کہتے ہیں۔ مئی کے دوسرے ہفتے میں آپ کی طرف سے منعقدہ پریس کانفرنسوں میں، میں اس لئے شریک نہ ہو سکا کہ محکمۂ اطلاعات میں متعین ''ڈپٹی ہوم منسٹر'' دوار کا ناتھ رازدان جو ماضی میں موجودہ وزیر داخلہ کے سٹینوگرافر رہ چکے ہیں۔ اور اس ''تعلق'' کی بناء پر اپنے آپ کو مقربین خاص میں شمار کرتے ہیں (حالانکہ ایک روایت کے مطابق انہیں ڈی، پی صاحب نے ''جاسوسی'' کے الزام میں اپنی درگاہ سے نکال دیا تھا) کی نظروں میں ہفتہ وار اخباروں کو اتنی اہمیت نہیں دی جاسکتی کہ ان کے نمائندے آپ کو قریب سے دیکھ سکیں... بہر کیف، یہ تو ایک جملہ محترضہ تھا میں دراصل آپ سے کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں!

کریم بھائی! کشمیر میں آپ کا تقرر صرف اس لئے نہیں ہوا ہے کہ آپ انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس کے ایک ممتاز افسر ہیں۔ سروس میں یقیناً آپ سے ممتاز افسر موجود ہونگے لیکن اس کے باوجود کشمیر میں

ڈویژنل آفیسر کے عہدے کے لئے اگر قرعہ فال آپ کے نام نکلا ہے تو اس کے لئے آپ کی ایڈمنسٹریٹو قابلیت کے علاوہ کچھ اہلیتیں ہوں گی جو غالباً آپ ہی کے درجے کے باقی افسروں میں موجود نہیں ہوں گی۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنی ان اہلیتوں، صلاحیتوں، ذمہ داریوں اور فرائض کو بخوبی سمجھ لیں جو آپ کے منصب کو ایک تاریخی اہمیت عطا کرتی ہیں!

ڈیویژنل کمشنر صاحب! کشمیر میں ہم ایک بہت ہی نازک جنگ لڑ رہے ہیں۔ اس جنگ کی پیچیدگی اور اس کی باریکیوں کو سمجھنے کے لئے کشمیر کی تاریخ، جغرافیہ، آب وہوا اور لوگوں کے رہن سہن کا مطالعہ ہی کافی نہیں، یہاں کے لوگوں کی نفسیات سمجھنا بھی بہت ضروری ہے کیونکہ چراغ بیگ کی نظروں میں کشمیر میں لڑی جانے والی جنگ صرف ''سیاسی'' نہیں، بہت حد تک نفسیاتی بھی ہے۔ اس نازک اور عظیم جنگ کے اس نفسیاتی پہلو کو اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے اور بالخصوص بیرونِ ریاست سے آئے ہوئے افسر اس نزاکت کو یا تو سمجھ ہی نہیں پاتے یا اسے غیر ضروری سمجھ کر اپنی توجہ غیر ضروری مسائل کی طرف لگا دیتے ہیں جو وجہ Cause نہیں بلکہ نتیجہ Effect ہوتے ہیں!

صوبۂ بہار سے تعلق رکھنے کے باوجود آپ کو ہماری قومی روایات اور تحریک آزادی کے سیکولر کردار کا علم ہوگا۔ آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ۱۹۴۷ء میں جب ملک کے دیگر حصوں میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی، کشمیر میں امن وآشتی کی وہ فضا قائم تھی کہ گاندھی جی کو بھی صرف کشمیر ہی سے روشنی کی ایک کرن نظر آئی تھی۔ موئے مقدس کی ایجی ٹیشن کے دوران بھی کشمیریوں کی مذہبی رواداری اور ان کے بھائی چارے کی

روایات اپنی آبرو بچانے میں کامیاب ہو گئیں، اور جب سے آپ یہاں آئے ہیں، آپ نے خود محسوس کیا ہوگا کہ کشمیر کی فضا مذہبی منافرت اور فرقہ وارانہ کشیدگی سے پاک ہے آپ کو ان تمام باتوں کا احساس دلانا نہیں ہے بلکہ آپ پر یہ واضح کر دینا ہے کہ کشمیر میں مسئلہ فرقہ پرستی پر قابو پانے کا نہیں ہے بلکہ رواداری بھائی چارے اور محبت کی روایات کے تحفظ کا ہے۔ ہمارے ملک میں پچھلے سترہ برس سے کچھ ایسی باتیں ہوئی ہیں جن کی وجہ سے کشمیر میں رہنے والے لوگوں کو اپنی یہ عظیم روایات خطرے میں نظر آرہی ہیں اور خطرے کے اس احساس نے انہیں کئی نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ آپکا کام ان نفسیاتی الجھنوں کو سمجھنا، ان کے اسباب پر غور کرنا اور ایک ہمدرد ماہر نفسیات کی طرح ان کا علاج کرنا ہے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ آپ خود بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اس نفسیاتی بیماری کا شکار ہیں، جس کا علاج کرنے کے لئے آپ یہاں آئے ہوئے ہیں۔

''ہندوستانی مسلمان'' نفسیات کا ایک دلچسپ موضوع ہی نہیں، ایک لاینحل معمہ بھی ہے۔ ملک کی غیر فطری تقسیم نے اسے تقسیم کی تمام ذلتوں اور اس کے فطری نتائج کا وارث بنادیا ہے۔ اس کا دل، ذہن، ضمیر الگ الگ خانوں میں بٹ گیا ہے۔ وہ غداری اور وفاداری کے مابین اس طرح لٹکا ہوا ہے کہ اس کے جسم کی ایک نادانستہ یا اضطراری حرکت بھی اسے غدار بنا سکتی ہے۔ وہ ملک کے قومی دھارے میں شریک ہونے کے باوجود ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس سے الگ محسوس کرتا ہے۔ فرقہ پرست ہندو کو پوتر بھارت میں اس کا وجود بھی ناگوار

ہے۔ وہ قدم قدم پر اس کی وفاداری، اس کے خلوص اور اس کی نیت پر شک کرتا ہے۔ ہر مسلمان کو پاکستانی ایجنٹ قرار دیتا ہے۔ اس طرح ہندوستان کا مسلمان اپنی شدید خواہش کے باوجود ذہنی اور جذباتی طور پر آسودہ نہیں اور وہ اکثر اپنی وفاداری اور اپنے خلوص کا ثبوت دینے کے لئے بادشاہ سے بھی زیادہ وفادار بن جاتا ہے۔ ہندوستان کا مسلمان افسر بالخصوص اس ''ذہنیت'' کا بُری طرح شکار ہو جاتا ہے!

بندہ پرور! بادشاہ سے بھی زیادہ وفادار ہونا آسان ہے لیکن اس سے کچھ مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ آپ کا کام یہاں ملک کے تئیں اپنی وفاداری ثابت کرنا ہی نہیں، کشمیری مسلمانوں کے دلوں میں ان کا کھویا ہوا اعتماد بحال کرنا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ملک میں ہونے والے کچھ واقعات نے بھارت کی سیکولر ڈیموکریسی پر ان کا اعتقاد کمزور کر دیا ہے۔ بخشی راج کی اندھیر گردی نے ملک کے انصاف اور آئین سے ان کا اعتماد چھین لیا ہے۔ انہیں ملک میں مذہبی رواداری اور سماجی انصاف کی وہ قدریں محفوظ نظر نہیں آتیں، جن کی بنیاد پر انہوں نے ہندوستان سے وابستگی کا فیصلہ لیا ہے۔ آپ اپنے آرام دہ عالی شان دفتر کی چاردیواری سے باہر آکر یہاں کے لوگوں کو اس بات کا یقین دلایئے کہ ہندوستان میں مذہبی رواداری، سماجی انصاف، فرد کی آزادی اور جمہوری اداروں کا تقدس محفوظ ہے تو آپ صرف ایک لڑائی ہی نہیں بلکہ پوری جنگ جیت سکتے ہیں۔ اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لئے کشمیری مسلمانوں کو فرقہ پرست یا پاکستانی کہنا بہت آسان نسخہ ہے۔ آپ سے پہلے بھی بہت سے مسلمان افسر یہ نسخہ آزما چکے ہیں، لیکن اگر آپ

دیانتداری سے اس تاریخی رول کو نبھانا چاہتے ہیں جس کے لئے ''انور کریم'' کا انتخاب ہوا ہے تو تحکمانہ لب ولہجہ اور حاکمانہ آن بان کو چھوڑ کر ایک مشنری اور مبلغ کا روپ اختیار کیجئے۔ جس دن آپ ایک ہندوستانی مسلمان کی حیثیت سے کشمیری مسلمان کو اس بات کو یقین دلانے میں کامیاب ہو جائیں گے، کہ ہندوستان میں اس کا مذہب، اس کی آزادی، اس کا کلچر، اس کی روایات اور اس کے بچوں کا مستقبل محفوظ ہے، اُسی دن شیخ محمد عبداللہ کا چھ فٹ قد گھٹ کر چھ انچ ہو جائیگا۔ مولانا مسعودی گاندربل میں روپوش ہو جائیں گے اور خواجہ غلام محی الدین قرہ ایک بار پھر جاسوسی ناول پڑھنا شروع کریں گے اور آپ اپنی فتح مندی اور ظفریابی کے نعرے بلند کرتے ہوئے اپنی تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ پچھلے دنوں آپ نے ایک محبّ وطن اخبار نویس کو اپنے دفتر بلا کر اسے حب الوطنی کا درس دیا تھا۔ اُسے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس دلایا تھا۔ ہم لوگوں کو حب الوطنی کا درس دینے کی زحمت گوارا نہ کیجئے۔ ہم لوگ سرکار سے تین ہزار روپے تنخواہ نہ پانے کے باوجود اپنے ملک کی سلامتی کے لئے اپنی جانیں لڑا دینے کے لئے تیار ہیں۔ ہم تنخواہ یافتہ افسروں سے اپنی ذمہ داریوں کا درس لینے کو اپنی توہین سمجھتے ہیں!

فقط آپ کا

چراغ بیگ

۱۷ جون ۱۹۶۵ء

مالک مکان کے نام

پیارے مالک مکان!

اپنے کرایہ دار کی طرف سے سلام قبول کر لو، امید ہے کہ تم، تمہارے بال بچے اور تمہارا سارا خاندان بخیر و عافیت ہوگا۔ تمہاری خیریت سے میری کتنی ہی تمنائیں اور حسرتیں وابستہ ہیں۔ خدا کرے کہ تم اتنے آسودہ حال ہو جاؤ کہ مجھ سے ماہوار کرایہ وصول کرنا تمہارے لئے باعث شرم بن جائے (حالانکہ میں جانتا ہوں کہ جوں جوں تہاری آسودہ حالی بڑھتی جائے گی، توں توں میرا کرایہ بھی بڑھتا جائے گا، کیونکہ آسودہ حالی اور بے شرمی میں چولی دامن کا ساتھ ہے) بہر کیف تمہارا اور میرا ساتھ ازل سے ہے ایک روایت کے مطابق جب مالک دوجہاں نے مالک مکان کو پیدا کر کے اطمینان کا سانس لیا تو مالک مکان نے ہاتھ جوڑ کر کہا "اے مالک کون و مکان! تو نے مجھے مالک مکان تو بنا دیا لیکن جب تک اس مکان کے لئے مجھے کرایہ دار نہ ملے میری روح بے چین رہے گی۔" خالقِ دو جہاں کو مالکِ مکان کی حالت پر کچھ ایسا ترس آ گیا کہ اس نے فوری کرایہ دار کو تخلیق کیا۔ جب سے اب تک تمہارا اور میرا ازلی رشتہ قائم ہے اور مجھے یقین ہے کہ خدائی اور سرکار کے باہمی تعاون اور اشتراک سے یہ رشتہ ابد تک قائم رہے گا۔

خدا کے پیارے!

میں آج آٹھ سال سے تمہارے مکان میں رہ رہا ہوں۔ میں

نے کرایے کی شکل میں مکان کی آدھی سے زیادہ قیمت ادا کردی ہے۔
اگر تم نے مجھے مزید چھ سات سال تک اس میں رہنے دیا، تو مجھے یقین ہے کہ میں مکان کی پوری قیمت دوں گا۔ لیکن اس کے باوجود تم اس مکان کے مالک رہو گے اور جب کبھی کوئی مجبور انسان تمہیں دس روپے زیادہ دے کر تمہاری حرص کی آگ کو بھڑکا دے گا، تم کسی نہ کسی بہانے مجھے یہاں سے باہر نکالنے کی ترکیبیں ڈھونڈو گے۔ پچھلے تین سال میں تم نے کئی بار مجھے اس مکان کو چھوڑ کر چلے جانے کی ترغیبیں دیں۔ تم نے کئی بار یہ جھوٹ بھی بولا کہ تم اس مکان میں خود رہنا چاہتے ہو۔ تم نے ایک مرتبہ یہ بھی کہا تھا کہ تم یہ مکان اپنی لڑکی کو جہیز میں دینا چاہتے ہو۔ تم نے ایک دفعہ یہ دھمکی بھی دی تھی کہ تم یہ مکان بیچ رہے ہو لیکن ہر بار جب میں نے کرائے میں دس روپے اضافے کی پیشکش کر دی تو تم نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ تمہیں میری مجبوریوں کا احساس ہے۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ اپنی موجودہ آمدن کے مطابق میں تمام عمر مکان نہ بنا پاؤں گا۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ شہر میں مکانوں کی قلت ہے اور تلاش بسیار کے باوجود بھی مجھے قابل رہائش مکان نہ ملے گا۔ اسی لئے تم بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ مجھے اپنا مکان بنانے کا قیمتی مشورہ مفت دیتے رہتے ہو۔ بہتر مکان تلاش کرنے کی نصیحت کرتے رہتے ہو اور جب ہر طرح سے تمہیں اس بات کا اطمینان ہو جاتا ہے کہ میرے لئے فرار کی کوئی گنجائش نہیں تو تم کرایے میں اضافہ کا مطالبہ کرتے ہو۔

میری مجبوریوں پر زندہ رہنے والے دوست!

تمہارے مکان کی ایک ایک دیوار پر میری مجبوریوں کی داستان

رقم ہے اس کی ایک ایک اینٹ پر میرے افلاس اور میری بے چارگی کی حکایت کندہ ہے۔ اس کے طاقچوں پر پڑی ہوئی گرد کی تہوں میں میرے نہ معلوم کتنے راز پوشیدہ ہوں گے۔ اس کے صحن میں بکھرے ہوئے کاغذ کے پُرزوں پر میری کتنی ہی کہانیوں کے کردار دم توڑ رہے ہیں۔ مہینے کی ہر دوسری تاریخ کو جب تم اگلے مہینے کا پیشگی کرایہ وصول کر کے چلے جاتے ہو، تو صحن کی دیوار پر اگا ہوا سبزہ مرجھایا ہوا نظر آتا ہے، جیسے مجھ سے مایوس ہوکر ہمت ہار بیٹھا ہو۔ آٹھ سال کا عرصہ مکان اور مکین کے تعلق کے لئے بہت ہوتا ہے۔ تمہارے مکان کی ایک ایک اینٹ سے مجھے وہ انسیت اور لگاؤ پیدا ہو گیا ہے کہ جیسے یہ میرا اپنا مکان ہو۔ یہاں کی ہر چیز میری ہے۔ صحن کے بڑے دروازے پر لگا ہوا بجلی کا لیمپ، دالان میں پڑی ہوئی ٹوٹی کرسیاں، باورچی خانے کی بڑی سی میز، سونے کے کمرے میں پڑی ہوئی دو مسہریاں اور باغ میں گملوں میں لگے ہوئے وہ خوش نما، پھول، یہ سب کچھ میرا ہے۔ لیکن مہینے کی ہر دوسری تاریخ کو جب تم اپنا کرایہ وصول کرنے آتے ہو، تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہاں کی کوئی چیز میری اپنی نہیں، ہر چیز پر صرف تمہارا ہی حق ہے۔ یہ لیمپ، یہ کرسیاں ، یہ میز، یہ مسہریاں اور یہ گملے سب تمہارے ہیں اور تم جب چاہو مجھے ان چیزوں سے محروم کر سکتے ہو۔

میرے دوست!

یہ مکان جو تمہارے لئے صرف ماہوار آمدنی کا ایک ذریعہ ہے، میرے لئے ایک ساتھی، ہمدم، رفیق اور مشفق دوست کا درجہ رکھتا ہے۔ تم مکانوں کے مالک کبھی یہ بھی سوچتے ہو کہ ہم کرایہ دار ایک بانجھ عورت کی

طرح دوسرے کے بچوں سے بھی محبت کرنے لگتے ہیں۔ تمہارے مکانوں سے بھی ہمیں انسیت ہو جاتی ہے اور جب تم پانچ پانچ ، دس دس روپیوں کی خاطر ہم سے مکان خالی کرنے کو کہتے ہو، تو ہم پر کیا گذرتی ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ تمہاری خوش بختی نے تمہیں مکان کا مالک اور ہمیں اس کا کرایہ دار بنا دیا ہے۔ لیکن کیا تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی مکانوں کی مالک نہیں بلکہ کرایہ دار ہے۔ کیا تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ اگر دنیا بھر کے کرایہ دار متحد ہو کر ان مکانوں پر قابض ہو جائیں جن کا کرایہ ادا کرتے کرتے وہ ان کی قیمتیں تک چکا چکے ہیں، تو تمہارا حشر کیا ہوگا!

مالک مکان صاحب!

مستقبل قریب میں یہی کچھ ہونے والا ہے۔ جسے آپ اپنی خوش بختی سمجھتے ہیں، وہ تاریخ کا ایک حادثہ تھا۔ زمانہ ایک بہت بڑی کروٹ لے رہا ہے۔ آنے والے نظام میں ہر انسان کو اس کی ضرورت اور محنت کے مطابق سہولتیں بہم ہوں گی۔ آپ کو اس کی اجازت نہیں ہوگی کہ آپ چار چار مکانوں کے مالک بنے پھریں اور ہم ایک ایک کمرے کے لئے ترسا کریں۔ بے انصافی، عدم مساوات اور بے رحمی کا یہ دور ختم ہونے والا ہے۔ آپ کا یہ مکان جو آپ کی ضرورت سے زائد ہے ایک ایسے انسان کی ملکیت ہوگا جس کے پاس رہنے کو مکان نہیں۔

اپنے آپ کو اس آنے والے دور کے خیر مقدم کے لئے تیار کیجئے۔

فقط آپ کا

چراغ بیگ

✿✿✿

۳۰ اگست ۱۹۶۵ء

چور بازاریوں کے نام

پیارے چور بازاریو!

آج کل تمہارا حال پوچھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی ہے۔ تمہاری تو ان دنوں پانچوں گھی میں ہیں اور سر کڑاہی میں۔ ہاں تمہاری ''خیریت'' کی وجہ سے اپنی جان پر بن آئی ہے۔ خدا کرے کہ تمہاری ''چار دن کی چاندنی'' پر جلد از جلد اندھیرا چھا جائے، تاکہ ہمارے گھروں کو بھی روشنی کی ایک کرن نصیب ہو۔ سنا ہے کہ پچھلے بیس بائیس دن میں تم نے اپنے صحنوں میں بکھری ہوئی مٹی کو بھی سونا بنا دیا ہے۔ ملک کی عزت و آبرو کو دشمنوں کی دستبرد سے بچانے کے لئے اسے اپنے ہاتھوں سے لوٹا ہے۔ حملہ آوروں کے حوصلے پست کرنے کے لئے اپنے گھروں میں گھی کے چراغ جلائے۔ مصیبت کے وقت میں اپنے بھائی بندوں سے ان کے خون کا آخری قطرہ نچوڑ کر انہیں ہر آنے والی آفت سے محفوظ کر دیا۔ اپنی نمک حلالی کا ثبوت دینے کے لئے بازار سے نمک ہی غائب کر دیا۔ اناج کے ذخیروں کو دشمن کے ہاتھوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اسے اپنے گوداموں کے تہہ خانوں میں چھپا دیا۔ چائے، کھانڈ، تیل اور ضروریات زندگی کی قیمتوں میں صرف اس لئے اضافہ کیا کہ دشمن کی قوت خرید اس کی متحمل ہی نہ ہو اور اس طرح وطنِ عزیز کو غیر کے سایے سے ''محفوظ'' رکھنے کے لئے تم نے وہ ہر کام کیا جو تمہارے آباو اجداد سالہا سال سے کرتے آئے ہیں۔

کفن چورو! بتا سکتے ہو کہ تمہارا ضمیر کس خمیر سے اور تمہارا وجود کس مٹی سے بنا ہے۔ تمہارے سینے میں دل رکھتے وقت تمہارے خالق نے غلطی سے وہاں کونسا پتھر رکھ دیا ہے۔ تمہاری رُوح کو سیاہ کرنے میں کونسی ایسی سیاہی استعمال ہوئی ہے کہ انسانیت، شرافت اور اخلاق کی کوئی لانڈری اسے صاف نہیں کرسکتی۔ تم نے کسی ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہے یا کسی ڈائن کے بطن سے پیدا ہوئے ہو؟ تم نے بچپن میں اپنی ماں کی چھاتیوں سے دودھ پیا ہے یا کسی کلموہی کا خون؟ تم نے کسی گھر میں پرورش پائی ہے یا کسی ایسے کوٹھے پر جہاں مسکراہٹیں بکتی ہیں؟ تمہاری لغت میں انسانیت، انصاف، حمیت، مروت اور رحم نام کا کوئی لفظ پایا جاتا ہے یا نہیں؟ تمہیں اپنے وجود کی غایت اور اپنی عاقبت کا کچھ اندازہ ہے؟ لاشوں سے کفن چُرا کر بیچتے ہوئے تمہارے ہاتھوں میں لرزش کا احساس ہوتا ہے یا نہیں؟۔

ہمارے سماج کے رِستے ہوئے ناسورو! میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس ان سوالات کا جواب دینے کی فرصت ہی نہ ہوگی کیونکہ تمہارا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے جتنا وقت تم ان کا جواب دینے میں صرف کرو گے، اتنے وقت میں تم کسی ننگے وجود سے اس کے پیرہن کا آخری تار چھین سکتے ہو، کسی بے خون جسم سے اس کے خون کا آخری قطرہ نچوڑ سکتے ہو، کسی غریب کے خون پسینے سے کمائی ہوئی دولت کو اپنی تجوریوں میں منتقل کر سکتے ہو، کسی گھر کا ٹمٹاتا ہوا چراغ بجھا سکتے ہو، کسی دفن شدہ لاش سے اس کا کفن چُرا کر اسے اپنی دکان پر سجا سکتے ہو۔ کسی محکوم اور مجبور کے منہ سے اس کا نوالہ چھین کر اپنے شکم کا تنور گرم کر سکتے ہو۔ پھر تم کیونکر ان غیر متعلق سوالات کا جواب دینے لگو۔

زخموں کے سوداگرو! تمہاری زندگی کا ایک ایک لمحہ کسی بلائے ناگہانی

کے انتظار میں گزرتا ہے۔ تمہاری عبادت کا مرکز بھوک، قحط، بیماری، جنگ اور بے چینی ہے اور جب قدرت تمہیں ہر طرح سے مایوس کر دیتی ہے تو تم خدائی اپنے ہاتھ میں لے کر ایک مصنوعی بحران پیدا کر دیتے ہو۔ بادل کی ایک گرج کے ساتھ ہمارے بازاروں سے نمک، مٹی کا تیل، کھانے کا تیل، شکر اور بچوں کا دودھ غائب ہو جاتا ہے۔ ایک دن راستہ بند ہو، تمہارے گھروں میں گھی کے چراغ جلائے جاتے ہیں اور اس گھی کا خرچہ وصول کرنے کے لئے تم ضروریات زندگی کی قیمتوں میں دس گناہ اضافے کرتے ہو، اور جب بانہال کا منحوس راستہ مسلسل کچھ دنوں کے لئے بند ہو جاتا ہے تو تم وہ قیامت ڈھاتے ہو کہ خدا کی پناہ! ابھی پچھلے دنوں جب پاکستانی حملہ آوروں کی شرانگیزیوں کی وجہ سے ریاست میں ایک ہنگامی کیفیت سی پیدا ہوگئی تو ہماری فوجوں سے بھی پہلے تم نے اپنے مورچے سنبھال لئے۔ ۱۹۴۷ء کے تجربات کی روشنی میں تم نے سب سے پہلے نمک، اس کے بعد شکر، تیل اور ضروریات زندگی کی دوسری چیزیں غائب کر دیں تمہارا خیال تھا کہ اپنی تجوریوں کو وسعت دینے کے لئے شاید اس سے بہتر موقع ہاتھ نہ آئے اور یہ اندازہ کچھ غلط بھی نہ تھا۔ اگرچہ صورتحال نے تمہاری توقعات کے ساتھ پورا انصاف نہیں کیا لیکن پھر بھی کوئی ناانصافی نہیں کی ہے۔ تم جونک کی طرح ہمارے وجود سے چمٹ کر ہمارا خون پی رہے ہو۔ تجارت اور کاروبار کو موجودہ صورتحال سے جو دھچکا لگا ہے اس سے ریاست کے سبھی طبقے پریشان ہیں۔ صرف تم اپنی قسمت پر نازاں نظر آتے ہو، تمہاری تجارت اور تمہارا کاروبار ایسی ہی آب وہوا میں فروغ پاتا ہے۔ جب بھی ملک کی سالمیت اور ہم وطنوں کی سلامتی کو خطرہ لاحق رہا ہے، تہاری 'دکانداری' چمک

اٹھی ہے۔ جب بھی انسانیت بھوک یا قحط کے نرغے میں پھنسی ہے، تمہاری تجارت نے ایک نئی عمارت کھڑی کر دی ہے۔ تم نے ہر جنگ میں دشمن کا ساتھ دیا ہے لیکن اس کے باوجود تم ڈی، آئی، آر کی زد سے محفوظ رہے ہو۔ تم نے ہر حکومت کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں، لیکن اس کے باوجود تم ہر حکومت کے محبوب ہو۔ تم نے ہر سماج میں عفونت اور سڑاند پھیلا دی ہے لیکن اس کے باوجود ہر جگہ تمہاری عزت ہے۔ تم کھلے بندوں لوگوں کی جیبیں کاٹتے پھرتے ہو لیکن شہر کی پولیس تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تم چاہو تو شہر کی پولیس کا بہت کچھ بگاڑ سکتے ہو۔ تم بھرے بازار میں ڈاکہ ڈالتے ہو اور قانون تمہاری حفاظت کرتا ہے۔ تمہارے گوداموں اور ذخائر میں ہر وہ چیز محفوظ ہے جس کو ایک نظر دیکھنے کے لئے ملک کے لاکھوں لوگ تڑپ رہے ہیں۔ زندگی، روشنی اور عزت کے سوداگرو! تم بے فکر رہو یہ سماج تمہاری اپنی تخلیق ہے جب تک یہ سماج زندہ ہے تم بھی زندہ ہو اور اس سماج کو زندہ رکھنے کے لئے تم نے جو کرایے کے سپاہی ملازم رکھ لئے ہیں، وہ تمہارے مفادات کے لئے بڑی بے جگری سے لڑ رہے ہیں۔

میرے چراغ کا تیل ختم ہو رہا ہے اور اسی لئے یہیں پر بس کرتا ہوں۔ چراغ بیگ کے چراغ میں بھی تیل نہیں۔ تمہیں اپنی فتح و نصرت کا جشن منانا چاہئے۔

فقط تمہارا

چراغ بیگ

۳۰ نومبر ۱۹۶۵ء

سید میر قاسم کے نام

محترم قاسم صاحب!

مزاج شریف کی اتنی ہمت نہیں ہے کہ خراب ہو سکے۔ اس لئے یقیناً ٹھیک ہی ہوں گے۔ آپ کے نام یہ کھلی چھٹی لکھنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آپ کی غیر معمولی مصروفیات کے پیش نظر آپ سے ملنا دشوار سے دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ عرضی نیازاں اور درخواست دہندگاں کی ایک بہت بڑی تعداد سے روز ملتے ہیں۔ لیکن چراغ بیگ کو نہ نوکری کا مسئلہ درپیش ہے اور نہ ٹین کی چادریں حاصل کرنے کے لئے سفارش کی ضرورت، اس لئے نہ وہ عرضی نیاز ہو سکتا ہے اور نہ آپ کا تابعدار.... اور یہی وجہ ہے کہ آپ اِسے نیازمندوں کے اس ہجوم میں نہیں دیکھتے جو صبح سے شام تک آپ کی رہائش گاہ اور دفتر کا طواف کرتا رہتا ہے۔ مناسب یہ تھا کہ میں اس لمحے کا منتظر رہتا کہ آپ امور مملکت سے فارغ ہو کر میری جانب متوجہ ہوتے، اور میں آپ سے وہ سب کچھ بیان کرتا جو آج اس کھلی چھٹی کا موضوع ہے لیکن پھر اس خیال سے کہ مصروفیات کم ہونے کی بجائے روز بروز بڑھتی جا

رہی ہیں اور تاریخ کا کارواں کسی کا انتظار کئے بغیر اپنی منزل کی طرف بڑھتا جا رہا ہے، آپ کے نام یہ خط لکھنے کا ارادہ کیا۔ آپ سے یوں مخاطب ہونے کی عجلت اس لئے بھی تھی کہ آپ بڑی برق رفتاری اور مستعدی کے ساتھ اپنے پیش رو کے راستے پر گامزن ہو رہے ہیں اور اگر خدانخواستہ پیش قدمی کی یہی رفتار رہی تو کچھ دنوں کے بعد چراغ بیگ میں آپ سے یوں مخاطب ہونے کی ہمت ہی نہیں ہوگی! آپ کی شرافت، دیانت، دریا دلی، رواداری اور سیاسی بصیرت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کا اس سے بہتر موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا۔

وزیر بے قلمدان! چراغ بیگ جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ اس سے مختلف ہے جو آپ کے عقیدت مند، (جن میں یہ ناچیز بھی شامل ہے) آپ کے مصاحب، آپ کے دوست اور آپ سے اپنی مرادیں پانے والے عوام کہتے آئے ہیں۔ پچھلے چند مہینوں میں آپ کی مدح میں اتنا کچھ کہا گیا ہے کہ اگر آپ ''خوگر حمد'' ہو گئے ہوں تو مجھے کوئی حیرت نہ ہوگی۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ شاید کسی وقت مسلسل مدح خوانی سے آپ کی طبعیت بھی بھر جاتی ہو، ''یہ تھوڑا سا گلہ'' آپ کی خدمت میں بصد عقیدت وخلوص پیش کرتا ہوں ۔

گر قبول افتدز ہے عزو شرف

قاسم صاحب! یہیں اسی دفتر میں جہاں آپ دن میں ہزاروں درخواستوں پر اپنا آٹو گراف ثبت کرتے ہیں، آج سے صرف چند سال پہلے بخشی غلام محمد نامی ایک شخص بیٹھا کرتا تھا۔ آپ ہی کی کرسی پر بیٹھکر اس شخص نے بھی ہزاروں نہیں، لاکھوں درخواستوں پر اپنے دشتخط ثبت

کیئے ہیں۔ وہ چونکہ آپ سے بڑا داتا اور آپ سے بڑا بادشاہ تھا، اس لئے اس کے دربار میں لوگ بھی زیادہ آتے تھے۔ یہیں اسی کمرے میں بیٹھ کر وہ اپنی سلطنت کے استحکام کے منصوبے بناتا، اپنے دشمنوں کے خلاف تازہ حملوں کی تیاری کرتا اور اپنی دائمی سلطانی کے خواب دیکھتا۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ اس کے بعد اس کے آل اولاد اس مملکت پر حکومت کریں گے، یہیں اسی ماحول میں مصاحب، خوشامدی اور چاپلوس اس کی ہرادا کی داد دے کر اسے یہ یقین دلاتے تھے کہ وہ وقت کا افلاطون، اس دور کا سقراط اور ناقابل تسخیر ہے۔ آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ تاریخ کی ایک ہی کروٹ نے اس کی سلطنت اور اس کے خوابوں کی پوری کائنات کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ آج اسی عمارت، اسی کمرے اور اسی کرسی پر بیٹھ کر آپ بھی یہ بھول گئے ہیں کہ اقتدار عارضی شے ہے اور یہ ایک تاریخی حادثے کے طور پر آپ کے ہاتھوں میں آگیا ہے۔ آپ خوابوں کے اسی ملبے پر اپنی دنیا تعمیر کر رہے ہیں، جس میں بخشی صاحب کی سلطانی کے دھاگے بکھرے پڑے ہیں۔ یہ اقتدار کیسی عجیب وغریب شے ہے کہ انسان سے اس کا حافظہ، اس کا شعور اور اس کی نظر چھین لیتا ہے۔ آپ کی دانشمندی، حقیقت پسندی اور تجزیاتی قوت جیسے یک لخت مفلوج ہو کر رہ گئی ہو۔ اس کرسی پر بیٹھ کر معلوم نہیں ہر آدمی اپنے آپ کو افلاطون اور سقراط کیوں سمجھنے لگتا ہے۔ اگر مقصد صرف حکومت کرنا ہے اور کسی طور پر اپنی کرسیوں پر جمے رہنا ہے تو پھر آپ سے پہلے بھی آپ سے کم قابلیت اور ذہانت والے لوگ اس بوجھ کو اٹھائے ہوئے تھے اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ سے

بہتر طریقے پر اٹھائے ہوئے تھے۔ لیکن میرے نزدیک اور اگر آپ کو
بھی اپنا قول وقرار یاد ہو، تو آپ کے نزدیک بھی حکومت نہ مقصد ہے
اور نہ منزل ، یہ مقاصد کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہے اور میں یہ جاننا چاہوں
گا کہ وہ مقاصد کیا ہیں جن کے حصول اور تکمیل کے لئے آپ اپنے
نازک کندھوں پر حکومت کا بارگراں اٹھائے ہوئے ہیں۔ میں نے آپ
کی حکومت، آپ کی تنظیم، آپ کے بیانات اور آپ کے ارشادات کی
روشنی میں ان مقاصد کی تلاش کی تو مجھے ان کی پرچھائیں بھی نظر نہیں
آئیں۔ اگر یہ مقاصد اتنے پر اسرار اور مابعد الطبعیاتی نہیں ہیں کہ چراغ
بیگ کی نظر لگنے سے ہی موم کی طرح پگھل جائیں گے، تو میں چاہوں
گا کہ آپ تنظیم کے Lockers سے نکل کر انہیں کچھ دنوں کے لئے
دھوپ میں ڈال دیں تا کہ میری بصارت کو بصیرت حاصل ہو۔ میں جانتا
ہوں کہ آپ کا فیصلہ یہ ہے کہ میں ذہنی انتشار کا شکار ہوں اور سیاسی
بصیرت سے محروم.... لیکن فیصلے دینے سے مسائل حل نہیں ہوتے.....
میرے ذہنی انتشار کو دور کیجئے اور اپنا نور بصیرت عام کیجئے۔ مجھے یہ
بتایئے کہ آپ کی حکومت بخشی غلام محمد کی حکومت اور بخشی عبدالرشید کی
حکومت سے مختلف کیوں کر ہے؟ مجھے یہ بتایئے کہ اقتدار سنبھالتے وقت
آپ نے یہاں کے عوام کو جو سبز باغ دکھائے تھے، وہ کہاں گئے؟ مجھے
یہ بتایئے کہ وہ لوگ جنہوں نے دیانتداری اور خلوص سے آپ کے
برسر اقتدار آنے کا خیر مقدم کیا تھا، آج آپ سے مایوس کیوں ہیں؟
مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کیجئے کہ آپ نے ہندوستان اور کشمیر کے
سمبندھ کو پہلے سے کیوں کر مضبوط بنا دیا ہے؟ میری معلومات میں یہ

اضافہ کیجئے کہ آپ نے پچھلے دو سال میں سیکولرازم اور جمہوریت کے اصولوں کی ترویج واشاعت کے لئے کیا کام کیا ہے؟ مجھے اعتماد میں لیکر یہ بتایئے کہ آپ کی حکومت بخشی غلام محمد کی حکومت کے مقابلے میں کس اعتبار سے زیادہ مہذب، جمہوری اور پسندیدہ ہے؟ ان لوگوں کی تعداد کیا ہے جو پہلے پاکستانی یا جن سنگھی تھے لیکن آپ کے برسراقتدار آنے کے بعد ہندوستانی ہو گئے ہیں؟ کشمیر کو ہندوستان کا اٹوٹ انگ آپ بھی کہتے ہیں، میں بھی کہتا ہوں اور جن سنگھ کے بلراج مدھوک بھی کہتے ہیں مجھے یہ سمجھایئے کہ مجھ میں اور بلراج مدھوک میں کونسی حد فاصل ہے اور آپ کو اس سے کونسی چیز مختلف اور متضاد بناتی ہے؟ یہ ایک سوال ہے اور اگر آپ نے، آپ کی تنظیم نے اور میں نے اس سوال کا جواب ابھی اور اسی وقت نہیں دیا تو چند سال کے بعد ہم پر یہ عقدہ کھل جائیگا کہ ہم کشمیر میں دراصل بلراج مدھوک کی لڑائی لڑ رہے تھے۔

ظلِ سبحانی! یہ سوالات وہ ہیں جو آپ کے کارکنوں نے آپ سے کبھی نہیں پوچھے ہیں۔ یہ مسائل وہ ہیں جن پر توجہ دینے کے لئے آپ کے پاس وقت نہیں ہے۔ لیکن یہ سوالات اور یہ مسائل بہت اہم ہیں۔ اگر آپ اپنے دل کو اور اپنے کارکنوں کو یہ کہہ کر مطمئن کئے ہوئے ہیں کہ آپ ہندوستان اور کشمیر کے تعلق کو مضبوط بنا رہے ہیں تو میں آپ کو یہ بتانا چاہوں گا کہ یہ کام آپ کے بغیر بھی ہو سکتا ہے اور ہوا ہے۔ ابھی حال ہی میں ہماری فوجوں نے پاکستان ہی کو نہیں ساری دنیا کو یہ بتا دیا ہے کہ کشمیر ہندوستان کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔ اگر اقتدار کی کرسیوں کے ساتھ وابستہ رہنے سے ہند کشمیر الحاق مضبوط ہو سکتا تو آج

بخشی صاحب کی کرسی پر آپ رونق افروز نہ ہوتے ہند کشمیر الحاق ایک
نظریاتی تصور ہے جب تک آپ اسے سیاسی نعرے کی بجائے ایک
نظریاتی تصادم کی شکل نہ دیں، آپ کی اہمیت اور افادیت مشکوک رہے
گی۔ میں کانگریس کا ممبر نہیں ہوں لیکن کانگریس کے سیاسی اور اقتصادی
پروگرام سے مجھے گہری دلچسپی ہے۔ کانگریس چیف ہونے کی حیثیت سے
یہ آپ کا فرض تھا کہ آپ کانگریس کے اقتصادی اور معاشی نظام کو عوام
سے روشناس کراتے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ریاست میں
بالخصوص اور وادی کشمیر میں بالعموم بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ
اقتصادی، معاشی اور سیاسی سطح پر کانگریس کا کیا پروگرام ہے۔ آپ کی
تنظیم کے اکثر عہدے داروں کو بھی غالباً اس پروگرام کے متعلق زیادہ
واقفیت نہیں۔ لوگوں کو زیادہ دیر تک نعروں اور تقریروں میں الجھائے
نہیں رکھا جا سکتا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس پروگرام کو
چلانے اور اس کو کامیاب بنانے کے لئے آپ کو یہاں ایک مہذب
جمعیت تیار کرنا پڑے گی۔ یہاں کے لوگوں کا اشتراک حاصل کرنا پڑے
گا، مرکزی حکومت کی خوشنودی اور اس کا تعاون بہت اچھی بات ہے
لیکن اس خوشنودی اور تعاون کے سہارے ہی زندہ رہنا ممکن نہیں۔ جب
تک ریاست کے باشعور لوگوں کی حمایت آپ کو حاصل نہ ہو، دہلی میں
آپ کی قدر و قیمت نہیں بڑھ سکتی اور گذشتہ دو چار مہینوں سے مجھے ایسا
لگ رہا ہے کہ آپ ریاستی عوام اور یہاں کے باشعور لوگوں کی حمایت،
اشتراک اور تعاون سے بھی بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں۔

برادر محترم! یہ خط شائع ہوتے ہی آپ کے 'وفادار' آپ کی

خدمت میں پہنچ کر چراغ بیگ کو گالیاں دیں گے، آپ کو اپنی 'وفاداری' اور میری 'غداری' کا یقین دلانے کی کوشش کرینگے۔ میرے کچھ ہم عصر طول طویل مقالات شائع کریں گے جن میں میری خوب خبر لی جائے گی اور پھر یہ مقالات آپ کی خدمت میں اپنی خدمات کے طور پر پیش کئے جائیں گے۔ آپ کے کارکن اور آپ کے عقیدت مند میری اس گستاخی کے لئے میرے لئے سزا تجویز کریں گے۔ مجھے ان تمام ہنگامہ آرائیوں سے کوئی پریشانی نہیں۔ میں نتائج سے بے پرواہ ہو کر وہ سب کچھ کہہ جاتا ہوں جو لوگ سرگوشیوں میں کہتے ہیں لیکن میری ایک گزارش ہے وہ یہ ہے کہ چراغ بیگ کو بُرا بھلا کہنے والوں کے چہروں پر ایک بھرپور نگاہ ڈالئے، ایک لمحے کے لئے ان کے سیاسی کردار، ان کی ذہنی سطح اور ان کے عزائم کا جائزہ لیجئے اور یہ فیصلہ کیجئے کہ انہیں آپ کی خدمت میں آپ کی محبت لائی ہے یا میرا بغض۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میرا یہ خط دوبارہ پڑھئے۔

فقط آپ کا صادق

چراغ بیگ

۲۶ جون ۱۹۶۷ء

شیخ صاحب کے نام

محترم شیخ صاحب!

میں خیریت سے نہیں ہوں لیکن پھر بھی آپ کی خیریت کا طالب ہوں اخبارات کے ذریعہ معلوم ہوا کہ آپ کی صحت ناساز ہے اور آپ کو طبی معائنے کے لئے دہلی کے آل انڈیا میڈیکل انسٹی چیوٹ میں داخل کردیا گیا ہے۔ خدا کرے آپ جلد از جلد روبہ صحت ہو جائیں کہ کشمیر میں آپ کی صحت کے متعلق گہری تشویش اور اضطراب کا اظہار کیا جارہا ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ آپ کو دلی لانے کا مقصد آپ کی جسمانی صحت کا معائنہ کرنا ہے یا آپ کی ذہنی صحت کا اندازہ کرنا، لیکن ایک بات طے ہے کہ آپ کی ذات ایک بار پھر ملک کے اعلیٰ ترین ایوانوں میں بحث اور غور وفکر کا موضوع بنی ہوئی ہے اور تعجب نہیں کہ خرابی صحت کے پیش نظر آپ کو عنقریب رہا کردیا جائے۔ حالانکہ اس ''حادثے'' کی روک تھام کے لئے کچھ مفادات خصوصی ایڑی کا زور لگائے ہوئے ہیں۔ بہرکیف، میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ آپ کی رہائی کو کچھ دیر کے لئے ٹالا جاسکتا ہے، زیادہ دیر تک روکا نہیں جاسکتا۔ واقعات کی منطق اور حالات کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کو غیر مشروط طور پر رہا کردیا جائے اور اگر ہندوستانی رہنماؤں میں دور اندیشی، تدبر اور حکمت عملی کا مکمل فقدان نہیں، تو مستقبل قریب میں آپ کی رہائی یقینی ہے۔ ویسے بھی کوڑے

کنال کے مقابلے میں دہلی سرینگر سے زیادہ قریب ہے اور ہوسکتا ہے کہ یہ قربت بامعنی مفاہمت کا پیش لفظ ثابت ہوجائے۔

عزت مآب شیخ صاحب! نظر بندی اور رہائی کا یہ ڈراما آپ کے لیئے یقیناً کوئی نئی بات نہیں۔ گذشتہ چودہ برسوں میں آپ تین بار رہا ہو کر تین بار پھر نظر بند کر دیئے گئے اور آج جب ایک بار پھر آپ کی رہائی کا چرچا سننے میں آرہا ہے، تو بہت سے ذہنوں میں دوبارہ گرفتاری کے اندیشے بھی جنم لے رہے ہیں۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ آپ کی رہائی میں اگر حکمرانوں کو کچھ مشکلات اور مجبوریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، تو خود آپ کے لئے بھی یہ مسئلہ کچھ کم مشکل اور پیچیدہ نہیں ہے کیونکہ زنداں کے عافیت خانے میں اکثر ان تلخ اور سنگین حقائق کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، جو زنداں سے باہر آتے ہی انسان کا دامن تھام لیتے ہیں اور جن سے نپٹنے کے لئے عقیدے کی پختگی ہی نہیں، نظر کی بلندی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ رہا ہوں گے تو ایک بار پھر آپ کا شایانِ شان استقبال ہوگا۔ ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں آپ کے عقیدت مند آپ کی راہ میں آنکھیں بچھائیں گے۔ آگیا جی آگیا کے نعرے بلند کریں گے اور آپ پر پھولوں کی بارش ہوگی۔ یہ سب کچھ کئی بار ہوا ہے اب کی بار پھر ہوگا اور شاید پہلے سے زیادہ ہو۔ لیکن یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد کیا ہوگا؟ یہ ایک سوال ہے، جو میرے ذہن میں اُبھر رہا ہے اور ہوسکتا ہے کہ بہت سے ذہنوں میں ابھر رہا ہوگا، اسکا بھی امکان ہے کہ آپ بھی اس سوال پر غور کر رہے ہوں کیونکہ اس سوال پر کشمیر ہی نہیں ہندوستان اور پاکستان کی آئندہ تاریخ کا بھی دارومدار ہوگا۔ آپ

مجھ سے اتفاق کریں گے کہ آپ کی رہائی کا مقصد صرف عظیم الشان جلوسوں اور فقید المثال جلسوں کی رونق بڑھانا ہی نہیں، کچھ اہم اور پیچیدہ مسائل کا حل ڈھونڈنا ہے۔ یہ مسائل ہم سب کے مشترکہ مسائل ہیں اور ان پر جلسوں کی ہنگامہ آرائی اور جلوسوں کی ہماہمی میں یقیناً نہیں سوچا جاسکتا، میں مانتا ہوں کہ آپ ہماری تاریخ کے سب سے اہم اور مرکزی کردار ہیں اور آپکی ذات سے ہماری جدوجہد آزادی کا سب سے عہد آفریں دور وابستہ ہے۔ اسلئے آپ کو اپنی بات کہنے اور اسے منوانے کا پورا پورا حق حاصل ہے، لیکن کیا یہ ممکن نہیں ہوسکتا کہ آپ دوسروں کی بات بھی سنیں اور اگر ممکن ہوتو اس پر غور کرنے کی زحمت بھی گوارا کریں؟ آپ کی دیانت اور آپ کا خلوص شک وشبہ سے بالاتر ہے لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ آپ سے اختلاف کرنے والا ہر انسان بددیانت اور بدنیت ہو۔ ہم لوگوں نے ابھی تک اختلاف کرنے کا سلیقہ بھی نہیں سیکھا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ جو آدمی ہمارے نکتہ نظر سے اختلاف رکھے، وہ صرف ہمارا دشمن ہوسکتا ہے۔ کشمیر آپ کا بھی وطن ہے اور میرا بھی.... آپ نے اسکی آزادی، عزت اور وقار کے لئے اپنی زندگی صرف کر دی۔ میں اسکی آزادی، عزت اور وقار کے لئے اپنا سب کچھ لٹا دینے کے لئے تیار ہوں، پھر آپ کے اور میرے درمیان اتنے طویل فاصلے کیوں ہیں؟ ہم ایک مقصد کے لئے لڑنے کے باوجود ایک دوسرے کی مخالف سمت میں کیوں جا رہے ہیں؟ اپنی رہائی سے قبل ان مسائل پر ضرور سوچیئے، کہ ان کا تعلق صرف آپ ہی کے مستقبل سے نہیں کشمیر کے مستقبل سے بھی ہے۔ سیاسی مسائل اور تاریخی پیچیدگیوں کے متعلق

سوچتے وقت انسان کو اپنی ذات سے بلند ہو کر پوری کائنات کا احاطہ کر لینا چاہئے اور گر آپ بُرا نہ مانیں تو میں یہ کہوں گا کہ آپ نے ہمیشہ اس جدلیاتی مفروضے کا احترام نہیں کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کشمیر کی ساری سیاست ایک نظریے کی بجائے چند شخصیات کے گرداب میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ خیر رہنے دیجئے یہ تو ماضی کا افسانہ ہے۔ میری نگاہیں اس وقت اس مستقبل کی طرف لگی ہوئی ہیں جو حال کی کوکھ سے جنم لے رہا ہے۔

شیخ صاحب! میں ان لوگوں میں سے ہوں، جو آپ کے سیاسی نظریات اور رجحانات کا بہت دور تک ساتھ نہیں دے سکتے لیکن اسکے باوجود مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ آپ کی ذات، آپ کا سیاسی رتبہ اور آپ کا انداز فکر سیاست حاضرہ کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور اس سے صرف وہی لوگ انکار کر سکتے ہیں، جو بصیرت اور بصارت دونوں ہی سے محروم ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس اہم اور فیصلہ کن مرحلے پر کشمیر کے عوام آپ کی رہنمائی اور قیادت سے محروم کر دئے جائیں اور اسی لئے میں نے بارہا آپ کی رہائی کے لئے آواز بلند کی ہے لیکن میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ آپ عوام کی رہنمائی کی بجائے عوام کو اپنا رہنما سمجھ کر وہی کچھ کہیں جو وہ آپ سے کہلوانا چاہیں۔ قائد کا کام جذبات کی رو میں بہنے کی بجائے جذبات کی تہذیب کرنا ہے اور ہماری قیادت نے ابھی تک یہی نہیں کیا ہے۔ مقبولِ عام اور جذباتی نعروں کی گونج سن کر ہجوم میں شریک ہونا ایک بات ہے اور ہجوم میں شامل ہونے کے بعد بھی اپنی انفرادیت قائم رکھنا دوسری بات ہے۔ میرا خیال

ہے کہ کشمیر کی موجودہ گتھی کو سلجھانے کے لئے نعروں کی گرمی سے زیادہ نظریات کی روشنی درکار ہے اور مجھے ذاتی طور پراس بات کا یقین ہے کہ اگر آپ ماضی کی تلخیوں کو بھول کر مستقبل کے امکانات کو نگاہ میں رکھیں تو کوئی ایسی صورت نکل آئے گی، جس سے ہماری عبرت ناک زندگی کا یہ اذیت ناک دور ختم ہو جائے۔ کیونکہ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ رفتہ رفتہ ہمارے ماضی کا سرمایہ بھی ختم ہونے لگا ہے۔ ہماری تہذیب، ہمارا تمدن، رواداری اور بھائی چارے کی روایات آج محض ایک افسانہ ہو کر رہ گئی ہیں اور ہم روز بروز آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹتے جا رہے ہیں۔ کشمیر کو اس مرحلے پر ایک جرأت مندانہ قیادت کی ضرورت ہے اور آپ چاہیں تو اس ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں۔ زندگی کا کیا بھروسہ، آج آپ ہم میں موجود ہیں، کل نہیں ہوں گے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ زنداں کے گوشۂ عافیت میں پناہ گزیں ہونے کی بجائے آپ زندگی کے کارِزار میں ہمارے دوش بدوش ناپسندیدہ حقیقتوں کا مقابلہ کریں۔ نئی نسل کو نئی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے تیار کریں اور بدلے ہوئے حالات کے پس منظر میں ہماری بدلی ہوئی کائنات کو سنوارنے میں ہماری مدد کریں۔ آپ کی نظر بندی کے دوران زندگی کا کارواں بہت دور جا چکا ہے۔ آپ اسکا ساتھ دینا چاہیں تو آپ کو اپنی رفتار تیز تر کرنا پڑے گی۔

فقط آپ کا صادق

چراغ بیگ

۵/ دسمبر ۱۹۶۷ء
کھلی چٹھی

اسٹنٹ انجینئر کے نام

پیارے، بہت پیارے اسسٹنٹ انجینئر

کل میڈیکل کالج کے موڑ پر جب میں کڑکتی دھوپ میں تانگے کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا تو میں نے آنے جانے والی موٹروں کا بغور مطالعہ شروع کر دیا۔ کاروں کی نمبر پلیٹس سے اندازہ یہ ہوا کہ پچھلے کئی برسوں سے شہر میں مکھیوں اور مچھروں کی طرح کاروں کی تعداد میں بھی خاصا اضافہ ہوا ہے اور تم جانتے ہو کہ اس دور میں لوگوں کی خوشحالی کا اندازہ ان کی قوت خرید سے کیا جاتا ہے اس لئے لمحے بھر کے لئے مطمئن ہو گیا کہ ہمارا شہر اب خوشحال ہو گیا ہے، یہاں کے لوگ اب آسودہ حال ہو گئے ہیں۔ پچھلے تین پانچ سالہ منصوبے اپنے معجزے دکھا کر رہ گئے ہیں میں اپنے شہر کی خوشحالی میں اپنی بدحالی بھی بھول گیا یہ بھی بھول گیا، کہ میں پنتالیس منٹ سے تانگے اور بس کے انتظار میں اسی موڑ پر کھڑا ہوں۔ پورا تانگہ لینے کے لئے جیب میں پیسے نہیں اور ایک سواری اُٹھا کر کوئی تانگہ امیرا کدل جانے کے لئے تیار نہیں اتنے میں دور سے ہلکے گلابی رنگ کی ایک خوبصورت سی کار آتی ہوئی دکھائی دی۔ کار کیا تھی کوئی دوشیزہ ہلکے گلابی رنگ کی ساڑھی پہنے عاشقوں کے دل کو چیرتی ہوئی گذر رہی تھی۔ کار میرے سامنے سے گزری، تو میں نے ڈرائیور کی سیٹ پر تمہیں دیکھا ساتھ ہی غالباً تمہارا کوئی دوست تھا، یا کوئی ٹھیکے دار یا ہو سکتا ہے کوئی اوَر سیر ہو تم کار چلاتے ہوئے بے حد حسین لگ

رہے تھے۔ تمہارے ہونٹوں پر ایک شوخ سی مسکراہٹ تھی۔ معلوم نہیں تم نے مجھے دیکھا یا نہیں، یا اگر دیکھ بھی لیا تو پہچانا بھی یا نہیں خدا کرے کہ تم نے مجھے نہ دیکھا ہو) اس کڑکتی دھوپ میں وہاں موڑ پر کھڑے دیکھ کر نہ معلوم تم میرے بارے میں کیا سوچتے، ہم پیدل چلنے والوں، تانگوں اور بسوں میں سفر کرنے والوں کو ہمیشہ اس بات کا خیال رہتا ہے کہ تم کاروں والے ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہو؟ ہاں تو میری نظروں نے بہت دور تک تمہارا، تمہاری کار کا تعاقب کیا تمہاری کار جب نظروں سے اوجھل ہوگئی تو مجھے پھر اپنی غربت، اپنی بد حالی اور مصیبت کا احساس ہو گیا۔ تمہیں اس خوبصورت کار میں دیکھ کر میرے دل میں حسد، نفرت اور بے اطمینانی کی آگ بھڑک اُٹھی۔ طالب علمی کا زمانہ یاد آیا، تمہاری طالب علمی کا زمانہ یاد آیا، اپنی بد قسمتی کا احساس شدید تر ہو گیا اور تمہاری خوش قسمتی کا احساس شدید تر ہو گیا اور تمہاری خوش قسمتی کا اعتراف کرنا پڑا۔

ننھے معمار! تمہیں یاد ہوگا کہ آج سے صرف چند سال پہلے ہم تم دونوں ہم جماعت تھے۔ تُم اپنی جماعت کے بہت ممتاز طالب علم نہ تھے۔ تمہیں اکثر اپنے اُستاد کی ڈانٹ سننا پڑتی تھی۔ میں اُستادوں کی نظروں میں چڑھا ہوا تھا وہ مجھے ذہین اور محنتی طالب علم سمجھ کر میری عزت کیا کرتے تھے۔ تم ان دنوں میری طرف رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ جوں توں امتحان پاس کر کے تم انجینئرنگ کے لئے چلے گئے۔ ہم دونوں ہی غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن ملک کو نوجوان انجینئروں کی ضرورت تھی، اس لئے تمہیں انجینئرنگ کیلئے سرکاری وظیفہ مل گیا۔ میں نے بی اے پاس کر کے ایک دفتر میں چھوٹی موٹی ملازمت کر لی۔ پھر تم ایک دن

انجینئر ہو کر آ گئے۔ تمہیں دو سو روپے کی نوکری مل گئی تم محکمۂ تعمیرات عامہ میں اسسٹنٹ انجینئر ہو گئے ۔ یہاں سے تمہاری اور میری زندگی کے دھارے مختلف سمتوں میں بہنے لگے۔ تمہاری زندگی بحر بیکراں بن گئی اور میری زندگی گھٹ کے جوئے کم آب رہ گئی ۔تم نے ترقی کے زینے اتنی تیز رفتاری کے ساتھ طے کیے کہ تمہاری رفتار دیکھ کر ہی میں ہانپنے لگا تمہاری پوری شخصیت ایک نئے سانچے میں ڈھل گئی۔ میرا وہ دوست جو کبھی میرا ہم جماعت تھا کہیں کھو گیا۔ اس کی جگہ ایک خوشحال اسسٹنٹ انجینئر نے لی ۔ میں نے زندگی کی انہی راہ گزاروں پر تمہاری تلاش کی، جہاں ہم نے اپنی زندگی کے بیش قیمت لمحات گذارے تھے۔ لیکن اب تمہاری کائنات مجھ سے مختلف تھی تمہارا کوئی سراغ نہ ملا۔ تم اپنا اکثر وقت شہر کے سب سے بڑے ہوٹلوں میں گذارنے لگے ۔ تمہیں برج، بلیاربیس اور گولف سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ مچھلی کے شکار کے بھی شوقین ہو گئے ہو۔ تمہارے کپڑوں سے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ تمہارے نرم و نازک جسم نے کبھی کھدر کا بوجھ بھی برداشت کیا ہو گا سُنا ہے کہ تم نے اپنا ایک خوبصورت سامکان بھی تعمیر کیا ہے تمہاری شادی کے لئے کئی بہت اُونچے گھرانوں سے پیغامات آ رہے ہیں اور کھلے بازار میں تمہاری قیمت چکائی جا رہی ہے اور اب تو تمہارے پاس اتنی خوبصورت کار بھی آ گئی ہے۔

میرے دوست! تمہاا حلقہ احباب بھی بدل چکا ہے اب تمہیں ہر وقت ٹھیکدار اور اوَرسیر ہی گھیرے رہتے ہیں۔ اس لئے شاید تمہیں مجھ سے ملنے کی فرصت ہی نہ ہو لیکن تم سے یہ ضرور پوچھنا چاہتا ہوں کہ دو سو روپے میں تم عیش و عشرت ،آسودگی اور اطمینان کی یہ زندگی کیوں کر گذار لیتے ہو تمہیں یہ سن کر حیرت ہو گی کہ اس گمنامی کی حالت میں بھی میں اڑھائی سو روپے لے

رہا ہوں۔ لیکن میں پچھلے ایک سال میں اپنی پھٹیچر سائیکل کا ٹیوب بھی نہیں بدل سکا ہوں۔ تمہارا لباس فاخرہ، تمہارے ہوٹلوں کے بل، تمہارے مکان کی خوبصورتی، تمہاری کار کی دوشیزگی، یہ سب کچھ مجھے بھی عزیز ہے لیکن اسسٹنٹ انجینئر کے پاس الہ دین کا وہ کونسا چراغ ہے جو صرف دو ایک سال میں یہ سب چیزیں مہیا کر دیتا ہے۔ سائنس کے کرشموں کی داستان ہم شروع سے سنتے آئے ہیں۔ سُنا ہے کہ سائنس نے اتنی ترقی کی ہے کہ کئی سال کا کام دنوں میں ہو جاتا ہے۔ ابھی تک سنا تھا، تمہیں دیکھا ہے تو سائنس کی ترقی کا یقین ہوگیا ہے۔ پیارے! دو سال میں تم کیا سے کیا ہو گئے ہو۔ میں فائیلوں کے انبار میں بیٹھ کر جس دُنیا کے خواب دیکھتا ہوں، تم نے خواب دیکھے بغیر ان کی تعبیر دیکھ لی ہے۔ مجھے تمہاری زندگی پر رشک آتا ہے۔ رشک تو بڑا مہذب لفظ ہے۔ مجھے تم سے حسد آتا ہے۔ تمہیں دو ہی سال میں وہ سب کچھ مل گیا ہے جو مجھے آئندہ پچاس برسوں میں بھی نصیب نہ ہوگا۔ جاؤ ان استادوں کو بتاؤ کہ تم کیا ہو۔ جو تمہیں نا اہل اور نا قابل سمجھ کر ڈانٹ دیا کرتے تھے، ہو سکے تو ان میں سے دو ایک کو اپنی خوبصورت کار کے نیچے کچل دو۔ ان سے کہہ دو کہ ابھی تم صرف اسسٹنٹ انجینئر ہو۔ اب تمہیں ڈویژنل انجینئر، سپرنٹنڈنٹ انجینئر اور چیف انجینئر بھی بننا ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

میرا ٹوٹا پھوٹا مکان جس کی چھت آج بھی ٹپک رہی ہے، تمہارے تاج محل کو سلام کہتا ہے۔ میری پھٹیچر سائیکل تمہاری کار کو نہیں تمہیں آداب کہتی ہے

تمہارا

چراغ بیگ

❁❁❁

۱۶ جولائی ۱۹۷۴ء

مولانا مسعودی کے نام

مولانائے محترم!

سرینگر سے شائع ہونے والے ایک مقبول عام روزنامے میں، کل آپ کا ایک مختصر مگر جامع انٹرویو پڑھ کر طبیعت خوش ہوگئی، آپ کی طویل خاموشی اب اس قدر پُر اسرار بن گئی تھی کہ آپ کے عقیدت مندوں کو بھی آپ کی نیت پر شک ہونے لگا تھا۔ آپ نے اچھا کیا جو اپنی مہرِ سکوت کو توڑ کر برملا طور پر اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کیا، کیونکہ آپ جیسے دانائے راز اور پختہ کار سیاستدان کا نوعمر اور ناتجربہ کار طالع آزماؤں کو ''پلے بیک'' دنیا آپ کو زیب نہیں دیتا۔ جو شخص میدانِ کارزار میں لڑنا جانتا ہو وہ کمین گاہوں میں چھپ کر تیر چلائے، یہ اس کی شجاعت اور جواں مردی کی توہین ہے اور مجھے خوشی ہے کہ آپ مرّوت، مصلحت اور عافیت کا لبادہ اُتار کر مدافعت، مزاحمت اور مخالفت کی زرہ بکتر پہن کر سامنے آئے ہیں۔ مجھے افسوس صرف اس بات کا ہے کہ آپ نے یہ قدم اُٹھانے میں بڑی دیر کر دی لیکن اس غیر معمولی

تاخیر کے باوجود میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں اور کشمیر کے سیاسی افق پر آپ کے طلوعِ نو کو ایک نیک شگون سے تعبیر کرتا ہوں بشرطیکہ آپ اپنے اس نئے رول میں ثابت قدمی اور استقامت کا ثبوت دیں!

حضرت مولانا! آپ نے اپنے انٹرویو میں بہت سے موضوعات اور مسائل پر اپنی رائے ظاہر کی ہے اور مجھے آپ کو یہ یقین دلانے کی ضرورت نہیں کہ میرے دل میں آپ کے لئے بے پناہ عقیدت اور احترام ہے اور میں آپ کی غیر معمولی شخصیت، بے پناہ علمیت اور سیاسی بصیرت سے بہت مرعوب ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میں زیر بحث انٹرویو میں آپ کے استدلال، آپ کی منطق اور آپ کے اندازِ فکر سے متفق یا متاثر نہیں ہو سکا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے، اس میں تفکر سے زیادہ تکبر اور تعقل سے زیادہ جھنجھلاہٹ کا عنصر نمایاں ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ جیسا صائب الرائے، تجربہ کار اور دیدہ ورسیاستدان اپنی ذات کے طلسم میں کھو کر اپنی کائنات کو کیوں کر بھلا بیٹھا اور میرے اس خط کی شان نزول، میری یہی حیرت ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میری حیرت کو دور کر کے میری بصیرت میں اضافہ کریں گے۔ آپ نے اپنے انٹرویو میں بہت سے ایسے سوالات اُٹھائے ہیں کہ جن پر تفصیل سے بحث کی گنجائش موجود ہے لیکن آج کی نشست میں، میں صرف ایک نکتہ ابھارنا چاہتا ہوں اور اس کا تعلق بڑھاپے اور جوانی سے ہے۔

قبلۂ محترم! یہ بات آپ پہلے بھی کئی بار کہہ چکے ہیں کہ ”بوڑھے لیڈروں کو نوجوانوں کے ہاتھ میں قیادت سونپ کر سیاست سے

ریٹائر ہو جانا چاہیے"۔ اپنے تازہ ترین انٹرویو میں بھی آپ نے یہ بات بڑے شدومد کے ساتھ دہرائی ہے بلکہ میں یہ کہوں گا کہ آپ نے سارے انٹرویو میں بار بار یہی بات کہی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ایک سال قبل بھی میں نے آپ سے یہ دریافت کیا تھا کہ نوجوانوں کو قیادت منتقل کرنے کا طریق کار کیا ہوگا؟ اور انتقال کی یہ رسم کس طرح انجام دی جائے گی؟ میرا یہ سوال اپنے جواب کی تلاش میں آج بھی آوارہ پھر رہا ہے کیوں کہ اپنے تازہ ترین بیان میں بھی، آپ نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا ہے۔ اجازت دیجئے کہ میں ایک بار پھر آپ سے یہ جاننے کی گستاخی کروں کہ نوجوانوں کو آگے بڑھ کر قیادت کا یہ علم چھیننے سے کس نے روکا ہے؟ تاریخ کے کس دور میں اور دُنیا کے کس ملک میں نوجوانوں کو قیادت سونپنے کے لئے باقاعدہ اعلان جاری کیا گیا ہے؟ نوجوانوں کی قیادت سے آپ کی مراد کیا ہے؟ لفظ جوان اور جوانی سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ اور سیاست کی تاریخ اور لُغت میں اس کا کیا مفہوم ہے؟ دُنیا کے کس ملک یا خطے میں ۳۴ سالہ نوجوان سیادت اور قیادت کا علم اُٹھائے ہوئے ہیں؟ امریکہ، روس، چین جاپان، فرانس، جرمنی، یوگوسلاویہ، ایران، مصر سعودی عرب، افغانستان، ان تمام ممالک میں سیاسی قیادت کن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے؟ وہاں کے نوجوان ہمارے ہاں کے نوجوانوں کے مقابلے میں ذہنی، فکری اور سیاسی اعتبار سے بہت آگے ہیں لیکن وہاں کوئی مولانا مسعودی صبح شام یہ صدا کیوں بلند نہیں کرتا کہ بوڑھے لیڈروں کو نوجوانوں کے لئے جگہ خالی کرنے کے لئے میدان سے ہٹ جانا چاہیے۔ دور کیوں جایئے آزاد ہندوستان

میں پہلی بار عوامی بغاوت اور سیاسی انقلاب کی رہنمائی کون کر رہا ہے؟ اس کا نام جے پرکاش نارائن ہے اور اس کی عمر ۷۴ برس ہے اور معاف کیجئے، وہ سیدھے ہسپتال سے آکر بہار کی عوامی بغاوت کا رہبر اور رہنما بن گیا اور آج سارا ہندوستان اس بوڑھے انقلابی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ آپ کے خیال میں، جے پرکاش کو قیادت چھوڑ کر اسے نوجوانوں کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ لیکن خود نوجوانوں کا اصرار ہے کہ جے پرکاش نارائن ان کی قیادت کریں۔ مولانا یہ بتایئے کہ ان حالات میں آپ کے فرمان کی کیا تعبیر کی جائے؟ یہ بتایئے کہ کشمیر کے ''بوڑھے لیڈر'' شیخ محمد عبداللہ، قیادت کی یہ مشعل کس کے ہاتھوں میں سونپ دیں اور کس طرح، آپ کے انٹرویو سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ قیادت کا یہ جھنڈا نوجوان میر واعظ مولوی محمد فاروق کے ہاتھوں میں دینا چاہتے ہیں اور آپ کی خواہش ہے کہ مولانا کو اپنا جانشین قرار دینے کے بعد شیخ صاحب سیاست سے دست بردار اور ملکی معاملات سے دست کش ہو جائیں۔ یہی مطلب ہے نا آپ کا؟ سوچئے ایک لمحے کے لئے سوچئے کہ اگر خدانخواستہ شیخ صاحب آپ کے مشورے پر عمل کر کے سیاست سے دست بردار ہو جائیں تو کیا ہوگا؟ آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کشمیر کی سیاسی زندگی میں اتنا بڑا خلاء پیدا ہوگا کہ جسے ہزاروں مولوی فاروق اور سینکڑوں مولانا مسعودی بھی پُر نہ کر سکیں گے۔ آپ کا خیال ہے کہ مولوی فاروق جیسے نو عمر اور نا تجربہ کار نوجوان یہ بوجھ اُٹھا سکیں گے؟ آپ کو یہ حُسن ظن ہے کہ عبدالرشید کابلی اور سلیم انور ڈار جیسے نوجوان یہ علم سنبھالیں گے؟ آپ کا یہ دعویٰ ہے کہ شبیر اور شمیم جیسے نو

آزمودہ کار یہ بار اُٹھانے کے اہل ہیں؟ معاف کیجئے مولانا! شیخ صاحب کی دشمنی میں آپ کشمیر کے مستقبل سے کیوں کھیلنے لگے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ شیخ محمد عبداللہ ہماری ۴۲ سالہ عبادت، ریاضت، ایثار اور انتظار کا حاصل ہیں؟ کیا آپ کو اس حقیقت کا عرفان نہیں ہے کہ کشمیر کی ریاست کو مسئلہ کشمیر بنانے کا سہرا اسی ''بوڑھے لیڈر'' کے سر ہے کہ جس کے بڑھاپے پر بہت سے فاروقوں کی جوانی قربان کی جا سکتی ہے؟ کیا آپ اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ شیخ عبداللہ اپنے بڑھاپے کے باوجود اپنی ہمت، تندرسی توانائی اور طاقت کے اعتبار سے بہت سے نوجوانوں کے مقابلے میں زیادہ نوجوان ہیں؟ آپ یہ سب جانتے ہوئے بھی انجان بننے کی کوشش کریں تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟ آپ کو اگر شیخ صاحب کی سیاست سے اختلاف ہے، ان کا موقف نا پسند ہے، ان کی لیڈر شپ کا اسٹائل ناگوار گزرتا ہے، ان کے خیالات سے اتفاق نہیں، ان کے طرز عمل سے ناراضگی ہے تو کھل کر صاف اور واضح الفاظ میں اپنی ناراضگی، اپنی ناگواری، اپنے اختلاف اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیجئے۔ دلیل و براہین سے ہمیں سمجھایئے کہ شیخ محمد عبداللہ کا طرز فکر اور طرز عمل کیوں ملک اور قوم کے لئے نقصان دہ ہے۔ یہ آپ کا بنیادی اور جمہوری حق ہے اور شیخ عبداللہ کیا دُنیا کی کوئی طاقت آپ کو اس حق سے محروم نہیں کر سکتی۔ لیکن جوانی اور بڑھاپے کی بحث اُٹھا کر غلط مبحث نہ کیجئے۔ شیخ عبداللہ جوان ہیں یا بوڑھے، اس کا اس بحث سے کوئی تعلق نہیں کہ وہ صحیح ہیں یا غلط، بہت سے نوجوان اپنی جوانی کے باوجود غلط نظریات اور غلط کار سیاست کے علمبردار ہوتے ہیں اور بہت سے بوڑھے

اپنے بڑھاپے کے باوجود صحیح مسلک پر قائم ہوتے ہیں اور سیاست میں
خاص طور پر بڑھاپے اور جوانی کی کوئی قید نہیں ہوتی مغربی جرمنی کے
سابق چانسلر ایڈی نائر کو جب ستر برس کی عمر میں ہٹلر نے قید کر لیا تو
داروغۂ جیل نے ایڈی نائر سے کہا کہ ''ارے او بوڑھے! اب خودکشی کی
کوشش کر کے میرے مشکلات میں اضافہ نہ کرنا'' ایڈی نائر نے حیران
ہو کر پوچھا کہ ''تمہارے دل میں یہ خیال کیوں آیا کہ مین خودکشی کروں
گا'' تو داروغۂ جیل نے کہا کہ تم ستر برس کے ہو چکے ہو، اب تمہارے
لئے زندگی میں رکھا کیا ہے اس لئے عین ممکن ہے کہ تم خودکشی کر کے
اپنی زندگی کا خاتمہ کر دو''......ہٹلر کی شکست کے دو سال بعد ایڈی نائر نہ
صرف جرمنی کے چانسلر بن گئے، بلکہ اُنہوں نے پورے دس سال تک
نئے جرمنی کی تعمیر اور تشکیل میں نمایاں حصہ لیا۔ میں نے آپ کو یہ واقعہ
صرف اس لئے سنایا ہے کہ آپ پر یہ واضح کر دوں کہ سیاست کی دُنیا
میں بڑھاپے اور نوجوانی کی اصطلاحیں ان معنوں میں استعمال نہیں
ہوتیں کہ جن معنوں میں آپ انہیں کشمیر کے سیاسی پس منظر میں استعمال
کر رہے ہیں۔ آپ نے اس ضمن میں پنڈت جواہر لال نہرو کی مثال
دی ہے کہ اُنہوں نے اپنی زندگی کے دوران ہی شریمتی اندرا گاندھی کو
اپنا جانشین بنانے پر اپنی ساری توجہ صرف کر دی تھی۔ یہ مثال غلط بھی
ہے اور گمراہ کُن بھی۔ غلط اس لئے کہ جواہر لال نہرو آخری وقت تک
وزارت اعظمٰی سے دست بردار نہ ہوئے حالانکہ ان کے بہت سے خیر
خواہوں کے علاوہ ان کے معالجوں نے بھی انہیں یہ مشورہ دیا تھا کہ
انہیں اپنے منصب سے سبکدوش ہو کر آرام کرنا چاہیے۔ بعض لوگوں کا

خیال ہے کہ وہ اگر اپنے کام کا بوجھ کچھ ہلکا کرتے تو کئی سال تک زندہ رہتے لیکن جواہرلال اور شیخ عبداللہ جیسے لوگ ذمہ داریاں سنبھالتے ہیں تو وہ بڑھاپے کا بہانہ کر کے آپ کی طرح روپوش نہیں ہوتے۔ وہ آخری دم تک لڑتے ہیں اور جدوجہد کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ جواہر لال پر اپنی بیٹی کو اپنا جانشین بنانے کا الزام عائد کرنا پنڈت جی کے ساتھ شدید ناانصافی ہے۔ اُنہوں نے کبھی اس کی شعوری کوشش نہیں کی اور ویسے بھی اپنے بچوں کو اپنا جانشین بنانے کی کوشش قابل تعریف نہیں۔ اس سلسلے میں آپ سے اگلی اشاعت میں کچھ اور باتیں بھی ہوں گی۔ جب تک کے لئے اجازت دیجئے۔

آپ کا مخلص
شمیم

۱۷/ اگست ۱۹۷۴ء

مولانا مسعودی کے نام .... دوسرا خط

میرے محترم!

یہ آپ سے کس نے کہا کہ مسز گاندھی اس لئے ہندوستان کی وزیراعظم بن گئیں کہ جواہرلال نہرو نے انہیں اپنی زندگی میں ہی جانشینی کے لیے تیار کر دیا تھا؟ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس ہنگامہ خیز سیاسی ڈرامے سے بے خبر ہیں کہ جس نے شریمتی اندرا گاندھی کو وزیراطلاعات سے وزیراعظم بنا دیا، اور جس میں جواہرلال کی تعلیم وتربیت سے زیادہ شری مرار جی ڈیسائی کی حماقتیں، کانگریس کی اندرونی دھڑے بندی اور کانگریس کے صدر شری کامراج کی حکمت عملی کے علاوہ بہت سے دوسرے عناصر بھی شامل تھے اور یقین کیجئے کہ اگر شاستری جی کچھ دیر اور زندہ رہتے یا مرار جی ڈیسائی کی خود پسندی، خود نمائی اور خود غرضی انہیں بے نقاب نہ کرتی تو جواہرلال کی ساری تعلیم وتربیت کے باوجود ان کی اکلوتی بیٹی اندرا آج وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز نہیں ہوتیں۔ وہ اپنی قابلیت اور باپ کی تعلیم وتربیت سے زیادہ اپنے مخالفوں کی حماقتوں اور

ہندوستانی سیاست کی نزاکتوں کی پیداوار ہیں۔ اس لیے ان کی جانشینی کو ایک کلیہ بنا کر اس سے غلط نتائج اخذ نہ کیجئے۔

مولانا آپ نے اپنے مختصر مگر جامع انٹرویو میں چند اہم حقائق اور بنیادی اصولوں کی طرف کچھ بلیغ اشارے کئے ہیں۔ زبان و بیان پر آپ کو جو غیر معمولی قدرت حاصل ہے، اس کے پیش نظر یہ کہنا غلط ہوگا کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے، وہ آپ کے دل و دماغ اور روح کی آواز ہے۔ لیکن زیرِ بحث انٹرویو میں آپ کچھ ایسی باتیں بھی کہہ گئے ہیں کہ میرے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ یہ سب باتیں آپ ہی نے کہی ہیں۔ آپ نے تحریکِ آزادی کی طوالت کے اسباب بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ''ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قوم کی رہنمائی کرنے والے لیڈروں میں وقت وقت پر تفرقہ پڑا اور دوسری صف کی لیڈر شِپ تیار کرنے میں کسی نے دلچسپی نہ لی''...جہاں تک لیڈروں میں تفرقے کی بات کا تعلق ہے، میں یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ کس دور کی بات کر رہے ہیں۔ ۱۹۵۳ء کی اس سے پہلے یا اس کے بعد کی؟ ہماری آزادی کی تحریک ۱۹۳۱ء میں شروع ہوئی اور لیڈروں میں تفرقے کے باوجود جو ۱۹۴۸ء میں سترہ سال کے مختصر سے وقفے کے بعد یہ تحریک اپنے بنیادی مقاصد میں کامیاب ہوگئی، موروثی حکمرانی کا خاتمہ ہوا، کسانوں کو زمینوں کا مالک قرار دیا گیا اور نیا کشمیر کی تعمیر کا کام سرگرمی سے شروع ہوا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ آپ کو معلوم ہے اور میں وہ دہرانا نہیں چاہتا۔ اب آپ مجھے یہ بتائیے کہ سترہ سال کا وقفہ کس اعتبار سے اتنا طویل اور صبر آزما ہے کہ آپ اسکی طوالت سے گھبرا کر گاندربل میں

روپوش ہوگئے۔ میں مانتا ہوں کہ حصولِ اقتدار کے بعد لیڈر شپ میں پھوٹ پڑگئی اور اس پھوٹ نے ایک بالکل نئی صورتحال کو جنم دیا، جس کی وجہ سے اقتصادی آزادی اور سیاسی استحکام کی رفتار مدھم پڑگئی اور اگر میرا اندازہ صحیح ہے تو لیڈر شپ کے درمیان اس تفرقے، اس تضاد اور کش مکش میں آپ شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ تھے اور یہی وجہ ہے کہ آپ متعدد بار پابند سلاسل رہنے کے علاوہ قتل کے فرضی مقدمات میں بھی ماخوذ رہے۔ آپ ۱۹۶۴ء میں شیخ صاحب کے ہمراہ پاکستان گئے، ۱۹۶۵ء میں آپ نے ریاست میں عدم تشدد کی تحریک کی رہنمائی کی۔ ۱۹۶۸ء میں آپ نے پیپلز کنونشن میں شرکت کی (آپ میرے ساتھ اس کی آرگنائزنگ کمیٹی کے ممبر تھے) ۱۹۷۱ء میں آپ نے شیخ صاحب کے کہنے پر میری انتخابی مہم میں حصہ لیا۔ ان چند واقعات کی یاد دلانے سے میرا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ ۱۹۷۱ء تک بیگ صاحب کے ساتھ اپنے ذاتی اختلافات کے باوجود، آپ شیخ صاحب کے سیاسی موقف سے متفق تھے اور ۱۹۵۳ء میں شیخ صاحب کی گرفتاری سے چند ماہ پہلے آپ ہی نے چشمہ شاہی گیسٹ ہاؤس میں مولانا ابوالکلام آزاد سے کہا تھا کہ ''مولانا کشمیر نام ہے شیخ عبداللہ کا اور شیخ عبداللہ نام ہے کشمیر کا۔ مطلب یہ کہ لیڈر شپ کے درمیان ہر کش مکش اور ہر تفرقے میں، آپ شیخ صاحب کے ساتھ تھے، اس لئے آپ سے بہتر کون جانتا ہوگا۔ کہ ان اختلافات اور تفرقات کی بنیاد کیا تھی۔ آپ کے عقیدت مند (جن میں یہ گناہ گار بھی شامل ہے) صرف یہ جانتے تھے کہ اگر آپ شیخ صاحب کے ساتھ ہیں، تو پھر شیخ صاحب بھی ٹھیک راستے پر ہوں گے!

آپ کو خود شیخ صاحب کی سیاست، ان کے موقف اور ان کی راہنمائی سے کب اختلاف ہوا۔ ہمیں باقاعدہ طور ابھی حال ہی میں اس کا احساس اور اندازہ ہوا لیکن اس مرحلے پر بھی آپ کچھ اس احتیاط اور اہتمام سے کام لے رہے ہیں کہ اختلافات کی نوعیت، تضاد کی حقیقت اور تصادم کے اسباب کو سمجھنا آسان نہیں۔ برسبیل تذکرہ یہ بات بھی سن لیجئے کہ لیڈر شپ میں تفرقہ کوئی ایسی بات نہیں کہ جو صرف ہماری تحریک کا خاصہ رہا، ہر سیاسی، سماجی بلکہ مذہبی تحریک میں ایسا ہوا ہے اور ایسا ہوتا رہے گا۔ جہاں بھی دو یا دو سے زیادہ انسان ایک دوسرے کے ساتھ کام کریں، اختلاف اور تصادم کی گنجائش باقی رہے گی۔ خود کانگریس کی لیڈر شپ میں تفرقے پڑتے رہے ہیں۔ گاندھی اور جواہر لال نہرو کے درمیان شدید اختلافات تھے۔ سبھاش چندر بوس کی کہانی آپ کو معلوم ہے۔ نہرو اور پٹیل کی معرکہ آرائیاں آج بھی زبانِ زدِ عام ہیں۔ دور کیوں جایئے، سال ۱۹۶۹ء میں کانگریسی قیادت کے درمیان تفرقے نے پورے ملک کی سیاست کا نقشہ ہی بدل دیا۔ لیکن ان تفرقوں کے باوجود سیاست کا کارواں چلتا رہتا ہے اور چلتا رہے گا۔ پھر یہ بتایئے کہ ان تفرقوں کا ذکر کرکے آپ ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟۔

آپ کہتے ہیں کہ دوسری صف کی لیڈر شپ تیار کرنے میں کسی نے دلچسپی نہ لی۔ مولانائے محترم دوسری صف کی لیڈر شپ پیدا کی نہیں جاتی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہاں، کس ملک اور کس تحریک میں دوسری صف کی لیڈر شپ تیار کرنے کے لئے کوئی کارخانہ یا کوئی فیکٹری قائم ہوئی

ہے۔ دوسری صف کی لیڈر شپ اوسط درجے کے طبقے سے اُبھرتی ہے۔ اور خود ابھرتی ہے کشمیر کی تحریک آزادی میں بھی ایسا ہوا۔ شیخ صاحب صف اول کے رہنما تھے، وہ ہماری تحریک کا سرمایہ اور ہماری جنگ آزادی کے سپہ سالار تھے۔ شیخ صاحب کے ساتھ آپ جیسے مردِ دانا، بخشی غلام محمد جیسے مردِ عمل، غلام محمد صادق جیسے باشعور سیاستدان، میرزا محمد افضل بیگ جیسے قانون دان اور غلام محی الدین قرہ جیسے آتش بیان کام کر رہے تھے۔ آپ سب کو اگر صف اول کی قیادت میں شامل سمجھا جائے تو دوسری صف میں سید میر قاسم، غلام رسول رینزو، غلام محمد میر راجپوری، غلام رسول کار، خواجہ مبارک شاہ، پیر غیاث الدین جیسے نوجوان شامل تھے، کیا اس سے بہتر دوسری صف کی لیڈر شپ کا تصور کیا جاسکتا تھا؟ لیکن ایک اہم سیاسی موڑ پر آکر جب صف اول کی لیڈر شپ بٹ گئی، تو دوسری صف کی لیڈر شپ بھی پراگندہ ہوگئی اور آپ ہی بتایئے کہ اس میں شیخ صاحب کا کیا قصور تھا؟ پھر ۱۹۵۳ء کے بعد بھی محاذ میں ایک دوسری صف کی لیڈر شپ پیدا ہوگئی۔ جس میں عبدالغنی گونی، علی محمد نایک غلام محمد شاہ، غلام محمد بھدرواہی اور دوسرے کئی ایسے نام گنوائے جاسکتے ہیں۔ لیکن ایک اور منزل پر آکر اس لیڈر شپ میں تفرقہ ناگزیر ہوگیا اور یہ بھی بٹ گئی۔ اب بھلا اس میں شیخ صاحب کا کیا قصور ہے اور آپ یہ طعنہ کس کو دے رہے ہیں کہ دوسری صف کی لیڈر شپ تیار کرنے میں کسی نے دلچسپی نہیں لی؟ خود اس سلسلے میں آپ نے کونسا کارنامہ انجام دیا ہے؟ آخر آپ بھی تو نیشنل کانفرنس کی تنظیم کے روح رواں تھے؟ آپ بُرا نہ مانیں تو آپ کی تیار کردہ دوسری صف

کی لیڈرشپ اس قابل بھی نہیں ہے کہ اسے میونسپلٹی کا نظام سونپ دیا جائے، ساری ریاست کی قیادت کا تو سوال ہی نہیں۔

حضرت مولانا! مجھے اس بات کی واقعی خوشی ہے کہ آپ نے برملا طور پر اس بات کا اعتراف کر لیا ہے کہ مولوی محمد فاروق آپ کے پاس آتے ہیں اور آپ ان کو مشورے دیتے رہتے ہیں۔ یہ بات ساری دُنیا کو معلوم تھی لیکن چوں کہ فاروق صاحب اور آپ دونوں اس اخلاص باہم اور اختلاط پیہم کو چھپاتے پھرتے تھے، اس لئے لوگ طرح طرح کی افواہیں اُڑاتے تھے۔ کبھی یہ کہا جاتا تھا کہ مولانا فاروق کو آدھی رات کے وقت گاندربل میں مولانا مسعودی کے ہاں سے نکلتے دیکھا گیا اور کبھی یہ افواہ اڑائی جاتی تھی کہ مولانا مسعودی رات کے اندھیرے میں برقعہ اوڑھے ہوئے میر واعظ منزل میں داخل ہوتے دیکھے گئے۔ اب آپ کے اس اعلان اور اعتراف کے بعد اس قسم کی شرانگیز افواہوں کا سلسلہ بند ہو جائے گا۔ لیکن مجھے یہ بتایئے کہ اس اقرار اور اعتراف سے آپ نے کس کا وقار بڑھایا؟ مولوی فاروق کے متعلق اب یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ اس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں، وہ آپ کا پڑھایا اور سکھایا ہوا طوطا ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے وہ دراصل آپ کی آواز ہے۔ میں جب جب مولانا کو اپنی تقریر میں علامہ اقبال کے شعر استعمال کرتے سنتا تھا تو میرا دل کہتا تھا کہ یہ شعر آپ نے اُسے رٹوائے ہیں ورنہ اس بے چارے کو ان اشعار کی معنویت کا احساس اور ان کے استعمال کا سلیقہ کہاں۔ اب آپ نے میرے گمان کو یقین میں بدل کر سارا مزہ ہی کِرکرا دیا۔ میرا خیال ہے (اور ہوسکتا ہے کہ میرا خیال غلط

ہو) کہ اس اعتراف سے آپ کی شہرت میں بھی کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔
بہت سے لوگ دیانتداری سے یہ محسوس کرتے تھے کہ آپ پر مولوی فاروق کو بہکانے اور شیخ صاحب کے خلاف استعمال کرنے کا الزام بے بنیاد ہے اور یہ افسانہ میرزا محمد افضل بیگ نے آپ کے اور شیخ صاحب کے درمیان بدظنی پیدا کرنے کے لیے گھڑ لیا ہے۔ کیونکہ آپ جیسے عالم بے بحر اور دانائے دہر کے ساتھ یہ تصوّر وابستہ کرنا بھی معیوب معلوم ہوتا تھا کہ آپ ایک کم سن اور ناتجربہ کار نوجوان کے کندھے پر بندوق رکھ کر شکار کھیلیں گے۔ اب یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ فاروق صاحب نے شیخ صاحب کے متعلق جو کچھ کہا ہے اور ان کی مخالفت میں جو جو حربے استعمال کئے ہیں، وہ سب آپ کی ہدایت اور نصیحت کا کرشمہ ہیں۔ مولانا! کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ فاروق صاحب کو سکھلاتے اور پڑھانے کی بجائے آپ اپنی زبان یا قلم سے وہ سب باتیں کہہ دیتے بہرکیف! مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ براہ راست اور برملا بات کہنا آپ کا اسٹائل نہیں ہے اور آپ اسے شرافت اور مروّت کے منافی سمجھتے ہیں!

اب صرف ایک اور بات رہ گئی ہے اور اس کا تعلق آپ کے سیاسی موقف سے ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ "میں رائے شماری کے موقف کو صحیح سمجھتا ہوں۔ البتہ رائے شماری کا مطالبہ منوانے کے لئے میں اس اپروچ کے حق میں کبھی نہیں تھا، جو میرزا افضل بیگ نے اختیار کیا تھا۔ کوئی چیز پیش کرنے کا الگ الگ ڈھنگ ہوتا ہے۔ محاذ رائے شماری کے نام پر مطالبہ منوانے میں بہت زیادہ دشواریاں اور مشکلات تھیں لیکن یہی مطالبہ اگر کسی اور پارٹی کے تحت مثلاً ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے

نام سے پیش کیا جاتا تو راستہ زیادہ مشکل نہیں بن سکتا تھا ، اس بارے
میں اس مرحلے پر آپ کے اس دعویٰ کو جھٹلانا نہیں چاہتا، کہ کشمیر کے
بارے میں رائے شماری کا موقف درست ہے، لیکن اس موقف اور
مطالبے کو منوانے کے لئے آپ نے جس مختلف اپروچ کی بات کی ہے،
اس سلسلے میں آپ دو باتیں کرنا چاہوں گا۔ محاذ رائے شماری کو قائم
ہوئے اب تقریباً بیس برس ہو گئے، اس طویل عرصے میں ٹھیک یا غلط
محاذ کے لیڈر اور کارکن اپنے موقف کے لیے طرح طرح کی قربانیاں
دیتے رہے۔ لیکن ان بیس برسوں میں آپ نے ایک بار بھی کسی تقریر،
اخباری بیان، مراسلے یا مضمون میں اپنی اس رائے کا اظہار نہیں کیا، کہ
آپ محاذ رائے شماری کے نام سے رائے شماری کے مطالبے کی کامیابی کو
مشکوک سمجھتے ہیں۔ اگر آپ دیانتداری سے یہ محسوس کرتے تھے کہ یہ نام
اور یہ اپروچ غلط ہے تو آپ کو کس نے روکا تھا، کہ آپ واضح طور اس کا
اعلان اور اظہار کرتے ؟۔ بیس برس بعد بھی اگر ایک اخباری نمائندہ آپ
کے دربار میں حاضر ہو کر آپ سے یہ سوال نہ کرتا، کہ آپ رائے شماری
کے مطالبے کو صحیح سمجھتے ہیں یا غلط تو اس بات کا امکان ہے کہ آپ اپنی
اس رائے کو زندگی بھر ظاہر نہیں کرتے ۔ مولانا! یہ کیسی قیادت ہے، یہ کیسا
ظلم ہے، یہ کونسا تدبر اور کونسی دور اندیشی ہے، کہ آپ ایک چیز، ایک
اپروچ اور ایک طریق کار کو قوم کے لئے مضر اور مہلک سمجھتے ہوئے بھی
پورے بیس برس مکمل خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ آپ کا کہنا ہے کہ
رائے شماری کا مطالبہ ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے نام سے بھی پیش کیا
جا سکتا تھا اور اس میں کم مشکلات حائل تھیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ آپ

کو ایسا کرنے سے کس نے روکا تھا؟ آپ کے خیال میں اگر رائے شماری کا حق ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے نام سے حاصل ہوسکتا تھا، تو آپ نے یہ جماعت قائم کیوں نہیں کی؟ اور میرزا افضل بیگ کی ضد میں آپ خاموش کیوں رہے؟ جو شخص بیس سال تک ضد، مصلحت، ناراضگی اور گوشہ نشینی کے نام پر خاموش رہا، اسے بیس برس بعد شیخ عبداللہ اور میرزا افضل بیگ کی غلطیاں گنانے کا کیا حق ہے؟ جس قوم کی قیادت آپ بوڑھے رہنماؤں کے ہاتھ سے چھین کر نوجوانوں کو منتقل کرنا چاہتے ہیں، وہ قوم آپ سے یہ سوال کرنا چاہتی ہے، کہ آپ بیس برس تک قومی مفادات کا خون ہوتے دیکھ کر بھی کیوں خاموش رہے؟ اور اب جو آپ نے لب کشائی کی ہے، تو اس کا فائیدہ کیا ہوگا۔ قبلہ محترم! آپ کے مقابلے میں تو یہ خاکسار کہیں زیادہ جرأت مند اور باعمل ہے، کہ جس نے پچھلے سات آٹھ برسوں میں ایک سو سے بھی زائد مرتبہ شیخ محمد عبداللہ اور میرزا افضل بیگ کی غلط کاریوں کی نشاندہی کی ہے آپ کے مقابلے میں تو غلام محمد سالار اور مکھن لال فوطیدار دونوں کی جرأت قابل داد ہے کہ جو کھل کر شیخ صاحب اور میرزا بیگ کی سیاست سے اختلاف کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ آپ نے سیاست کا کونسا نیا اور نادر اسٹائل ایجاد کیا ہے کہ آپ اپنے گاندربل کے عافیت خانے میں کچھ لوگوں کی باتیں سُنتے ہیں اور کچھ کو اپنی باتیں سناتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آپ اپنے فرائض سے سبکدوش ہوگئے کیا اب بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ جو بات آپ کہنا چاہتے ہوں وہ آپ مولوی فاروق صاحب کی زبان سے ادا کرنے کی بجائے خود ادا کریں۔ ایسا کرنے سے آپ کے وقار اور

آپ کی افادیت دونوں میں ہی اضافہ ہوگا!

مولانا! خط طویل ہوتا جارہا ہے اور آپ کے بیان میں بہت سے فکری اور سیاسی تضادات کی نشان دہی کرنا ابھی باقی ہے۔ مولانا فاروق کے سیاسی موقف سے آپ کا اتفاق اور ان کے نظریات سے ہم آہنگی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اس عمر کو پہنچ کر اب اپنے ماضی کی نفی کر رہے ہیں۔ اگر یہ ذہنی رویہ شیخ صاحب سے ناراضگی اور بیگ صاحب سے بیزاری کا نتیجہ ہے، تو کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ انسان کبھی کبھی غصے اور ضد میں آکر بہک جاتا ہے۔ لیکن اگر اس تبدیلی کی بنیادیں فکری ہیں، تو میں اسے اپنی قومی زندگی کا بہت بڑا سانحہ اور المیہ تصور کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ ان ہی صفحات پر پھر آپ سے مخاطب ہونے کا موقع ملے گا۔ جب تک کے لئے خدا حافظ۔

آپ کا نیاز مند
شمیم

۲۷ جولائی ۱۹۷۶ء

وزیر اعلیٰ کے نام

محترم شیخ صاحب!

گستاخی معاف کہ آج آپ سے یوں برسر بازار مخاطب ہونے کی جسارت کر رہا ہوں، دراصل آپ کی بے شمار اور مختلف النوع مصروفیات کے پیش نظر ایک بظاہر اور غیر اہم مسئلے پر آپ کا قیمتی وقت ضائع کرنے کی ہمت نہیں ہوئی، اس لئے سوچا کہ کیوں نہ ایک کھلا خط لکھ کر اپنا فرض ادا کر لیا جائے تا کہ آپ کو دن بھر کی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد جب بھی تھوڑا سا وقت ملے آپ اس کا مطالعہ کریں۔

اس خط کا موضوع کیا ہے؟ اس مرحلے پر آپ کو یہ بتانے کی مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ لیکن اس کی شان نزول کیا ہے؟ یہ سن لیجیے۔ ۲۲/جولائی جمعرات کو آپ صورہ گرلز سکول کی نئی عمارت کا افتتاح کرنے کے لئے شام چھ بجے صورہ جانے والے تھے، میری اطلاع ہے کہ اس سکول کی طالبات پچھلے تین ماہ سے آپ کا شایان شان استقبال کرنے کی تیاریاں کر رہی تھیں اور افتتاحی تقریب کے لیے ان بچیوں نے ایک دلچسپ تمدنی پروگرام ترتیب دیا تھا اور ۲۲ جولائی جمعرات کو سکول کا سارا سٹاف، طالبات اور علاقے بھر کے لوگ صبح دس بجے سے ہی آپ کے منتظر تھے، مجھے یہ جان کر کوئی تعجب نہیں ہوا کہ آپ حسبِ معمول، حسبِ عادت اور حسبِ روایت، چھ بجے کی بجائے ٹھیک سات بجے صورہ پہونچے اور جہاں تک صورہ گرلز سکول میں صبح سے آپ

کا انتظار کرنے والی طالبات، اساتذہ اور عوام کا تعلق ہے، وہ آپ کے ایک گھنٹہ دیر سے پہونچنے کو بھی اپنی سعادت سمجھ کر اپنی قسمت پر فخر کرتے رہے۔ پروگرام شروع ہوا لیکن آدھ گھنٹے کے بعد ہی آپ اپنی کسی دوسری مصروفیت کی بناء پر وہاں سے چلے آئے اور بے چاری طالبات اور ان کی استانیاں، اپنی محنت، اپنے فن، اپنے خلوص اور اپنی عقیدت کا بھرپور مظاہرہ بھی نہ کر سکیں۔ یہ واقعہ مجھے ایک کم سن بچی نے سنایا اور اسے سنتے ہوئے میں نے اس معصوم بچی کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے دیکھے۔

بات معمولی سی ہے، اتنی معمولی کہ اس کا تذکرہ بھی آپ کو عجیب سا لگ رہا ہوگا۔ خود مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے لیکن اس کے تذکرے کی ضرورت اس لئے محسوس ہو رہی ہے کہ آپ کا ہر تقریب میں ڈیڑھ گھنٹہ تاخیر سے آنا آپ کا اسٹائل اور آپ کی شخصیت کا ایک جزو لاینفک بن گیا ہے۔ شادی کی تقریب ہو یا غمی کا سانحہ، آپ جہاں بھی جاتے ہیں کبھی وقت سے نہیں جاتے ادبی محفل ہو یا سیاسی جلسہ، یہ حادثہ آج تک ایک بار بھی رونما نہیں ہوا ہے کہ آپ وقت مقررہ پر تشریف لائے ہوں اور تاخیر بھی منٹوں کی نہیں، ہمیشہ گھنٹوں کی ہوتی ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق آپ کی صدارت میں منعقد ہونے والی کابینہ کی مٹینگیں بھی نہ کبھی وقت پر شروع ہوتی ہیں اور نہ کبھی مقررہ وقت پر ختم ہوتی ہیں۔ ایک اخبار نویس کی حیثیت سے کوہ کن کا یہ ذاتی تجربہ ہے کہ آپ اخباری کانفرنسوں میں بھی ہمیشہ گھنٹے کی تاخیر کے بعد ہی آتے ہیں اور اب یہ صورت ہے کہ دنیا بھر کو یہ بات معلوم ہو گئی ہے، کہ آپ وقت کی پابندی کا کوئی احترام نہیں کرتے اور آپ کے نزدیک وقت

کی پابندی کوئی ایسی خصوصیت نہیں، کہ جس کا التزام کرنا ضروری ہو۔

قبلہ محترم! میں جانتا ہوں کہ آپ کی مصروفیات کا کوئی شمار نہیں، مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ آپ کی مصروفیات کی غیر معمولی نوعیت اور مسائل کی اہمیت آپ کو کبھی کبھی وقت مقررہ کی پابند رکھنے میں حائل ہوتی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہر سکول، ہر کالج، ہر جماعت، ہر انجمن اور ہر شخص آپ کو اپنی عمومی اور خصوصی تقریبات میں شامل کر کے اپنی محفلوں کی رونق بڑھانا چاہتا ہے اور اس طرح آپ کا پروگرام، وقت کی مقررہ حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔ یہ سب باتیں صحیح ہیں۔ لیکن ان باتوں کی صحت بھی آپ کے موجودہ اسٹائل کا جواز نہیں۔ آپ اگر چاہیں، تو اپنی ان تمام مصروفیات کو اس ترتیب سے منظّم کر سکتے ہیں کہ کام وقت پر انجام دیا جا سکتا ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پابندیٔ وقت کے التزام کو آپ کی زندگی میں کوئی اہمیت ہی حاصل نہیں ہے اور نہ کبھی آپ کو یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ کا انتظار کرنے والوں کے وقت کی کوئی قیمت ہے۔ میں نے بارہا یہ محسوس کیا ہے کہ آپ اگر چاہیں تو ہر کام اپنے مقررہ وقت پر انجام دے سکتے ہیں۔ لیکن مجھے معاف کیجئے کہ مجھے آپ کے ہاں یہ چاہت ہی نظر نہیں آتی، نتیجہ یہ کہ شیخ عبداللہ کی ذات اور وقت کی پابندی دو متضاد تصورات بن گئے ہیں اور ساری دنیا نے اب آپ کا یہ اسٹائل قبول کر لیا ہے۔

محترم شیخ صاحب! مجھے یہ معلوم ہے کہ میرا یہ خط پڑھتے ہوئے آپ کا ردِعمل کیا ہوگا؟ آپ یقیناً میری گستاخی پر ناراض نہیں ہوں گے۔ بلکہ مجھے اندیشہ یہ ہے کہ آپ اس کو پڑھتے ہوئے زیر لب مسکرا رہے ہوں گے اور اسے پڑھنے کے بعد آپ شاید یہ بھی کہہ دیں کہ ٹھیک

ہی تو کہتا ہے لیکن پھر آخر میں آپ کہیں گے کہ بس کہنے کی باتیں ہیں۔ کوہ کن میری جگہ ہوتا تو اسے پتہ چلتا کہ وقت کی پابندی کتنا مشکل کام ہے، میرے محترم! یہ نہ کہئے، آپ سے زیادہ مصروف شخصیات نے یہ معجزہ کر دکھایا ہے اور دنیا کے بڑے بڑے سیاستدان اور حکمران (جن کی مصروفیات یقیناً آپ سے بھی زیادہ ہیں) آج بھی اس اصول پر عمل پیرا ہوکر اپنی زندگی گزار رہے ہیں، پھر آپ کے لئے یہ کام اتنا مشکل اور ناممکن کیوں ہے؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ اگر کبھی کبھار ہی وقت کی پابندی کا احترام نہ کر پاتے، تو بات درگزر ہوسکتی تھی۔ لیکن ستم یہ ہے کہ آپ کے ہاں وقت کی بے حرمتی تو قاعدہ کلیہ ہے اور پابندی وقت محض اتفاق.....۔

جناب وزیر اعلیٰ! مجھے امید ہے کہ آپ اس ناچیز کو اس گستاخی کے لئے معاف کریں گے۔ مجھے یہ چند باتیں کہنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ آپ کی شخصیت آپ کا کردار آپ کا عمل اور آپ کا فرمان ہم نوجوانوں کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے اور جب ہم یہ دیکھیں کہ آپ کی نگاہوں میں وقت کی کوئی قدروقیمت نہیں تو ظاہر ہے کہ اس کا ہمارے کردار اور گفتار پر بہت اچھا اثر نہیں پڑے گا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنی مصروفیات کو کم کر کے انہیں اس شکل سے ترتیب دیں کہ ہر تقریب اور ہر محفل میں آپ کی شرکت کے وقت لوگ اپنی گھڑیوں کا وقت ٹھیک کیا کریں کوشش کیجئے ایسا کرنا مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔

فقط، آپ کا مخلص

کوہ کن

❀❀❀

۱۴/اگست ۱۹۷۷ء (کھلی چٹھی)

مچھروں کے نام

پیارے موسیقارو!

میں خیریت سے نہیں ہوں بلکہ تم ہی سے اپنی خیریت کا طالب ہوں۔ ہر سال کی طرح تم وقتِ مقررہ پر اس سال بھی نازل ہو گئے ہو اور پچھلی کئی راتیں تمہاری صوفیانہ قسم کی موسیقی سنتے سنتے گزر گئی ہیں۔ تم ہمارے گھر آئے ہو تو لازم تھا کہ ہم تمہاری کچھ خاطر تواضع کرتے، تمہارے ناشتے کے لئے عمدہ خوان اور تمہارے لنچ کے لئے کچھ وٹامن آمیز ضیافتیں تیار کرتے لیکن بقول غالب ۔ آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا اور اسی لئے تمہارے نام یہ کھلی چھٹی لکھ رہا ہوں کہ معذرت نامہ بھی ہے اور ہدایت نامہ بھی۔ تم سے اور تمہارے خاندان سے ہمارے سال ہا سال کے تعلقات ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم کسی غلط فہمی میں مُبتلا ہو جاؤ، تم اپنے آباد اجداد سے پوچھ سکتے ہو کہ آج سے پندرہ سولہ برس پہلے جب وہ ہمارے مہمان ہو جاتے تو انہیں پینے کو کتنا خون

اور کھانے کو کیا کیا ضیافتیں ملا کرتی تھی۔ اب تم ہر سال آ کر نامراد لوٹ جاتے ہو۔ رات بھر ٹھمری اور دادرا گاتے گاتے تمہارا گلا سوکھ جاتا ہے، لیکن چند قطرے خون کے تمہیں نصیب نہیں ہوتے۔ ہم رات بھر کروٹیں بدلتے ہیں، تمہاری دیکھ بھال کرتے کرتے نیند غائب ہو جاتی ہے۔ تمہارے ساتھ رات بھر آنکھ مچولی کھیلتے رہتے ہیں۔ تمہاری پیاسی زبان ہمارے جسم کے صحراؤں میں خون کی تلاش میں ماری ماری پھرتی ہے، لیکن اس کی پیاس نہیں بجھتی۔ کیسے بجھ سکتی ہے، ہمارے جسموں میں خون ہو تو اس کی پیاس بجھے۔ کل رات تمہارے درد بھر نالے سن کر بیگم بہت گھبرا گئیں، کہنے لگی مجھ سے بچارے مچھروں کی یہ آہ وزاری نہیں دیکھی جاتی، ایک مچھر دانی لے آیئے۔ میں نے کہا کہ مچھر دانی لانے سے پہلے ان سے دو باتیں کروں گا۔ وہ ہمارے گھریوں ہی نہیں آتے، کچھ توقعات لے کر آتے ہیں۔ میں ان کی صحیح رہنمائی کروں گا اور یہی میرے اس خط کی شانِ نزول ہے۔

ننھے موسیقارو! چیل کے گھونسلے میں مانس کہاں؟ ہمارے پاس خون تھا، عمدہ صاف اور صحت مند خون لیکن پچھلے پندرہ سولہ برسوں میں مچھروں کی ایک نئ قسم نے جنم لیا۔ یہ مچھر بڑے موذی اور ستم شعار تھے، تم تو ان کے مقابلے میں فرشتے ہو، انہوں نے ہمارے جسم سے خون کی ایک ایک بوند نچوڑ دی۔ تم تو چند قطرے پی کر مطمئن ہو جاتے ہو۔ لیکن یہ نئے مچھر جب تک خون کا آخری قطرہ نہیں پیتے، تب تک چین سے نہیں بیٹھتے۔ پچھلے سولہ برسوں میں یہ حلقہ پریذڈنٹ کھڈ پنچ، وزیر اور ممبر اسمبلی کا بہروپ بھر بھر کر ہمارے خون سے اپنی پیاس بجھاتے

رہے۔ اب سترہ برس کے بعد ہماری یہ حالت ہوگئی ہے کہ رگوں میں
خون کی بجائے خوف دوڑ رہا ہے اور آنکھوں میں بینائی کی بجائے سیاہی
چھا گئی ہے، تم اگر پوری پوری رات بھی خون کے ایک قطرے کی تلاش
میں گزار دو گے تو بھی گوہر مقصود نہ پاؤ گے۔ تم اگر اپنی بھوک مٹانا
چاہتے ہو، تم اگر اپنی پیاس بجھانا چاہتے ہو تو عوام پر اپنا وقت ضائع نہ
کرو۔ پچھلے سولہ برسوں میں خواص کا ایک طبقہ وجود میں آیا ہے تم اسی
طبقے کی تلاش کرو۔ ان کے پاس چالیس لاکھ عوام کا خون ہے بے بس
بے کس اور مظلوم جنتا کا خون، انہیں ڈھونڈنے میں تمہیں زیادہ دقت نہ
ہوگی، یہ عالی شان محلوں میں رہتے ہیں، کاروں میں گھومتے ہیں، رات
گئے تک کلبوں اور تفریح گاہوں میں پھرتے رہتے ہیں۔ ان کی توندیں
باہر نکلی ہوتی ہیں۔ یہ پچھلے تیس برسوں میں نیشنل کانفرنس اور کانگریس
کے حلقہ پریذڈنٹ رہے ہیں۔ ممبر اسمبلی رہے ہیں، وزیر رہے ہیں۔
ٹھیکے دار رہے ہیں یا اب محکمہ تعمیرات عامہ میں انجینئر ہیں تم جب رات
کی تاریکیوں میں ان کے گھروں کا رُخ کرو گے تو ان کے گھروں کو
لوہے کی جالیوں سے محفوظ پاؤ گے۔ عوام کا خون پینے والوں نے اس
خون کی حفاظت کے لئے اپنے گھروں کی کھڑکیوں میں لوہے کی جالیاں
لگائی ہیں۔ جہاں جہاں تمہیں یہ جالیاں لگی ہوئی نظر آئیں، تم سمجھ لو کہ
یہی تمہاری منزل ہے۔ تمہیں مکان میں لگے ہوئے سمینٹ سے بھی خون
کی بو آئے گی۔ ان عالیشان عمارات کی ایک ایک اینٹ میں ہمارا خون
صرف ہوا ہے۔ ان کے باغیچوں میں کھلے ہوئے گلاب کی سرخی میں بھی
ہمارا خون شامل ہے۔ ان کے فربہ جسم اور ان کی خوشحالی کی حقیقتوں میں

ہمارے خوابوں کا خون شامل ہے۔ یہ لوگ بھی آج سے پندرہ سولہ سال پہلے تمہاری طرح اتنے نحیف دلاغر تھے کہ ہم لوگ مذاق میں انہیں مچھر کہا کرتے تھے لیکن پندرہ سولہ برسوں میں ان مچھروں نے بڑے بڑے ہاتھی نگلے ہیں۔ انہوں نے صرف ہمارا ہی نہیں شرافت، اخلاق اور مروت کا بھی خون پیا ہے۔ تم اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تم اگر اپنی آئندہ نسلوں کی بقا چاہتے ہو، تو ان کا خون چوسو، اس میں بڑی غذائیت اور توانائی ہے۔ ہمارے جسم میں اولاً خون ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو اس میں نہ کوئی غذائیت ہے نہ توانائی۔ زندہ رہنا چاہتے ہو تو میری نصیحت سن لو۔ پھر نہ کہنا کہ ہمیں خبر نہ ہوئی۔

فقط

چراغ بیگ

۱۹/اگست ۱۹۷۷ء

ڈویژنل کمشنر کشمیر کا خط

مدیر ''آئینہ'' کا جواب

محترم خان صاحب!

آپ کا ۱۱/اگست کا خط موصول ہوا۔ اپنی گونا گوں مصروفیات اور مشغولیات کے باوجود آپ نے مجھے یاد کیا، اس کرم فرمائی کے لیے آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ آپ نے اگر چہ اپنے خط میں دو دن کے اندر اندر جواب دینے کی تاکید کی تھی، لیکن میں جان بوجھ کر آپ کی مقررہ کردہ تاریخ کے پانچ دن بعد جواب دے رہا ہوں تا کہ آپ کو میرے خلاف ضابطے کی کاروائی کرنے کا موقع ملے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ ہماری ریاست کے افسرانِ اعلیٰ اس شہر کے صحافیوں کو سرکاری ملازم یا اخلاقی مجرم کیوں تصور کرتے ہیں اور ان کے نام تحریری نوٹس جاری کرتے وقت وہ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ماضی میں جو بھی صورت رہی ہو آج کل صحافت کے پیشے سے کچھ پڑھے لکھے، خود دار اور نڈر لوگ بھی وابستہ ہیں؟ بہر حال یہ ایک جملہ معترضہ تھا اور آپ کے نام میرے اس محبت نامے کا اصل مقصد آپ کے محبت نامے کا جواب دینا ہے۔

آپ کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو ''آئینہ'' کی ۹/اگست کی اشاعت میں صفحہ اول پر شائع شدہ ادارتی نوٹ آج ۹/اگست ہے پر اعتراض ہے اور آپ کی رائے میں یہ نوٹ غلط اور بے بنیاد ہے۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ اس نوٹ میں جنتا پارٹی اور عوامی مجلس عمل کے

حامیوں پر توڑنے جانے والے مظالم کی تفصیلات کا حقائق کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ آپ نے الزام عاید کیا ہے کہ اس قسم کے بیانات اس لئے سخت قابلِ اعتراض ہیں کہ ان کا مقصد حکومت اور انتظامیہ کو بدنام کرنا ہے۔ آپ نے اپنے خط مں یہ بھی انکشاف فرمایا ہے کہ آپ کے زیر تحویل ڈویژن میں لاء اینڈ آڈر کی صورتِ حال اطمینان بخش ہی نہیں قابلِ دید بھی ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ ماضی قریب میں دکان لوٹنے، گھر اجاڑنے یا فصلیں تباہ کرنے کا کوئی واقعہ آپ کی نوٹس میں نہیں آیا ہے اور آپ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں دو دن کے اندر اندر ایسے واقعات کی نشاندہی کروں، ورنہ میرے خلاف قانونی کاروائی کی جائے گی۔

ڈویژنل کمشنر صاحب! میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے میرے اخبار میں شائع شدہ ایک ادارتی نوٹ کا سرکاری سطح پر نوٹس لے کر میری عزت افزائی کی ہے۔ لیکن مجھے اجازت دیجئے کہ اظہار تشکر کی یہ رسم ادا کرنے کے بعد آپ کی کچھ غلط فہمیاں رفع کردوں۔ سب سے پہلے یہ نوٹ کیجئے کہ جو ادارتی نوٹ آپ کی طبع نازک پر گراں گزرا ہے، وہ خبر نہیں بہت سی خبروں کی بنیاد پر قایم کی گئی رائے ہے۔ یہ رائے صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی۔ لیکن اسے کسی صورت میں بھی قابلِ اعتراض قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس نوٹ میں خاکسار نے ۲۴ سال پہلے کے ۹/اگست سے موازنہ کیا ہے اور پچھلے ایک ماہ کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ظلم و تشدد اور لاقانونیت کے اعتبار سے ۱۹۷۷ء کا ۹/اگست ۱۹۵۳ء کے ۹/اگست سے بہت مختلف نہیں ہے یہ میری رائے ہے اور آپ کے خط سے ظاہر

ہوتا ہے کہ آپ کو میری رائے سے اختلاف ہے۔ اختلاف رائے کا یہ حق جمہوریت کی روح اور ہمارے پارلیمانی نظام کی اساس ہے۔ اخبار نویس کی حیثیت سے میں نے اپنا فرض انجام دیا اور ڈویژنل کمشنر کی حیثیت سے آپ نے۔ آپ کو شاید یہ سن کر تعجب ہو کہ ۲۴ برس قبل ۱۱راگست ۱۹۵۳ء کو اس وقت کے ڈویژنل کمشنر نے بھی وادی میں قانون کی صورت حال کے متعلق اسی اطمینان اور سکون کا اظہار کیا تھا، کہ جس کا آج آپ ۲۴ برس بعد کر رہے ہیں، حالانکہ اس وقت بھی وادی کے کونے کونے میں ظلم وتشدد کا دور دورہ تھا۔

آپ نے میرے ادارتی نوٹ سے نہ معلوم کہاں سے جنتا پارٹی اور عوامی مجلس عمل کا حلیہ دریافت کیا، جبکہ میں نے اس میں ایک بار بھی ان جماعتوں کا ذکر نہیں کیا ہے، میں نے تو صرف سیاسی مخالفین کا نام لیا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے مجرم ضمیر نے آپ کو مظلوموں کی شکل وشباہت پہچاننے میں مدد دی اور آپ میرا اشارہ سمجھ گئے۔ اس امر سے کم ازکم اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ۱۹۷۷ء کے ۹/اگست کو جب کسی مظلوم پر ڈھائے جانے والے مظالم کا تذکرہ ہوتا ہے تو کشمیر ڈویژن کا حاکم اعلیٰ سمجھ جاتا ہے کہ اس مظلوم کا تعلق ریاست کی جنتا پارٹی یا عوامی مجلس عمل سے ہوگا۔

آپ نے اپنے خط میں صرف اس الزام کی تردید کی ہے کہ عوامی مجلس عمل اور جنتا پارٹی کے حامیوں کی دکانیں اور مکانات لوٹے جارہے ہیں یا فصلیں تباہ کی جارہی ہیں۔ کیا میں اس سے یہ نتیجہ اخذ کروں کہ ادارتی نوٹ میں باقی جن مظالم اور ناانصافیوں کا ذکر ہے آپ ان کی تصدیق کرتے ہیں؟ آپ کی یاد تازہ کرنے کے لئے میں اس نوٹ

کا وہ حصہ نقل کر رہا ہوں کہ جسے آپ قابل اعتراض سمجھتے ہیں۔

"آج بھی ۹/اگست کا دن ہے اور آج ۲۴ سال بعد یہاں ایک بار پھر ظلم اور تشدد لاقانونیت اور بربریت کا دور دورہ ہے۔ دکانیں لوٹی جارہی ہیں فصلیں برباد کی جارہی ہیں۔ مکانوں پر پتھراؤ ہو رہا ہے بلاوجہ لوگوں کو گرفتار کیا جارہا ہے، میسا جیسے کالے قوانین کا بے تحاشہ استعمال ہورہا ہے۔شریف اور بے زبان لوگوں کو گالیاں دی جارہی ہیں ،سرکاری ملازمین عتاب کا شکار ہیں، سیاسی مخالفین کا جینا دوبھر کردیا گیا ہے اور قانون کے محافظ لاقانونیت کی حمایت کررہے ہیں"

الزامات کی اس طویل فہرست میں سے آپ نے صرف جنتا پارٹی اور عوامی مجلس عمل کے حامیوں کے مکانات دکانات اور فصلوں کے لوٹے جانے کی خبر پر اعتراض کیا ہے اور مجھ سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ میں اس قسم کے واقعات کی نشان دہی کروں ورنہ آپ میرے خلاف قانونی کاروائی کریں گے۔

محترم خان صاحب! آپ بڑے بھلے آدمی ہیں۔ میں آپ کی شرافت اور بلمنساہٹ کا قائل ہی نہیں اس کا عاشق بھی ہوں۔ مجھے آپ کی مجبوریوں اور معذوریوں کا بھی احساس ہے لیکن خدا کے لئے اپنی شرافت اور اپنے بھلے پن کو اپنا اعتبار اور وقار کم کرنے کے لئے استعمال نہ ہونے دیجئے۔ کیا آپ کو واقعی غنڈہ گردی، ظلم اور تشدد، لاقانونیت اور زبردستی کے ان واقعات کا کوئی علم نہیں کہ جو ۴/جولائی سے سرینگر اور وادی کے دوسرے حصوں میں رونما ہونا شروع ہوئے اور جن کا سلسلہ مکمل طور اب بھی ختم نہیں ہوا ہے؟ آپ بڑی معصومیت سے مجھ سے پوچھتے ہیں کہ یہ سب کچھ کب اور کہاں ہوا؟ میں اخبار نویس ہوں محکمہ

سی، آئی، ڈی کا ملازم نہیں ہوں۔ لیکن اگر آپ واقعی اپنی معلومات میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو پھر جنتا پارٹی کے مرکزی دفتر یا عوامی مجلس عمل کے سربراہ مولانا فاروق سے رجوع کیجئے ،وہاں آپ کو مظلوم انسانوں اور مجروح مکانوں کے نام اور پتے ہی نہیں، تصاویر بھی دکھائی جائیں گی، آپ کو شاید علم نہ ہوکہ مظلومین اور مجروحین کی کئی فہارس خود وزیراعلیٰ کی خدمت میں بھی پیش کی جا چکی ہیں اور اس کے باوجود آپ بڑے معصوم بن کر یہ شکوہ کرتے ہیں کہ آپ کی نوٹس میں کوئی ایسا واقعہ نہیں آیا ہے۔ اسے آپ کی سادگی سے تعبیر کروں یا آپ کی مجبوری کا نام دوں؟

آپ کوکم ازکم اس بات کا علم تو ہوگا کہ پچھلے ایک ڈیڑھ ماہ کے دوران بہت سے لوگوں کا بلاوجہ گرفتار کیا گیا ہے، آپ اس سے تو انکار نہیں کر سکتے کہ موجودہ حکومت نے اقتدار سنبھالتے ہی میسا(Misa) کا بے دریغ استعمال کیا ہے اور ابھی تک کشمیر موٹر ڈرائیورس ایسوسی ایشن کے کئی اراکین اسی کالے قانون کے تحت نظر بند ہیں۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ وادی کے کونے کونے میں سرکاری ملازمین کو سخت ہراساں کیا جارہا ہے۔ انتقام گیری کے جذبے کے تحت چھوٹے درجے کے سرکاری ملازمین کو دور دراز مقامات پر تبدیل کیا جارہا ہے آپ کو اگر یہ سب کچھ معلوم نہیں ہے تو میں کہوں گا کہ آپ ڈویژنل کمشنری کے منصب پر فائز ہونے کے اہل نہیں ہیں اور اگر آپ سب کچھ جان کر بھی انجان بن رہے ہیں۔ تو پھر آپ جلد ہی ترقی پانے کے مستحق ہیں۔

خان صاحب! آپ کس کس بات کی تردید کرتے پھریں گے؟ میرا مشورہ یہ ہے کہ یہ کام آپ اخبار ''ولر'' اور ''نوائے صبح'' کو سپرد

کر دیجیے۔ وہ اخبار نویس اور سرکاری وکیل ہونے کے ناطے یہ فرض پہلے
سے ہی انجام دے رہے ہیں۔ آپ اس چکر میں کیوں پڑ رہے ہیں؟ آپ
نے مجھے وارننگ دی ہے کہ اگر میں نے اپنے الزامات کو صحیح ثابت نہیں کیا
تو آپ میرے خلاف مناسب کاروائی کریں گے۔ میں نہیں جانتا کہ
مناسب کاروائی سے آپ کا کیا مقصد ہے؟ لیکن آپ کے لب و لہجے سے
یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اور آپکی سرکار اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ ابھی تک
اس ملک پر ایمرجنسی نافذ ہے اور اخبار نویسوں کو مناسب کاروائی کی دھمکیوں
سے مرعوب کیا جاسکتا ہے۔ میں آپ کی اور آپ کی سرکار کی یہ غلط فہمی دور
کرنا چاہتا ہوں۔ ہم اخبار نویسوں کو اپنے حقوق کا علم بھی ہے اور ان کے
صحیح استعمال کا سلیقہ بھی.. اور یہ کام آپ ہم پر ہی چھوڑ دیجیے کہ ہم کس
طرح کس زبان اور کس لب و لہجے میں عوامی مسایل کا ذکر اور کس انداز
سے حکومت پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ آپ اپنا کام کیجیے اور اپنے فرائض
نبھائیے۔ اس سے ریاست اور سیاست میں توازن قائم رہے گا۔

ہاں ایک اور بات کا بھی جواب دیجیے آپ نے جو میرے اخبار میں
شایع شدہ ایک ادارتی نوٹ سے اختلاف کیا ہے، تو کیا میں اس سے یہ
نتیجہ اخذ کروں کہ آئینہ میں شائع ہونے والی دوسری خبروں کی صحت اور
صداقت پر آپ کو کوئی اعتراض نہیں۔ آپ کے رویے سے تو یہی ظاہر ہوتا
ہے اور اس عنایت کے لیئے میں آپ کا بے حد مشکور ہوں۔

فقط، آپ کا

مدیر ''آئینہ''

۲۵/اگست ۱۹۷۷ء

محترم شیخ صاحب کے نام

(خواجہ غلام محمد صادق مرحوم کا خط)

محترم شیخ صاحب!

جنت سے میرا یہ خط پاکر آپ ضرور حیران ہوں گے، کہ مجھ جیسے بے اعتقاد، نافرمان، سیکولر اور کمیونسٹ قسم کے مسلمان کو یہاں داخلہ کیسے مل گیا۔ میں اللہ تعالیٰ کی اس نوازش پر خود بھی حیران ہوں اور اس کا بے حد شکر گذار ہوں کہ میری تمام کوتاہیوں، نافرمانیوں اور گستاخیوں کے باوجود اس نے مجھے جہنم کی آگ میں دھکیلنے کی بجائے جنت کی پُرکیف اور ٹھنڈی فضاؤں سے لطف اندوز ہونے کی سعادت بخشی، دراصل بات یہ ہے کہ خدائی دربار میں انسانوں کو ان کے قول سے زیادہ ان کے فعل اور ان کے گفتار سے زیادہ ان کے کردار کی بنیاد پر جانچا جاتا ہے اور یہ رب العزّت کا کرم ہے کہ اس نے ہمارے افعال اور ہمارے کردار کی بناء پر ہمیں جنت میں داخلے کے اہل سمجھ کر یہاں کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا۔ یہ تو آپ سن ہی چکے ہوں گے کہ بخشی صاحب بھی یہیں ہیں۔ لیکن آپ نے ابھی یہ نہیں سنا ہوگا کہ ڈی پی صاحب بھی ہمارے ہی ساتھ ہیں۔ اس کافر نے اپنی چرب زبانی سے نہ معلوم رضواں کو کیسے بس میں کر لیا اور اب ہم تینوں ایک ساتھ باغِ بہشت میں اپنے ذوق چمن بندی کی تسکین کر رہے ہیں۔ یہاں کے محکمہ اطلاعات سے کشمیر کے سیاسی حالات کے متعلق بڑی خوش

کن خبریں موصول ہو رہی ہیں اور میں ڈی، پی اور بخشی صاحب، تینوں بدلے ہوئے اور بدلتے ہوئے حالات سے خوب لطف لیتے ہیں، کل جب بخشی صاحب نے بتایا کہ وہ آپ کے نام دو خط لکھ چکے ہیں تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ تازہ ترین حالات کے متعلق میں بھی آپ کو اپنے تاثرات سے آگاہ کردوں، میرے اس خط کی یہی شان نزول ہے۔

قبلۂ محترم! مجھے اس امر کی اطلاع مل چکی ہے کہ جس طرح آپ نے بخشی صاحب کی موت پر نہ صرف یہ کہ ان کے جنازے میں شرکت نہیں کی بلکہ اظہار تعزیت کے لیے دو لفظ کہنے سے بھی گریز کیا، ٹھیک اسی طرح آپ نے میری موت پر بھی اظہار افسوس کرنے کی دنیاوی رسم نبھانے سے انکار کردیا اور اس طرح آپ نے دنیا کو یہ تاثر دیا کہ آپ میری اور بخشی صاحب کی موت کے بعد بھی ہم سے ناراض ہیں۔ اس کے برعکس ڈی، پی صاحب کی موت پر آپ نے اپنی آہ وبکا سے آسمان سر پر اٹھا کر یہ ثابت کردیا کہ آپ کی ناراضگی کا کسی سیاسی اصول اور نظریے سے کوئی تعلق نہیں اور یہ محض آپ کی ایک جذباتی کیفیت اور آپ کی انا کا اظہار ہے۔ اس کا تازہ ترین ثبوت، ریاستی کانگریس کے تیئں آپ کا وہ انتہائی خوشگوار اور مصالحت آمیز رویہ ہے کہ جس کا مظاہرہ آپ نے ابھی چند دن پہلے داچھی گام کی خوبصورت وادی میں کیا۔

محترم شیخ صاحب! ذاتی طور پر میرے متعلق آپ کا جو بھی رویہ رہا ہو، مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے کانگریس لیجسلیچر پارٹی کے ممبران کو چائے کی دعوت پر مدعو کر کے انہیں یہ بتایا کہ کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے درمیان منزل، مقاصد اور نظریات کی

کس درجہ ہم آہنگی ہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق آپ نے انہیں متحد اور متفق ہو کر عوام کے فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے کی پیش کش کی ہے اور اگر میری اطلاع صحیح ہے تو آپ نے سیکولرازم اور سوشلزم پر کانگریس کے گہرے وشواس کا ذکر کرتے ہوئے جواہر لال نہرو اور مسز گاندھی کے رول کو بہت سراہا۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نے ریاست میں کانگریس کے مضبوط کاڈر کی بھی تعریف کی اور کہا کہ حالیہ انتخابات میں شکست کھانے کے باوجود انہیں حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔ معتبر ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ نے مسز اندرا گاندھی کو سرینگر کی پارلیمانی نشست سے انتخاب لڑ کر پارلیمنٹ میں داخل ہونے کی دعوت دی ہے۔ یہ ساری باتیں ہمارے لیے اتنی خوش کن اور حیران کن ہیں کہ ان پر یقین کرنا مشکل ہے اور کم بخت ڈی پی کا تو خیال ہے کہ یہ سب جنت کے افواہ بازوں کی کرامت ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ جنت کا محکمہ اطلاعات خواجہ صدر الدین مجاہد کی تحویل میں نہیں ہے کہ یہاں سے غلط اور بے بنیاد پریس نوٹ جاری کیے جائیں۔ یہاں صرف سچی باتوں ہی کا چلن ہے اور ہم نے جو کچھ سنا ہے وہ یقیناً غلط نہیں ہو سکتا۔ آپ کے خیالات، نظریات، رجحانات، میلانات اور اعلانات میں اس انتہائی خوشگوار تبدیلی پر اپنی بے پناہ مسرت کا اظہار کرتے ہوئے ہم تینوں (بخشی صاحب، ڈی۔پی اور خاکسار) کو صرف اس بات کا افسوس ہے کہ آپ سیدھی سادھی اور معمولی سی بات کو سمجھنے میں اتنی دیر کیوں لگاتے ہیں؟ جس بات کو سمجھنے اور سمجھانے میں معمولی سوجھ بوجھ کے آدمی کو پانچ یا دس منٹ لگتے ہیں اسے سمجھنے میں آپ کو دس بیس سال کی طویل مدت کیوں لگتی ہے۔ آپ سیاسی معاملات

میں بچوں کی طرح ضد کر کے پوری قوم کو عذاب میں کیوں مبتلا کرتے ہیں؟ اب آپ ہی بتایئے کہ ۱۹۵۳ء میں آپ نے کس بات پر ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ میں نے بخشی صاحب اور ڈی۔ پی صاحب نے آپ سے کہہ دیا تھا کہ کشمیر کا ہندوستان سے الحاق ایک ایسی اٹل تاریخی حقیقت ہے کہ نہ اسے بدلایا جاسکتا ہے اور نہ اس کا بدلا جانا ہماری ریاست کے مفاد میں ہے۔ لیکن آپ اڑ گئے کہ یہ الحاق عارضی ہے اور اس کا حتمی فیصلہ رائے شماری کے ذریعے ہونا چاہیئے۔ ہم نے آپ کو لاکھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن آپ کی ضد اور ہٹ دھرمی کے سامنے ہماری کچھ پیش نہ چلی۔ لیکن بائیس سال تک رائے شماری، حق خودارادیت اور خودمختاری کا راگ الاپنے کے بعد بالآخر آپ نے وہی بات قبول کر لی کہ جسکو تسلیم کرنے پر آپ کسی طرح آمادہ نہ ہوتے تھے۔ یعنی جو بات ہم لوگ بائیس سال پہلے سمجھ چکے تھے اور جسے ایک تاریخی حقیقت سمجھ کر ہم نے اس پر ایمان لایا تھا اسے سمجھنے اور اس پر ایمان لانے کے لئے آپ کو اور محترم بیگ صاحب کو پورے بائیس سال لگے اور خدا کا شکر ہے کہ اب آپ کی نظروں میں کشمیر کا ہندوستان سے الحاق اٹل اور ناقابل تنسیخ ہے۔ اے کاش! یہی بات آپ نے آج سے بائیس سال پہلے مانی ہوتی تو پوری قوم کو اس عذاب اور اذیت سے نجات مل گئی ہوتی کہ جس سے گذر کر اسے اپنی موجودہ منزل تک پہنچنا پڑا۔ اب یہی کانگریس کا مسئلہ لیجئے اور سوچئے کہ آپ نے اپنے ساتھ اس قوم کے ساتھ اور ہمارے ساتھ کتنی بڑی ناانصافی کی ہے۔

میرے محترم! ۱۹۶۵ء میں جب میں نے قاسم صاحب نے اور ڈی۔ پی نے کشمیر میں کانگریس قایم کی، تو یہ کانگریس کے شباب کا

زمانہ تھا۔ اس وقت کانگریس صحیح معنوں میں ملک کی سب سے محترم، معتبر اور نمائندہ سیاسی جماعت تھی۔ جواہر لال نہرو کو مرے ابھی صرف ایک سال کا عرصہ گذرا تھا اور کانگریس کی تمام سیاسی، اقتصادی اور معاشی پالیسیوں پر جواہر لال نہرو کی چھاپ تھی۔ اٹھارہ سال تک حکمران جماعت رہنے کے باوجود کانگریس اس وقت بھی اپنی مقبولیت اور عوامی اساس کے اعتبار سے سب سے مضبوط اور مستحکم جماعت تھی اور اس پر کوئی ایسی تہمت یا الزام عاید نہیں ہوا تھا کہ جسکی بناء پر اس کا مستقبل مشکوک اور مخدوش دکھائی دیتا۔ لیکن ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ اس کانگریس کو جب ہم نے ریاست میں درآمد کیا تو آپ آگ بگولہ ہو گیے اور آپ نے ہمیں قابل گردن زدنی قرار دیکر ہمارے خلاف ترک موالات کی تحریک چلا دی۔ کانگریس کے سینکڑوں کارکنوں پر حقہ پانی بند کر دیا گیا۔ مسجدوں میں ان کے داخلے پر پابندی عاید کی گئی۔ حجاموں نے کانگریسیوں کی حجامت بنانے سے انکار کر دیا۔ کئی مقامات پر گاؤں والوں نے کانگریسی مُردوں کا جنازہ نہیں پڑھا۔ سماجی بائیکاٹ کی اس تحریک نے ایسی شدت اختیار کی کہ دکان داروں نے کانگریسیوں کو اشیاء ضروری بیچنے سے بھی انکار کر دیا۔ مسجدوں میں واعظوں نے کانگریسیوں کے خلاف حکم کفر جاری کر کے انہیں دایرہ اسلام سے خارج کر دیا۔ الغرض سیاسی اور سماجی بائیکاٹ کا یہ حربہ استعمال کر کے آپ نے کانگریس کو ریاست بدر کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ آج سے بارہ سال پرانی بات ہے۔ ان بارہ سالوں کے اندر کانگریس میں وہ ساری برائیاں پیدا ہو گئیں کہ جو تیس سال تک اقتدار سے وابستہ رہنے سے

ایک سیاسی جماعت میں پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اور خاص طور پر پچھلے دو سال کے دوران مسز اندرا گاندھی نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کر کے جواہر لال نہرو کی قایم کردہ روایات کو خاک میں ملا دیا۔ خاندانی منصوبہ بندی اور ڈسپلن کے نام پر ملک کے لاکھوں لوگوں پر ایسے ایسے مظالم توڑے گئے کہ ہم لوگوں کو اس احساس سے بھی شرمندگی ہونے لگی کہ ہم کبھی اس تنظیم سے وابستہ رہ چکے ہیں، جس کانگریس حکومت نے ترکمان گیٹ اور مظفرنگر میں سینکڑوں مسلمانوں کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا جن شہری آزادیوں اور بنیادی حقوق کی خاطر مہاتما گاندھی جواہرلال نہرو ابوالکلام آزاد اور دوسرے سرکردہ رہنماؤں نے اپنی زندگی کے بہترین سال جیلوں میں گذارے تھے، انہیں مسز گاندھی نے اپنے اور اپنے بیٹے کے اقتدار کے لیے پاؤں تلے روندد یا اور اب اس وقت جبکہ کانگریس کی یہ حالت ہے کہ اسکے بہترین جرنیل اور سپاہی اسے چھوڑ کر ادھر اُدھر جا رہے ہیں، آپ نے اس کے ساتھ دوستی اور مفاہمت کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ عین اس وقت جبکہ کانگریس اصولوں اور آورشوں کی بجائے چند افراد کی طالع آزمائی کا مرکز بن گئی ہے۔ آپ کو نیشنل کانفرنس اور کانگریس میں اصولوں کی مماثلت اور مطابقت نظر آنے لگی ہے۔ تعجب ہے کہ جب کانگریس میں چالیس چالیس پچاس پچاس سال گذارنے والے بھی اس جماعت کے حال اور مستقبل سے مایوس ہو کر اسے چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ہیں، آپ جنتا پارٹی کی ضد میں کانگریس ہی نہیں بلکہ برہمانند ریڈی جیسے کانگریسی لیڈروں سے بھی اظہار عشق کرنے لگے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں شیخ صاحب! کہ آج بارہ برس بعد کانگریس کی

خوشنمائی اور خوبصورتی میں کونسا ایسا اضافہ ہوا ہے کہ آپ اس پر بُری طرح فریفتہ نظر آرہے ہیں جب کانگریس واقعی حسین اور خوشنما تھی، تب تو آپ نے ہمیں اس سے وابستگی کی پاداش میں مرتد اور کافر قرار دیا۔ آج اس کافرہ میں کونسا ایسا حسن نظر آیا ہے کہ آپ نے اسے اپنے ایمان کا سہارا بنانے کا اعلان کر دیا ہے ۔ کانگریس کے اصولوں اور اسکے مقاصد کی جو خوبصورتی ہمیں بارہ پندرہ سال پہلے نظر آتی تھی وہ آپ کو آج بارہ پندرہ سال بعد کیوں نظر آنے لگی؟ کیا آپ اپنی اس عادت اور روایت کو برقرار رکھنے پر بضد ہیں کہ آپ سیدھی سادھی باتوں کو سمجھنے اور تسلیم کرنے میں کم سے کم دس بارہ سال لگائیں گے۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ جو بات پیر غیاث الدین اور نور محمد کو دس سال پہلے سمجھ میں آئی ہے وہ آپ جیسے بلند قامت، کہنہ مشق اور تجربہ کار رہنما کو دس سال بعد سمجھ میں آئی ہے۔ جن باتوں کے لئے آپ نے بخشی صاحب اور مجھ کو غدار اور وطن فروش کہا تھا، مجھے خوشی ہے کہ آج وہی باتیں آپ کے ایمان کا جزو اور آپ کے اقتدار کی بنیادیں ہیں افسوس صرف اس بات کا ہے کہ آپ خرابیٔ بسیار کے بعد وہی کچھ کرتے ہیں کہ جو آپ کو بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔ آپ نے آج کی مریض اور نحیف کانگریس کے متعلق جو کچھ آج کہا ہے وہ اگر بارہ سال پہلے اس تندرست، توانا اور صحت مند کانگریس کے متعلق کہتے کہ جسے ہم کشمیر میں لائے تھے، تو آج ریاست کی تاریخ مختلف ہوتی...

بہر کیف، دیر آید درست آید کے مصدرق
ہم آپ کی اس نئی سوچ کا بھی خیر مقدم کرتے ہیں

❀❀❀

۴ر ستمبر ۱۹۷۷ء

طارق عبداللہ کے نام

محترم طارق صاحب!

اس خاکسار کی طرف سے ایک بار پھر ٹورسٹ ڈیولپمنٹ کارپوریشن کا مینجنگ ڈائریکٹر بننے پر مبارکباد قبول کیجئے۔ پچھلے ایک ڈیڑھ ماہ سے یہ اطلاعات آرہی تھیں کہ قبلہ شیخ صاحب اب کی بار آپ کو کارپویشن کی ذمہ داریاں سونپنے پر آمادہ نہیں ہیں اور ادھر آپ اسی ایک منصب پر فائز ہونے کیلئے بضد ہیں۔ اب آپ کی تقرری سے ثابت ہو گیا ہے کہ باپ اور بیٹے کی کش مکش میں بیٹا جیت گیا ہے، یا یوں کہیے کہ وزیراعلیٰ کے فرض اور ایک باپ کی محبت کے درمیان جنگ میں ایک باپ کی محبت جیت گئی ہے اس مرحلے پر مجھے نہ معلوم کیوں بے اختیار فلم ''مغل اعظم'' کے کچھ ڈائیلاگ یاد آرہے ہیں۔ بہرحال یہ موقع غیر سنجیدہ باتوں کا نہیں ہے۔ آیئے آپ سے کچھ سنجیدہ سلجھی ہوئی کام کی باتیں کریں۔

میرے بھائی! کاروبار حکومت میں کسی کا افسر بننا اور کسی کا بن کر بگڑنا کوئی نئی بات نہیں۔ یہ سلسلہ اس وقت سے جاری ہے کہ جب سے حکومتیں وجود میں آئی ہیں اور جب تک قائم رہے گا کہ جب تک حکومتوں کا نظام چلتا رہے گا۔ اس لیے آپ کا ایک محکمے کا سربراہ بننا بظاہر کوئی ایسی غیر معمولی بات یا نادر تاریخی واقعہ نہیں ہے کہ جسے بحث،

تنقید یا غور وفکر کا موضوع بنایا جائے، لیکن اسکے باوجود آپ کے تقرر پر بڑی چہ مہ گوئیاں، سرگوشیاں اور کانا پھوسیاں ہونگی۔ کچھ لوگ دبی زبان سے، کچھ کھل کر، کچھ اشاروں اور کنایوں میں آپ کے مینجنگ ڈائریکٹر بنائے، آنے پر اپنی ناراضگی اور بدگمانی کا اظہار کریں گے، بہت سے لوگ آپ کے والدِ محترم کے خوف، ان کے لحاظ اور اپنے انجام کے ڈر سے اپنے جذبات اور ردِعمل کو سات پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے آپ کو یہ بتائیں گے کہ آپ اس اہم منصب کیلئے سب سے زیادہ موزون اور مناسب شخصیت ہیں۔ لیکن رات کی تنہائیوں اور اپنی خلوت گاہوں میں وہ جو کچھ کہیں گے اسے سن کر آپ اور شیخ صاحب دونوں یقیناً خوش نہیں ہوں گے۔ میری خواہش ہے کہ آپ اپنے تقرر کے خلاف عوامی ردعمل اور بے اطمینانی کے ان محرکات کو محض دشمنوں کی سازش اور سیاسی مخالفوں کے پروپاگنڈا کا نتیجہ قرار دے کر اسے نظر انداز نہ کریں، بلکہ اسے سمجھنے کی کوشش کریں اور اپنے کردار، گفتار اور طرزِ عمل سے اس ردِعمل اور بے اطمینانی کی شدت کو کم کریں۔

طارق صاحب! آپ لاکھ چاہیں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے، کہ ٹورسٹ ڈیولپمنٹ کارپوریشن جیسے اہم سرکاری ادارے کا سربراہ بننے کے لئے آپ کے پاس صرف ایک ہی کوالی فکیشن ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ وزیراعلیٰ کے فرزند ہیں۔ میں جانتا ہوں اور مانتا ہوں کہ وزیراعلیٰ کا فرزند ہونا کوئی معمولی کوالی فکیشن نہیں ہے اور اس اہلیت کے سہارے بہت سے وزراء اعلیٰ کے بہت سے فرزندوں نے بڑے اہم کارنامے انجام دئے ہیں، لیکن معاف کیجئے محض وزیراعلیٰ کا بیٹا ہونے

کی وجہ سے کارپوریشنوں کا مینجنگ ڈائریکٹر بننا بھی کوئی بڑی قابل فخر بات نہیں ہے۔ آپ کے دو بھائی ڈاکٹر ہیں۔ ان کے والد جب وزیراعلیٰ نہیں تھے وہ تب بھی ڈاکٹر تھے اور آج بھی ڈاکٹر ہیں اور ان کے ڈاکٹر ہونے پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں اس لیے کہ ان کے ڈاکٹر ہونے کا شیخ صاحب کے وزیر اعلیٰ ہونے سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اس کے برعکس آپ دو سال قبل اس وقت ٹورسٹ ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے مینجنگ ڈائریکٹر بن گئے کہ جب پہلے شیخ صاحب وزیراعلیٰ بن گئے اور اس سال اپریل میں جب شیخ صاحب وزیراعلیٰ نہیں رہے تو آپ کو بھی اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔ اب جب وہ پھر وزیراعلیٰ بن گئے ہیں، تو آپ کو پھر ٹورسٹ ڈیولپمنٹ کارپوریشن کا مینجنگ ڈائریکٹر بنایا گیا۔ اس تغیر وتبدل سے صرف یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آپ کے تقرر کا آپ کی صلاحیتوں اور اہلیتوں سے نہیں بلکہ آپ کے والد محترم سے تعلق ہے۔ آپ کی یہی سب سے بڑی خوبی آپ کی سب سے بڑی کمزوری بن گئی ہے اور اسی لیے آپ کے تقرر پر آج سے دو سال پہلے بھی اور آج بھی بڑی سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ آپ کے اس انتخاب کے ساتھ ایک بنیادی اصول وابستہ ہے اور عام لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کے تقرر سے اس بنیادی اصول کی تکذیب، تذلیل، تردید اور تحریف ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا سرکاری ملازمتوں اور مینجنگ ڈائریکٹر جیسے کلیدی منصوبوں کے لیے افراد کا انتخاب کرنے کے لئے کوئی اصول اور معیار مقرر ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو کیا آپ کا انتخاب کرتے

وقت ان اصولوں اور معیاروں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ اگر ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ پر ایک استاد بننے کے لئے بی، اے اور ایم، اے پاس نوجوانوں کو درجنوں بار ریکروٹمنٹ بورڈوں کے سامنے انٹرویو دینا پڑتے ہیں، تو کیا دو ہزار روپے ماہانہ تنخواہ پانے والے مینجنگ ڈائریکٹر کے لئے تعلیمی قابلیت اور دوسری اہلیتوں کا ہونا ضروری نہیں۔ وہ یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ آپ کی ان صلاحیتوں کا امتحان کس نے اور کب لیا؟ میں جانتا ہوں کہ ہر باپ کی نظر میں اس کا اپنا بیٹا افلاطون ہوتا ہے۔ لیکن آپ کا باپ صرف باپ ہی نہیں، ایک وزیراعلیٰ بھی تو ہے اور وزیراعلیٰ بھی ایسا ویسا نہیں، شیخ محمد عبداللہ کے قدوقامت اور مرتبے کا وزیراعلیٰ کہ جسے لوگ سیاسی رہنما ہی نہیں، ایک مذہبی بزرگ بھی مانتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کی بے پناہ صلاحیتوں اور اہلیتوں سے بے حد متاثر ہوں، لیکن ان کا ذاتی طور متاثر ہونا ملازمتوں کے لیے افراد کے انتخاب کا معیار کیوں کر بن سکتا ہے؟ یہی ایک بنیادی سوال ہے کہ جس سے آپ کی تقرر کی اخلاقی اور قانونی حیثیت وابستہ ہے ورنہ آپ سے کسی کو کوئی ذاتی پرخاش یا چڑ نہیں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس ریاست میں آپ سے زیادہ قابل، تعلیم یافتہ، تجربہ کار اور باصلاحیت نوجوان موجود ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ آپ سے زیادہ بہتر طریقے پر کارپوریشن کو چلا سکتے ہیں وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ تعلیم، تجربے اور اہلیت کے اعتبار سے آپ ان کے مقابلے میں کچھ نہیں ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سبھی دعوے غلط ہیں اور اس منصب کے لئے آپ سے زیادہ کوئی موزوں شخصیت نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان سب

لوگوں کی زبانیں بند کیسے کی جاسکتی ہیں؟ اگر منیجنگ ڈائریکٹر شپ کے لئے کوئی انٹرویو ہوا ہوتا، کوئی مقابلے کا امتحان منعقد ہوا ہوتا، خالص تجربے کی بنیادوں پر انتخاب ہوتا، تو پھر کسی کو بات کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ لیکن آپ کے تقرر کا فرمان تو قصر شاہی سے بغیر کسی انٹرویو، امتحان یا مقابلے کے جاری ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے جاری ہوتے ہی زبانیں مشینوں کی طرح چلنے لگی ہیں۔

برادر عزیز! جو ہوا، سو ہوا، بھول جایئے کہ آپ کا تقرر جائز ہے یا ناجائز، یہ بات بھی رہنے دیجئے کہ اس سے خوش کون ہے اور ناراض کون ہے۔ اب اس بات پر توجہ دیجئے کہ آپ کو اپنے نئے منصب کی ذمہ داریاں کس طرح نبھانی ہیں۔ آپ نے اپنے پچھلے دورِ اقتدار میں بلاوجہ اور بے مقصد بہت سے لوگوں کو ناراض کر کے اپنی امیج خراب کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پانچ ماہ قبل آپ کے مستعفی ہونے پر کارپوریشن کے ملازموں نے چراغاں کر کے اپنی خوشی اور مسرت کا اظہار کیا۔ میں نہیں چاہتا کہ اب کی بار بھی آپ اپنی پرانی روش پر قائم رہ کر اپنے ماتحتوں اور اپنے ساتھ کام کرنے والے افسروں کا قافیہ تنگ کردیں۔ آپ کو ایک لمحے کے لئے بھی یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ آپ کے اچھے کام کا کریڈٹ بھی شیخ صاحب کو جائے گا اور آپ کے بُرے کام کی بدنامی انہی سے منسوب کی جائے گی۔ اس لیے اپنے عالیشان دفتر کی چاردیواری میں بیٹھ کر اپنے آپ کو ہٹلر اور فرعون نہیں، شیخ صاحب کا پبلک ریلشیز آفیسر سمجھ لیجئے۔ اپنے ماتحتوں، عام لوگوں اور دوسرے افسروں کے مسائل اور ان کے دکھ درد کو سمجھنے کی کوشش کیجئے اور انسان

بن کر ان مسائل کو حل کرنے میں لگ جایئے۔ یہ وہم اپنے ذہن سے نکال دیجیئے کہ آپ کسی بنیے کی دکان پر بیٹھے ہیں کہ جہاں آپ کا کام نفع ونقصان کا میزان تیار کرنا ہے۔ حکومتیں کاروباری اداروں کی طرح صرف نفع ونقصان کیلیئے نہیں عام لوگوں کی فلاح وبہبود کیلیئے چلائی جاتی ہیں۔ آپ لوگوں کو کاروبار اور روزگار مہیا کرنے کے بجائے انہیں بے کار اور بے روزگار نہ بنائیں، جیسا کہ آپ نے پچھلے دو سال کے دوران کیا ہے۔ اب کی بار اس بات کی کوشش کیجیئے کہ وہ لوگ بھی آپ سے خوش ہوں جو پچھلی بار آپ سے ناراض تھے۔ آپ کے کارپوریشن کو سنبھالنے سے وہاں کے ملازمین ہیں جو خوف وہراس پیدا ہو گیا ہے اسے دور کر دیجیئے، اور اس معاملے میں کم از کم اپنے بھائی ڈاکٹر فاروق سے کچھ سیکھیئے کہ جس کی خوش اخلاقی اور نرم گفتاری کی اسکے دشمن بھی تعریف کرتے ہیں۔ آپ یہ کہیں گے کہ کارپوریشن میں کام کرنے والے سبھی چور اور بے ایمان ہیں اور اسی لئے وہ آپ جیسے ایمان دار اور دیانت دار افسر سے خائف ہیں۔ میرے بھائی! کون ایمان دار ہے اور کون بے ایمان؟ کون چور ہے اور کون نہیں ہے۔ یہ بڑا مشکل سوال ہے۔ خود آپ کا تقرر ایمانداری اور اخلاقی دیانت کا کون سا بڑا مظاہرہ ہے کہ آپ اس کے برتے پر اور لوگوں کی بے ایمانیوں اور بداعمالیوں کا جائزہ لیتے پھریں، چپ چاپ کر کے اپنا کام کیجیئے اور اپنی اس خوش بختی کیلیئے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجیئے کہ آپ شیخ صاحب کے فرزند ہیں۔ ورنہ اس شہر میں کتنے ہی طارق در در کی ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں۔

❀❀❀

۱۴/ستمبر ۱۹۷۷ء

ہدایت نامہ ممبران اسمبلی

(نیشنل کانفرنس)

میرے پیارو!

اسمبلی کے ایوان میں داخل ہونے پر میری دلی مبارک باد قبول کرلو، تم میں سے اکثریت چونکہ ان لوگوں کی ہے کہ جو پہلی بار چن کر آئے ہیں، اس لیے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ ٹورسٹ گائیڈ کی طرز پر تمہارے لیے ایک گائیڈ مرتب کرکے اسے ہدایت نامہ کے عنوان سے اخبار میں شایع کردوں، تاکہ تم لوگوں کو اپنے روزمرہ کے فرائض انجام دینے یں کسی قسم کی مشکل پیش نہ آئے۔

ہدایت نمبر ۱: نائٹ سوٹ اور باتھ روم چپل پہن کر اسمبلی ہال میں نہ جانا۔ یہ اگرچہ قانوناً منع نہیں ہے لیکن اسمبلی ہال کے پہریدار آپ کو کسی ممبر اسمبلی کا خانساماں سمجھ کر اندر جانے سے روکنے کی کوشش کریں گے۔

ہدایت نمبر ۲: اسمبلی ہال میں ٹھیک ساڑھے نو بجے پہنچ جانا۔ دیر سے پہنچو گے تو سپیکر صاحب ناراض ہو جائیں گے۔

ہدایت نمبر ۳: چپ کے بیٹھے رہنا، زبان کھولنے کی کوشش نہ کرنا اور اگر کسی وقت زبان کھولنا ضروری بن جائے تو شیر کرے گا، شیر کرے گا، کہہ کر خاموش رہنا۔

ہدایت نمبر ۴: جس وقت وزیر اعلیٰ جناب شیخ صاحب ایوان

میں داخل ہوں، تم سب لوگ کھڑے ہو کر اس وقت تک ''آ گیا جی آ گیا'' شیر ببر آ گیا، کے نعرے بلند کرتے رہنا جب تک کہ شیخ صاحب مسکراتے ہوئے آپ کو بیٹھ جانے کا اشارہ نہ کریں۔ اس ہدایت کا اطلاق جناب سپیکر صاحب پر بھی ہوتا ہے۔

ہدایت نمبر ۵ : ایوان کی کاروائی کے دوران سپیکر کی طرف نہ دیکھنا، ٹرانسپورٹ کے وزیر خواجہ غلام محمد شاہ کی طرف بار بار دیکھنا اور جو کچھ کرنے کا وہ اشارہ دیں وہی کرتے رہنا ورنہ تمہاری ممبری کو سخت خطرہ لاحق ہے۔

ہدایت نمبر ٦ : یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا کہ تمہیں یہاں زیر بحث مسایل پر اظہار خیال کرنے کے لئے نہیں لایا گیا ہے اس لیے کسی مسلئے پر اظہارِ خیال کی حماقت نہ کرنا۔

ہدایت نمبر ۷ : اگر کبھی کسی مسئلے پر زبان کھولنے کی ضرورت پڑ ہی جائے تو اپنی تقریر کے آغاز میں قائداعظم حضرت شیر کشمیر کی بے پناہ تعریف کرو اور آخر میں ٹرانسپورٹ اور سپلائی کے وزیر خواجہ غلام محمد شاہ کا قصیدہ پڑھ لو۔ بیچ بیچ میں شاہ صاحب کے برادر اصغر محی الدین شاہ کی طرف دیکھتے جاؤ۔ اگر وہ مسکرا رہے ہیں تو تقریر ٹھیک ہے، ورنہ یہ سمجھ لو کہ تم خطرناک راستے پر جا رہے ہو۔ اس لئے فوراً موڑ کاٹ لو۔

ہدایت نمبر ۸ : جس وقت سپیکر صاحب اپنی ٹانگوں پر کھڑے ہوں (ویسے مجھے اس بات پر شک ہے کہ وہ کبھی اپنی ٹانگوں پر کھڑے ہو سکیں گے) تو تمہیں نیچے بیٹھ جانا چاہیے، حالانکہ مجھے اس بات کا بھی کوئی اندیشہ نہیں کہ تم کبھی اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونا سیکھو گے، بہر کیف۔

ہدایت نمبر ۹ : جس وقت شیخ صاحب شاہ صاحب یا محی الدین شاہ صاحب کچھ کہنے کے لیے کھڑے ہو جائیں تو اس زور سے تالیاں بجاؤ کہ اپوزیشن ممبروں کے چھکے چھوٹ جائیں۔ لیکن ہاتھ سے تالی نہ بجانا، بلکہ سامنے والی میز بجانا پارلیمانی اصطلاح میں اسی کو تالی بجانا کہتے ہیں۔ جب بیگ صاحب کچھ کہنے کے لئے کھڑے ہو جائیں، تو اس وقت تالی بجانا خطرے سے خالی نہیں۔ شاہ صاحب دیکھ لیں تو تمہارا نمبر نوٹ کیا جائے گا۔

ہدایت نمبر ۱۰ : تالی بجانے سے پہلے اس بات کا اطمینان کرنا کہ شیخ صاحب اور شاہ صاحبان کچھ کہنے کے لئے ہی کھڑے ہو گئے ہیں، ورنہ یہ بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ وہ رفع حاجات کے لیے باہر جانے والے ہوں اور آپ نے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔

ہدایت نمبر ۱۱ : بیگ صاحب بڑے لطیفہ باز آدمی ہیں۔ کاروائی کے دوران وہ برابر شگوفے چھوڑتے جائیں گے۔ ان کے لطیفوں اور شگوفوں پر تم کو ہنسی آئے نہ آئے، پارٹی ڈسپلن کے تحت بے تحاشا قہقہے لگاتے جانا! لیکن ایسا کرتے ہوئے بھی شاہ صاحبان کی طرف دیکھتے جاؤ۔ کہیں انہیں تمہارے بارے میں غلط فہمی نہ ہو جائے۔

ہدایت نمبر ۱۲ : جب حزب مخالف سے تعلق رکھنے والے ممبر بول رہے ہوں تو ان کی طرف یوں گھورتے رہو کہ دیکھنے والے یہ سمجھ جائیں کہ تم ان کو کچا کھا جاؤ گے۔ بیچ بیچ میں شاہ برادران کی طرف دیکھتے جاؤ۔ اگر انہوں نے اشارہ کیا، تو کھڑے ہو کر اپوزیشن ممبران کو ماں بہن کی گالی دو، یہاں کوئی پوچھنے والا نہیں!

ہدایت نمبر ۱۳: آئینی قانونی یا سیاسی مسائل پر تم کو ہرگز زبان نہیں کھولنی چاہیئے۔ تم کو زیادہ تر اپنے علاقے کے نائب تحصیل دار، ڈاکٹر، ڈاکٹرنی، استاد اور پٹواری کے خلاف بولتے رہنا چاہیئے کیوں کہ اس سے تمہارے علاقے میں تمہاری دھونس جمے گی۔

ہدایت نمبر ۱۴: سپیکر اگر چہ اسمبلی کا سب سے بڑا حاکم ہوتا ہے اور اس کا احترام کرنا تم سب پر لازم ہے لیکن تم اسمبلی کے قواعد وضوابط کے چکر میں نہ پڑنا، جو کچھ بڑے شاہ صاحب اور چھوٹے شاہ صاحب کہیں وہی کرنا اور ہاں میرزا افضل بیگ کے چکر میں بھی نہ پڑھنا وہ صرف کاغذی نائب وزیر اعلیٰ ہے۔

ہدایت نمبر ۱۵: ہر بات پر ''ہاں'' کہنے کی عادت ڈالو اور یہ سمجھنے کی کوشش نہ کرو کہ ''ہاں'' کیوں کہہ رہے ہو۔ سمجھنے کی کوشش کرو گے تو محی الدین اوڑی کی طرح ختم ہو جاؤ گے، نہ سمجھتے ہوئے ہاں کہو گے تو محی الدین پانپوری کی طرح کچھ سے کچھ ہو جاؤ گے۔

ہدایت نمبر ۱۶: اپنا وقت برباد نہ کرو دن بھر سرکاری دفتروں میں لوگوں کی سفارشیں کرتے پھرو اس سے تمہاری ماہانہ آمدنی میں معقول اضافہ ہوتا رہے گا۔

ہدایت نمبر ۱۷: اپنے رائے دہندگان کی باتوں پر دھیان نہ دو، بلکہ کوشش کرو کہ تمہاری ان سے ملاقات ہی نہ ہو۔ یہ کم بخت انتخابات کے دوران کیے گیے وعدے یاد دلا کر ممبری کا سارا مزا کرکرا کر دیتے ہیں۔

ہدایت نمبر ۱۸: اجلاس کی کاروائی کے دوران تمہیں نیند آئے تو جانا، کیونکہ تمہارے جاگنے سے بھی ایوان کی کاروائی میں کوئی فرق

نہیں پڑتا۔ البتہ سوتے میں خراٹے لینا پارلیمانی آداب کے خلاف ہے، لیکن آئین ہند کی دفعہ ۳۷۰ کے تحت نیشنل کانفرنسیوں کا خراٹے لینا بھی پارلیمانی آداب میں شامل سمجھا جائے گا۔

ہدایت نمبر ۱۹ : سوالات کے گھنٹے کے دوران ضمنی سوالات نہ پوچھنا، ورنہ تمہاری بھی ضمنی بنادی جائے گی۔ یہ کام تم حزب مخالف کے سپرد کر دینا۔

ہدایت نمبر ۲۰ : یہ سن کر خوشی ہوگی کہ تمہیں اسمبلی ممبر کی حیثیت سے ماہانہ تنخواہ بھی ملے گی۔ یہ تنخواہ خود وصول کرنا، اس ہدایت کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ بخشی صاحب کے دور میں کچھ ایسے ممبران اسمبلی بھی تھے کہ جنہیں چار سال بعد یہ پتہ چلا کہ ممبروں کو ماہوار تنخواہ ملتی ہے اور تم میں سے اکثر اسی غریب برادری سے تعلق رکھتے ہو۔

ہدایت نمبر ۲۱ : خبردار! خبردار، اپنی میعاد ممبری (ملازمت) کے دوران کبھی بھولے سے کوئی عقل کی بات نہ کرنا نمبر نوٹ کر لیا جائے گا اور پھر کبھی اس ایوان میں قدم رکھنے کا موقع نہ ملے گا۔ یہ بات تم نیند میں بھی نہ بھولنا کہ تم نیشنل کانفرنسی ممبر اسمبلی ہو، اور تمہارے لیے اپنی عقل اور اپنے شعور کا استعمال سخت منع ہے۔ تم بس پانچ سال تک یہی دہراتے جاؤ:

"الہ کرے گا، وانگن کرے گا، شیر کرے گا شیر کرے گا"
"کدو بنائے گا بینگن بنائے جو بھی بنائے گا شیر بنائے گا"

❀❀❀

۱۳/اکتوبر ۱۹۷۷ء

صدر جمہوریہ کے نام

شیر کشمیر یا شیر بھارت

۹/اکتوبر کو سرینگر میں آپ کی آمد پر، آپ کا جو شاہانہ استقبال کیا گیا، اس سے آپ بے پناہ متاثر نظر آتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پہلی بار اتنا رنگیں، گرم جوشانہ اور انوکھا استقبال دیکھا ہے۔ شالیمار باغ کے روح پرور اور حیات آفرین ماحول میں پرسوں آپ نے جن الفاظ میں اس شاندار استقبال پر اپنی دلی مسرت اور شکرگذاری کا اظہار کیا، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ صاحب کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھ گیا ہے اور آپ نے نو نقد نہ تیرہ ادھار کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے شیخ صاحب کو وہ شاندار اور جاندار خراج تحسین پیش کیا کہ آپ کے شاہانہ استقبال پر خرچ کیے گئے ساڑھے تین لاکھ روپے معہ سود کے واپس مل گئے۔ آپ نے اپنی تقریر میں جس سادگی، جوش اور خلوص سے دریائی جلوس میں عام لوگوں کی شرکت کا ذکر کیا اس سے اور کچھ ثابت ہوا یا نہیں، یہ بات ثابت ہوگئی کہ آپ بڑے بھولے، بے حد شریف اور بھلے مانس آدمی ہیں اور آپ کو سیاست دانوں اور حکمرانوں کی چالاکی، ان کی اداکاری اور گلوکاری کا زیادہ تجربہ نہیں، بدلے ہوئے حالات میں ہندوستان کو ایک ایسے ہی صدر کی ضرورت تھی اور خدا کا شکر ہے کہ ہمیں آپ کی ذات میں ایک نہایت ہی شریف، مخلص اور سادہ دل صدر نصیب ہوا ہے۔ آپ نے صدر میونسپلٹی دھرم ویر سنگھ اوبرائے کے فارسی

نہیں پڑتا۔ البتہ سوتے میں خراٹے لینا پارلیمانی آداب کے خلاف ہے، لیکن آئین ہند کی دفعہ ۳۷۰ کے تحت نیشنل کانفرنسیوں کا خراٹے لینا بھی پارلیمانی آداب میں شامل سمجھا جائے گا۔

ہدایت نمبر ۱۹ : سوالات کے گھنٹے کے دوران ضمنی سوالات نہ پوچھنا، ورنہ تمہاری بھی ضمنی بنادی جائے گی۔ یہ کام تم حزب مخالف کے سپرد کر دینا۔

ہدایت نمبر ۲۰ : یہ سن کر خوشی ہوگی کہ تمہیں اسمبلی ممبر کی حیثیت سے ماہانہ تنخواہ بھی ملے گی۔ یہ تنخواہ خود وصول کرنا، اس ہدایت کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ بخشی صاحب کے دور میں کچھ ایسے ممبران اسمبلی بھی تھے کہ جنہیں چار سال بعد یہ پتہ چلا کہ ممبروں کو ماہوار تنخواہ ملتی ہے اور تم میں سے اکثر اسی غریب برادری سے تعلق رکھتے ہو۔

ہدایت نمبر ۲۱ : خبردار! خبردار، اپنی میعاد ممبری (ملازمت) کے دوران کبھی بھولے سے کوئی عقل کی بات نہ کرنا نمبر نوٹ کرلیا جائے گا اور پھر کبھی اس ایوان میں قدم رکھنے کا موقع نہ ملے گا۔ یہ بات تم نیند میں بھی نہ بھولنا کہ تم نیشنل کانفرنسی ممبر اسمبلی ہو، اور تمہارے لیے اپنی عقل اور اپنے شعور کا استعمال سخت منع ہے۔ تم بس پانچ سال تک یہی دہراتے جاؤ:

"الہ کرے گا، وانگن کرے گا، شیر کرے گا شیر کرے گا"

"کدو بنائے گا بینگن بنائے جو بھی بنائے گا شیر بنائے گا"

❁❁❁

۱۳؍اکتوبر ۱۹۷۷ء

صدر جمہوریہ کے نام

شیر کشمیر یا شیر بھارت

۹؍اکتوبر کو سرینگر میں آپ کی آمد پر، آپ کا جو شاہانہ استقبال کیا گیا، اس سے آپ بے پناہ متاثر نظر آتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پہلی بار اتنا رنگیں، گرم جوشانہ اور انوکھا استقبال دیکھا ہے۔ شالیمار باغ کے روح پرور اور حیات آفرین ماحول میں پرسوں آپ نے جن الفاظ میں اس شاندار استقبال پر اپنی دلی مسرت اور شکرگذاری کا اظہار کیا، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ صاحب کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھ گیا ہے اور آپ نے نو نقد نہ تیرہ ادھار کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے شیخ صاحب کو وہ شاندار اور جاندار خراج تحسین پیش کیا کہ آپ کے شاہانہ استقبال پر خرچ کیے گئے ساڑھے تین لاکھ روپے معہ سود کے واپس مل گئے۔ آپ نے اپنی تقریر میں جس سادگی، جوش اور خلوص سے دریائی جلوس میں عام لوگوں کی شرکت کا ذکر کیا اس سے اور کچھ ثابت ہوا یا نہیں، یہ بات ثابت ہوگئی کہ آپ بڑے بھولے، بے حد شریف اور بھلے مانس آدمی ہیں اور آپ کو سیاست دانوں اور حکمرانوں کی چالاکی، ان کی اداکاری اور گلوکاری کا زیادہ تجربہ نہیں، بدلے ہوئے حالات میں ہندوستان کو ایک ایسے ہی صدر کی ضرورت تھی اور خدا کا شکر ہے کہ ہمیں آپ کی ذات میں ایک نہایت ہی شریف مخلص اور سادہ دل صدر نصیب ہوا ہے۔ آپ نے صدر میونسپلٹی دھرم ویر سنگھ اوبرائے کے فارسی

زبان میں پڑھے گئے سالنامے کے جواب میں جو تقریر ارشاد فرمائی، اس میں آپ نے کشمیر کی خوبصورتی اور اس کے دلفریب مناظر کی جو تعریف کی اس سے اہل کشمیر کو بڑی مسرت ہوئی۔ لیکن اس سے زیادہ مسرت انہیں شیر کشمیر کے متعلق آپ کے پرخلوص اور بے لوث جذبات سے ہوئی ہے اور میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ شیخ صاحب کی ذات کے متعلق آپ نے جو کچھ کہا ہے، ان سے بہت سی شکایات اور اختلافات کے باوجود میں اس سے حرف بہ حرف متفق ہوں اور میرا خیال ہے کہ میری ہی طرح شیخ صاحب کے بہت سے مخالف بھی آپ کی اس بات سے اتفاق کریں گے، کہ شیخ صاحب کو صرف شیر کشمیر نہیں، شیر بھارت ہونا چاہئے تھا۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ جس شخص کو شیر ہندوستان ہونا چاہئے تھا وہ شیرِ نرپرستان[1] ہونے پر قانع ہے اور یہی شیخ صاحب کا ذاتی اور ہمارا قومی المیہ ہے۔

صدر جمہوریہ! شیخ صاحب کے بارے میں آپ کا یہ تاثر یقیناً کسی مبالغے یا خوشامد کا اظہار نہیں، کہ اپنے ماضی، اپنے منصب، اپنی جدوجہد اور اپنے قدوقامت کے اعتبار سے انہیں صرف کشمیر کا نہیں پورے بھارت کا رہنما ہونا چاہئے تھا۔ لیکن تاریخ کی اور شیخ صاحب کی بدقسمتی ملاحظہ کیجئے کہ گذشتہ تیس برسوں میں ان کا قد بڑھنے کی بجائے گھٹتا جارہا ہے اور ان کی سیاست کا محور اور شخصیت کا اثر رفتہ رفتہ وادی کشمیر کی چار دیواری تک محدود ہوتا جارہا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے وہ کل ہند پیمانے کے ایک لیڈر تھے۔ قومی سیاست میں ان کا نام مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، سردار پٹیل اور ابوالکلام آزاد کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ان

[1] سرینگر کا ایک محلہ

Release of
(COLLECTION OF
28th. JUNE

کی ملک گیر عظمت عالمگیر شہرت اختیار کر گئی اور انہیں عالمی سیاست میں بھی ایک اہم شخصیت کا درجہ حاصل ہوگیا، لیکن جوں جوں تاریخ کا کارواں آگے بڑھتا گیا، شیخ صاحب کی سیاست اور شخصیت کا محور محدود ہوتا گیا اور انہوں نے رفتہ رفتہ اپنے آپ کو ملکی مسایل اور سیاست سے الگ کر کے پہلے ریاست کی سیاست میں اور بالآخر وادئ کشمیر کے عافیت کدے میں پناہ لی، اسمبلی کے تازہ ترین انتخابات نے انہیں عملاً وادئ کشمیر کا لیڈر بنا کر انہیں اس محدود سیاست کی الجھنوں میں کچھ اس طرح الجھا دیا ہے کہ وہ جنگل کے شیر کی بجائے شکارگاہ کا شیر بن کر رہ گئے ہیں۔

محترم ریڈی صاحب! میں اس حقیقت سے انکار کرنا بھی چاہوں تو کر نہیں سکتا کہ حالات کی سازش، زمانے کی گردش، شیخ صاحب کی خوش بختی اور ان کے حریفوں کی بدبختی نے شیخ محمد عبداللہ کو قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر ایک ایسی اہمیت اور عظمت عطا کی تھی کہ جو کشمیر کی گذشتہ سو سالہ تاریخ میں کسی کشمیری کو نصیب نہیں ہوئی ہے اور جو نہ شاید اب کسی اور کشمیری کو حاصل ہو سکے، کشمیری عوام نے انہیں اپنی محبت اور عقیدت کا مرکز بنا کر انہیں ایک ایسا طلسماتی کردار بنا دیا تھا کہ اپنی شخصیت کے معمولی ہونے کے باوجود وہ ایک غیر معمولی شخصیت بن گئے۔ کشمیر کی تاریخ اور اسکے مخصوص پس منظر نے ان کے سیاسی رول کو اتنا اہم اور تاریخی بنا دیا کہ وہ برصغیر میں سیکولرازم کی سب سے بڑی علامت اور دو قومی نظریئے کے سب سے بڑے مخالف بن کر ابھرے اور ۱۹۴۷ء کے پُرآشوب دور میں انہوں نے کشمیر کی سیاست اور تاریخ کو ایک ایسا موڑ دیا کہ ایک چھوٹی سی ریاست ہندوستان کی

پوری سیاست کو متاثر کرنے کی اہل نظر آنے لگی لیکن یہ اتنی بڑی حقیقت جلد ہی خرافات میں کھو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہم اپنے تاریخی رول سے سبکدوش ہو کر ایک ایسی فرضی اور خیالی کشمکش کی بنیاد بن گئے کہ جو ٹھوس حقائق کی بجائے ہمارے ذہنی توہمات اور نفسیاتی تضادات کا نتیجہ تھی۔ شیخ صاحب نے ریاستی عوام کی محبت اور ہندوستان کے عوام کی عقیدت کی بے پناہ دولت کا غلط استعمال کر کے صرف اپنی ذات ہی کو نہیں ریاست اور ملک کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ قدرت نے انہیں پورے ملک کی سیاست پر چھا جانے کے کئی مواقع عطا کئے اور قومی قیادت کے سب سے اونچے ایوانوں میں شامل ہونے کے اسباب پیدا کئے، لیکن شیخ صاحب کو سمندر کی وسعتوں اور آسمان کی بلندیوں کی بجائے نہ معلوم تالابوں کے منجمد پانی اور اپنی محدود دنیا کی حکمرانی میں ہی کیوں ایسا مزا آیا، کہ وہ اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر قدم رکھنے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہوئے۔ نتیجہ یہ کہ وہ جوان کے سامنے طفل مکتب ہوا کرتے تھے، آج ملک کی سیاست کے ناخدا بنے ہوئے ہیں اور شیخ محمد عبداللہ ایک ریاست کے معمولی سے چیف منسٹر کی حیثیت سے انکے پاس امداد اور اعانت کی درخواستیں لے کر پیش ہوتے ہیں۔

گزشتہ بیس تیس سال کے دوران بارہا ایسے مواقع آئے کہ شیخ صاحب ملک کی سیاست میں مناسب اور بھرپور رول ادا کرنے پر آمادہ ہو جاتے تو ہندوستان کے سب سے اونچے مسند پر جلوہ افروز ہو سکتے تھے۔ لیکن جس طرح کنویں کا مینڈک کنویں کو ہی ساری کائنات سمجھتا ہے۔ اسی طرح ہمارے قائد اعظم کشمیر کی سیاست کو ہی ساری دنیا کی

سیاست سمجھ کر اس کنویں سے باہر نکلنے پر آمادہ نہیں ہوئے اور نتیجہ یہ
کہ آج یو۔پی کے چرن سنگھ اور گجرات کے مرار جی ڈیسائی تو
ہندوستان کے مالک بنے پھر رہے ہیں اور اپنے شیر کشمیر موٹر
ڈرائیورس ایسوسی ایشن کے ڈرائیوروں کے چیلنج کا مقابلہ کر رہے ہیں۔
جن سنگھ کے اٹل بہاری باجپائی اقوام متحدہ میں ہندوستان کی خارجہ
پالیسی کو ایک نئی طرح دے رہے ہیں اور ہمارے بابائے قوم نالۂ مار کی
کھدائی کی دیکھ بھال کر رہے ہیں، جارج فرنانڈیس اور نانا جی دیش مکھ
تو قومی معشیت اور سیاست کی نئی سمتیں معین کر رہے ہیں اور شیخ صاحب
شیر اور بکروں کی لڑائی میں شیروں کی نئی حکمت عملی ترتیب دے رہے
ہیں۔ شیخ صاحب کے ایک ہم عصر اور ہم عمر ساتھی جے پرکاش نراین،
ایک عام شہری کی حیثیت سے بھی ملک کی سیاست اور مستقبل کو متاثر کر
رہے ہیں اور شیخ صاحب ایک ریاست کے وزیر اعلیٰ ہونے کے باوجود
ملک کے اہم ترین مسائل پر رائے زنی کے حق سے محروم ہیں۔ میری
دانست میں شیخ صاحب نے اپنی ذات ہی کے ساتھ نہیں، اس قوم کے
ساتھ بھی بڑی ناانصافی کی ہے کہ جس نے انہیں اتنا بڑا منصب اور اتنا
رتبہ بخشا ہے۔ شیخ صاحب اور ان کے بعض اندھے عقیدت مند یہ کہیں
گے کہ کشمیر کی سیاست سے شیخ صاحب کی یہ گہری وابستگی کشمیر اور کشمیری
عوام کے تئیں ان کی بے پناہ اور گہری عقیدت کا ثبوت ہے، لیکن آپ
مجھ سے اتفاق کریں گے کہ شیخ صاحب کی اس نفسیاتی کیفیت کو جو بھی
نام دیا جائے اسے صحت مند محبت اور عقیدت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ میرا
دعویٰ ہے کہ مرکزی قیادت کا ایک حصہ ہوتے ہوئے شیخ صاحب اس

ریاست کے لئے اس سے کہیں زیادہ فایدہ مند ثابت ہوتے کہ جتنا وہ اس ریاست کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے ثابت ہوئے ہیں یا ہو رہے ہیں اور پھر شیخ صاحب کے مرتبے کے رہنما صرف اپنی ریاست کے بارے میں ہی نہیں سوچتے، پورے ملک کے بارے میں سوچتے ہیں۔ قومی سطح کا ہر رہنما ذہنی ارتقاء کے عمل سے گزرا ہے اور ابتداء میں وہ ہمیشہ ایک صوبے یا ریاست کے عوام کی جذباتی کیفیات اور ان کی امنگوں کا ترجمان ہوتا ہے۔ لیکن وہ زیادہ تر اس چار دیواری میں قید نہیں رہ سکتا اور بالآخر قومی سیاست کے تقاضے اسے اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں۔ مہاتما گاندھی، جواہرلال نہرو، سردار پٹیل مُرارجی ڈیسائی، جگ جیون رام اور اس قبیل کے دوسرے رہنما ابتداء میں اپنی ریاستوں کی سیاست یا مسائل سے ہی دلچسپی رکھتے تھے۔ لیکن جوں جوں وہ بڑھتے گئے وہ پورے ملک اور ملکی سیاست میں involve ہوتے گئے اور پھر ایک ایسا وقت آگیا کہ وہ سارے برصغیر کی سیاست پر چھا گئے۔ بدقسمتی سے شیخ صاحب کا ذہنی اور سیاسی ارتقاء ایک منزل پر آکر رُک گیا اور وہ سینکڑوں مواقع بہم آنے کے باوجود شیر بکرے کی سیاسی سطح سے اوپر نہ اٹھ سکے، نتیجہ یہ کہ اس وقت جبکہ جارج فرنانڈیس اور موہن دھاریہ کی عمر کے لوگ ہندوستان کے مستقبل اور اسکی سیاست کی زلفیں سنوار رہے ہیں، شیخ صاحب ایک ریاست کے چیف منسٹر بننے کو ہی اپنے لئے بہت بڑی سعادت اور عزت سمجھتے ہیں۔

صدرِ محترم! میں نہیں جانتا کہ آپ نے صرف اپنے شاندار استقبال پر اظہار تشکر کرنے کے لیے شیخ صاحب کو شیر بھارت بننے کا مشورہ دیا ہے یا آپ خلوص دل سے اس بات کے متمنی ہیں کہ وہ کشمیر کی سیاست کو کسی کم

تدریج کے انسان کے سپرد کر کے قومی سیاست میں بھرپور حصہ لیں۔ لیکن شیخ صاحب کی صلاحیتوں اور ان کی شخصیت کے بے پناہ امکانات کی طرح اشارہ کر کے آپ نے ان کے ذاتی اور ہمارے قومی المیے کا احساس کچھ گہرا کر دیا ہے۔ کیا یہ انتہائی افسوس کی بات نہیں ہے کہ جس شخص میں ہندوستان کا وزیراعظم اور صدر بننے کی صلاحیت موجود تھی، وہ ایک ریاست کی چیف منسٹری کو شاخ دوجہاں سمجھ کر اس پر قانع ہے؟ کیا آپ اپنے قیام کے دوران شیخ صاحب کو اس بات کا احساس اور عرفان نہیں دے سکتے کہ اس خوبصورت کنوئیں کے باہر بھی ایک بہت ہی وسیع اور لامحدود دُنیا ہے؟ کیا آپ ان پر یہ حقیقت واضع نہیں کر سکتے کہ سرکاری ملازموں کو ترقی دینے اور ان کی تبدیلیاں کرنے کے علاوہ بھی کچھ ایسے کام ہیں کہ جن کے انجام دینے سے اس ملک کی تقدیر بدل سکتی ہے؟ مگر نہیں، میرا خیال ہے کہ یہ کوشش بے کار بھی ہوگی اور بعداز وقت بھی، شیخ صاحب نے اپنی منزل مقصود معین کر لی ہے اور اب ان سے آگے بڑھنے اور دور دیکھنے کی توقع رکھنا بے کار ہے۔
اب تو انہوں نے نوجوانوں کو مستقبل کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی تربیت دینے کا کام شروع کر لیا ہے اور یہ کام بہت صبر طلب اور محنت طلب ہے خدا انہیں اس نیک کام کو انجام دینے کے لئے عمر دراز اور صحت کامل عطا کرے، امید ہے کہ آپ کے مزاج بخیر ہوں گے۔ شریمتی ریڈی کو میری بیگم کا آداب کہیے کسی وقت فرصت ملے تو غریب خانے پر بھی تشریف لائیے۔

فقط آپ کا مخلص

چراغ بیگ

❁❁❁

۲۰/ نومبر ۱۹۷۷

ہدایت نامہ وکیل صاحب

(عبدالاحد وکیل ممبر پارلیمنٹ کی خدمت میں)

پیارے وکیل صاحب!

پارلیمانی انتخابات کے بعد میں نے حالیہ پنچایتی انتخابات کے دوران آپ کی تقریروں کا چرچا سنا تھا، لیکن پارلیمنٹ میں ابھی شاید آپ اپنی پہلی تقریر کی ہی تیاریوں میں مصروف ہیں، ضلع بارہمولہ کے رائے دہندگان ہی نہیں، کشمیر کے ساڑھے چوالیس لاکھ، چوالیس ہزار اور چالیس عوام بھی پارلیمنٹ میں آپ کی گونج سننے کے منتظر ہیں، خدارا انہیں مایوس نہ کیجئے اور شیر کشمیر کے شیر بن کر پارلیمنٹ کے درو دیوار کو ہلا دیجئے۔ میں جانتا ہوں کہ ابھی آپ کو پارلیمنٹ میں گئے صرف آٹھ مہینے ہوئے ہیں اور پارلیمنٹ کے ماحول، اس کے قواعد وضوابط، طور طرز اور آداب سے مانوس ہونے میں آپ کو ایک دو سال کا عرصہ درکار ہوگا۔ لیکن عوام کی بے چینی، ان کے انتظار اور ان کی توقعات کے پیش نظر آپ کو جلد از جلد ملک کے اس سب سے بڑے ایوان میں اپنی گرمیِ گفتار کا مظاہرہ کرنا چاہیئے، ورنہ ضلع بارہ مولہ کے رائے دہندگان کو ہی نہیں، ریاستی عوام اور ان کے قائد کو بھی مایوسی ہوگی۔ اس خیال سے کہ آپ پارلیمنٹ کے لئے نئے ہیں اور آپ کو اس سے پہلے کسی قانون ساز ادارے کی رکنیت کا شرف حاصل نہیں رہا ہے، میں آپ کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں، تا کہ آپ جلد از جلد

پارلیمنٹ کے جغرافیہ، اس کے طور اطوار اور اسکی روایات سے واقف ہو جائیں ۔

ہدایات

ا۔ پارلیمنٹ کوئی مکتب نہیں ہے کہ آپ ٹھیک گیارہ بجے وہاں پہنچ جائیں۔ آپ آدھ گھنٹہ، گھنٹہ دیر سے بھی جائیں، تو آپ سے باز پرس نہیں ہوگی۔

۲۔ پارلیمنٹ کے گیٹ نمبرا پر آپ کو پہریدار روکیں گے، تو آپ فوراً جیب سے شناختی کارڈ نکال کر انہیں نہ دکھائیے صرف اپنی زبان سے کہہ دیجئے کہ میں ممبر پارلیمنٹ ہوں، وہ آپ کی بات کا اعتبار کریں گے۔

۳۔ داخل ہوتے ہی دائیں طرف نوٹس آفس ہے۔ یہاں سولات، توجہ دلاؤ نوٹس، تحاریک التواء اور دوسری متعلقہ کاروائی کے چھپے ہوئے فارم ملتے ہیں، ان کی آپ کو کبھی ضرورت نہیں پڑے گی، اس لئے یہاں جاکر اپنا وقت ضائع نہ کیجئے۔

۴۔ گیٹ نمبرا کے بالکل سامنے تقریباً دوسو گز کے فاصلے پر آپ کو ایک پہریدار نظر آئے گا۔ یہ پارلیمنٹ کا سنٹرل ہال کہلاتا ہے۔ یہاں آپ کو ہر وقت نئے اور پرانے موجودہ اور سابقہ ممبران پارلیمنٹ، مرکزی کابینہ کے وزیر اور اصحافی گپ لڑاتے اور چائے پیتے پلاتے نظر آئیں گے۔ اسی کو پارلیمنٹ سمجھ کر یہیں نہ بیٹھ جائیے۔

۵۔ سنٹرل ہال میں بیٹھ کر آپ دوسری ریاستوں کے ممبران پارلیمنٹ اور صحافیوں سے راہ درسم پیدا کر سکتے ہیں۔ ان سے مختلف

سیاسی موضوعات اور مسائل پر تبادلۂ خیال کر سکتے ہیں اور باتوں باتوں میں انہیں کشمیر کے حالات اور یہاں کے اندرونی مسائل سے روشناس کر سکتے ہیں۔ سنٹرل ہال کی یہی اہمیت ہے، لیکن اس بات کا بھی خیال رکھیئے کہ کشمیر سے بھیجے گئے بہت سے ممبران پارلیمنٹ نے اس ہال کو پارلیمنٹ سمجھ کر پانچ سال یہیں گذار دیئے۔

۶۔ سنٹرل ہال کے عقب میں لوک سبھا کو راستہ جاتا ہے، لیکن لوک سبھا اور سنٹرل ہال کے درمیان ایک گول برآمدہ بنا ہوا ہے، اسے لوک سبھا نہ سمجھئے یہ لابی کہلاتی ہے اور اسی لابی میں بیٹھ کر کشمیر کے ایک ممبر پارلیمنٹ تقریریں کیا کرتے تھے۔ آپ تو بہرحال وکیل ہیں، آپ کو لابی اور لوک سبھا کا فرق معلوم ہوگا۔

۷۔ لوک سبھا کے ہر ممبر کو ایک ڈویژن نمبر ملتا ہے اور یہی اس کا سیٹ نمبر کہلاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ آپ اپنے ہی ڈویژن نمبر سے چپکے رہیں۔ آپ کا سیٹ نمبر اگر بہت پیچھے ہے تو آپ تقریر کرتے وقت اگلی نشست پر بھی بیٹھ سکتے ہیں۔

۸۔ آپ کو اگر کسی مسئلے پر اظہار خیال کرنا ہے، تو اپنی نشست پر اس امید کے ساتھ نہ بیٹھ جایئے کہ سپیکر صاحب آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے اظہار خیال کی استدعا کریں گے۔ آپ اپنی نشست پر بار بار کھڑے ہو کر سپیکر کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتے رہیئے اور یہ عمل اس وقت تک جاری رکھیئے کہ جب تک وہ آپ کو تقریر کرنے کی دعوت نہ دے۔ یہ طریقہ اگرچہ آپ کی شرافت اور خاندانی نجابت کی روایات کے خلاف ہے، لیکن پارلیمنٹ میں تقریر کرنے کے

لئے وقت حاصل کرنے کا اور کوئی طریقہ بھی نہیں۔

۹۔ سپیکر سے ڈریئے نہیں کیوں کہ وہ نہ شیر کشمیر ہے اور نہ فخر کشمیر۔ وہ بالآخر آپ کی بات سن لے گا، لیکن اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے آپ کو اپنے گفتار سے متاثر کرنا پڑے گا۔ ورنہ وہ ہمیشہ آپ کو نظر انداز کرتا رہے گا۔

۱۰۔ اس بات کے انتظار میں نہ رہئے کہ کشمیر کا ذکر کب آتا ہے، تاکہ آپ کو گوہر افشانی کا موقع ملے۔ اس بات کا امکان ہے کہ لوک سبھا میں سال بھر کے لئے کبھی کشمیر کا ذکر ہی نہ آنے پائے اور اس طرح آپ کے بات کرنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ آپ کشمیر کے ممبر پارلیمنٹ ضرور ہیں لیکن آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ آپ کشمیر کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی اظہار خیال کر سکتے ہیں اور ہندوستان سے متعلق ہر مسئلے میں دل چسپی لے سکتے ہیں۔

۱۱۔ اس بات کو ملحوظ خاطر رکھیئے کہ پارلیمنٹ میں تقریر کے آداب مجاہد منزل اور پنچایت کمیٹی میں تقریر کے آداب سے قدرے مختلف ہیں۔ یہاں ہر جملے کے بعد بابائے قوم حضرت شیر کشمیر کو خراجِ عقیدت تحسین کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ تقریر کا وقت محدود ہوتا ہے اور اگر آپ نے یہاں بھی مجاہد منزل سٹائیل تقریر کی تو آپ کچھ نہ کہہ پائیں گے اور اخبار والے آپ کا منہ تکتے رہ جائیں گے۔

۱۲۔ پارلیمنٹ میں آپ کو ہر بات کہنے کی مکمل آزادی ہے۔ آپ کی تقریر میں اگر کوئی مداخلت کرے تو گھبرائیے نہیں، جو بات کہنا ہو بلاخوف کہہ دیجئے۔ یہاں شیر کشمیر کا بھی ڈر نہیں ہے۔

۱۳۔ پارلیمنٹ میں کبھی کبھی بڑے زور دار ہنگامے ہوتے ہیں اور ممبروں کے درمیان بعض اوقات سخت تلخ کلامی کی بھی نوبت آتی ہے۔ ان ہنگاموں سے گھبرائیے نہیں کیونکہ یہاں کوئی غلام محمد شاہ یا صدرالدین مجاہد نہیں ہے، کہ جو ماں بہن کی گالیاں دے کر ماحول کو مکدر بنا دے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو ان ہنگاموں سے بھاگنے کی بجائے ان میں حصہ لینا چاہئے۔

۱۴۔ اپنی نشست پر بیٹھنے سے پہلے اور اس سے اٹھتے وقت سپیکر کے پوڈیم کی طرف اپنا سر جھکائیے۔ یہ پارلیمانی آداب کا تقاضا ہے۔

۱۵۔ پارلیمنٹ کی کاروائی سے جی اُکتا جائے تو آپ لوک سبھا سے باہر بھی جا سکتے ہیں۔ گول برآمدے کے دائیں طرف باتھ روم ہے وہاں آپ رفع حاجات کر سکتے ہیں۔

۱۶۔ پارلیمنٹ کے مرکزی ہال سے کچھ فاصلے پر ایک عدد ریڈنگ روم ہے جس میں دنیا بھر کے رسایل آتے ہیں۔ وہاں قدم رکھنے کی کبھی حماقت نہ کیجئے۔ کیونکہ اگر شیر کشمیر کو پتہ چل جائے گا کہ آپ نے ریڈنگ روم اور لائبریری میں جاکر پڑھنا شروع کر دیا ہے تو پارلیمنٹ نہیں، نیشنل کانفرنس سے بھی آپ کا پتا کٹ جائے گا۔

فی الحال سولہ ہدایات پر مشتمل یہ ہدایات نامہ آپ کے لئے کافی ہے۔ اگر پارلیمنٹ کے سلسلے میں مزید جانکاری حاصل کرنا ہو تو راجیہ سبھا کے ممبر لالہ تیرتھ رام آملہ سے رجوع کیجئے وہ اپنے تجربات سے آپ کو مستفید کریں گے۔

❁❁❁

۱۴/ جنوری ۱۹۷۸ء

وزیر اعظم مرار جی ڈیسائی اور شمیم احمد شمیم کی خط وکتابت

۲۴/ اگست ۱۹۷۷ء

نئی دہلی

ڈیر شری شمیم!

آپ کو یاد ہوگا کہ آج بعد دوپہر کو جب آپ مجھ سے ملنے آئے تو اُس دوران میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ ایمرجنسی کے دوران لوک سبھا میں اپنی تقریر کے دوران آپ نے مجھے سمگلر کہہ کے پکارا تھا۔ آپ نے نہ صرف اس بات سے قطعی انکار کیا کہ آپ نے کبھی بھی میرے بارے میں ایسا کہا ہے بلکہ آپ نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ آپ کے دل میں میرے لیے نیک خواہشات کے سوا کچھ نہیں۔

میرے پاس لوک سبھا میں ہوئے بحث مباحثے کا ریکارڈ موجود نہیں، جس کو پڑھ کر آپ اپنی یادداشت میں اضافہ کر لیتے۔ لیکن میں یہاں پر اس تقریر کے اقتباسات پیش کروں گا، کہ جو آپ نے ۲۲ جولائی ۱۹۷۵ء کو ایمرجنسی کے نفاذ پر لوک سبھا میں کی تھی۔

(اب ذرا حزب اختلاف کے ایک اور امام۔ مرار جی ڈیسائی پر نظر ڈالیے کہ جنہوں نے اپنے دور اقتدار میں اپنے فرزند کو ہر قسم کا غیر قانونی تحفظ فراہم کیا، آج سادھو ہونے کا دعویٰ کرتا ہے)

دوسری بار آپ نے ۳۹ویں آئینی ترمیمی بل پر ۲۳ جولائی کو تقریر

کرتے ہوئے کہا تھا: ''آج ملک کے بیشتر سمگلر اور سیاستدان گرفتار کیے گئے ہیں۔ مرارجی ڈیسائی سے میرے شدید اختلافات ہیں۔ اس ہاؤس میں وہ جو کچھ کہتے ہیں میں ان کا ایک لفظ بھی پسند نہیں کرتا۔ یہ ہاؤس اس بات کا گواہ ہے کہ ایک دن جب وہ تمام حزب اختلاف کے لیڈر بن گیے تھے میں نے کھڑے ہو کر یہ کہا تھا کہ وہ میری طرف سے کچھ نہیں بول سکتے۔

میں نے کہا ہے کہ میرے دل میں جے پرکاش نراین کے لیے جو بھی احترام یا قدر و منزلت موجود تھی، اس دن وہ مکمل طور ختم ہو کے رہ گئی کہ جب انہوں نے جن سنگھ کے اجلاس کی صدارت کی۔ جن سنگھ کے اجلاس کی صدارت اور بہار اسمبلی کو توڑ دیئے جانے کے مطالبہ کرنے کے بعد میں نے کبھی ان کی حمایت نہیں کی۔ لیکن میں آپ کو یہ بات بتادوں کہ میں اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کرتا ہوں کہ وہ ایک سمگلر ہیں۔ تب اُنہیں کیوں گرفتار کیا گیا ہے۔ مسٹر مرارجی ڈیسائی کے کیس میں یہ دکھائی دیتا ہے کہ وہ سیکورٹی کے لیے ایک خطرہ بن گیے تھے۔ وہ ایک سمگلر تھے اور اسی لیے انہیں گرفتار کیا گیا ہے۔''

جب کہ آپ کو اپنی بات کہنے کا بھرپور حق حاصل ہے۔ میں یہ سمجھ نہیں پاتا کہ آپ نے میرے اور میرے فرزند کے متعلق یہ اور کئی باتیں، میری موجودگی میں کہنے کی بجائے اس وقت کہیں کہ جب میں غیر حاضر تھا۔ نظر بند تھا اور یہ سب کچھ کہہ کر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ان سے انکار کیوں کیا... کیوں

☆☆☆

سرینگر، یکم ستمبر

مائی ڈیر مرار جی بھائی!

میں اُس خط کے لیے آپ کا شکر گذار ہوں۔ جو آپ نے میرے نام لکھا ہے اور جو مجھے آگرہ سے واپسی پر ملا کہ جہاں میں ایک سمینار میں شرکت کی غرض سے گیا ہوا تھا۔ میں اس بات کے لیے شکر گذار ہوں کہ آپ نے پارلیمنٹ میں میں میری ۲ تقاریر کے اقتباسات کا ذکر کیا ہے اور اس طرح مجھے اپنی پوزیشن واضح کرنے کا ایک موقع فراہم کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس بات سے سخت مایوسی ہوئی ہے کہ ان اقتباسات کے مواد اور مدعا کو صحیح معنوں میں پیش نہیں کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے میں ۲۲ جولائی ۱۹۷۵ء کو کی گئی اپنی تقریر کی وضاحت کروں۔ آپ نے اس تقریر سے ان چند سطور کو پیش کیا ہے کہ جن میں آپ کا اور آپ کے فرزند کا ذکر ہے اور میں نیک نیتی سے یہ تسلیم کر لیتا ہوں کہ اس میں آپ کی کوئی مداح یا خوشامد موجود نہیں ہے۔ اس پوری تقریر کا اگر بغور جایزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آئیگی کہ دراصل یہ میرے اخبار ''آئینہ'' کی ۱۵ جون کی اشاعت میں شایع شدہ ایک تحریر کا اقتباس ہے کہ جس کے دس دن بعد ملک میں اندرونی ایمرجنسی نافذ کی گئی۔ ''آئینہ'' کی اُس تحریر میں نہ صرف آپ پر بلکہ حزب اختلاف کے دیگر سر کردہ رہنماؤں، اٹل بہاری واجپائی اور راج نرائن کی سخت نکتہ چینی کی گئی تھی اور اس تحریر کا ذکر کرنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ ایمرجنسی نفاذ سے قبل، میں حزب اختلاف کے لیڈروں کا شدید مخالف تھا اور مجھے ان کے موقف کی نیک نیتی اور خلوص پر کوئی اعتماد نہیں

تھا لیکن ایمر جنسی کے نفاذ کے اعلان نے اس صورت حال کو بدل کے رکھ دیا اور اپنے اس موقف کی حمایت میں، میں نے پارلیمنٹ میں اپنی تقریر کے دوران ''آئینہ'' کی اس تحریر کا مکمل خلاصہ بیان کیا جس کی چند سطور آپ نے اپنے خط میں بیان کی ہیں۔ اپنی تقریر کے آخر میں، میں نے کہا ہے: ''یہ ایک افسوس ناک امر ہے کہ مجھ جیسا مسز گاندھی کا ایک شدید حامی اپنا کیس ہار گیا ہے اور اب وہ (مسز گاندھی کا) کوئی دفاع نہیں کر سکتا'' اور تقریباً یہی بات پالکھی والا نے ایمر جنسی کے اعلان کے بعد مسز گاندھی کی عذرداری کی پیروی کرنے سے معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہی تھی۔

اور اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ''میں نے آپ کے اور آپ کے فرزند کے بارے میں آپ کی غیر حاضری اور نظر بندی کے دوران کچھ نہیں کہا تھا'' بلکہ درحقیقت میں نے یہ سب کچھ اس سے بہت پہلے کہا تھا اور آپ کو یہ بتانا غیر ضروری نہ ہوگا کہ ایمر جنسی کے نفاذ کے اعلان اور ۶ جون ۱۹۷۵ء کو آپ کی گرفتاری کے بعد میں نے آپ کے خلاف ایک بھی لفظ لکھا یا بولا نہیں ہے۔ اب ذرا ۲۳ جولائی ۷۵ء کو لوک سبھا میں کی گئی میری تقریر کے اس اقتباس کا جائزہ لیں کہ جس کا آپ نے اپنے خط میں ذکر کیا ہے میں نے کلدیپ نایر کی Judgement میں شایع شدہ اپنی اس تقریر کا اقتباس اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ جب آپ نے مجھ سے اس کا ذکر کیا اور جب میں نے اس الزام کی صحت سے قطعی انکار کیا کہ میں نے آپ کو سمگلر کہہ کر پکارا ہے۔ مجھے اس بات کا سو فیصد یقین تھا کہ یہ الزام صحیح نہیں ہو سکتا۔

میں ایک بار پھر پورے وثوق کے ساتھ یہ دہرانا چاہوں گا کہ یہ الزام قطعی لغواور بے بنیاد ہے اور اس کی بنیاد ایک ایسی غلط فہمی ہے کہ جس کی وضاحت کی ضرورت ہے۔

۲۶راگست کو جب میں آپ کے کمرے سے باہر نکلا، میں پارلیمنٹ کی لائبریری میں چلا گیا اور وہاں لوک سبھا کے ریکارڈ کا ملاحظہ کیا اور یہ دیکھ کر مجھے انتہائی دکھ اور صدمہ پہونچا کہ آپ نے میرے تقریر میں جن الفاظ کی موجودگی کا برا منایا ہے وہ واقعی میری تقریر میں موجود ہیں۔ مجھے اپنی تقریر کا ایک ایک لفظ یاد تھا اور اپنی تقریر کو اس الٹی حالت میں دیکھ کر مجھے واقعی بہت دکھ پہونچا اور میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ میری تقریر میں یہ توڑ مروڑ کیا کسی حادثے کا نتیجہ ہے یا کسی سوچی سمجھی شرارت کا کہ اچانک مجھے اصلی اور حقیقی صورتحال یاد آگئی۔

درحقیقت میں نے اپنی تقریر میں جو الفاظ استعمال کیے تھے وہ یوں تھے: ''مسٹر مرارجی ڈیسائی کے کیس میں یوں لگتا ہے کہ وہ ملک کی سیکورٹی کے لیے خطرہ بن گئے تھے، کیوں؟ کیا وہ ایک سمگلر ہے اور کیا یہی ان کی گرفتاری کی وجہ ہے؟ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے غیر تصحیح شدہ کاپی میں اپنی اس تقریر کی غلطیاں درست کر کے اسے ڈیبیٹس سیکشن کو بھیجا تھا اور یہ تصیحات ریکارڈ میں شامل کیوں نہیں کی گئیں۔ اس بارے میں، میں صرف سوچ سکتا ہوں یہ ایک غیر دانستہ غلطی ہوسکتی ہے یا پھر ایک دانستہ شرارت... آپ شاید اس وضاحت کو قبول نہ کریں اور اسے ''پس از مرگ واویلا'' سمجھیں۔ لیکن میں جو حقیقت بیان کر رہا ہوں اُس کے بعد مزید کسی وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

میں نے جو دلیل پیش کی تھی وہ یوں تھی کہ اُن سے (مخالف رہنماؤں کے ساتھ) میرے شدید اختلافات ہیں۔ لیکن میں ''میسا'' کے تحت ان کی نظر بندی کو کسی صورت میں قبول نہیں کر سکتا۔ ''میسا'' ایک ایسا قانون جو سمگلروں کے خلاف استعمال کیا گیا ہے۔ رہی یہ حقیقت کہ میں نے آپ کے ساتھ اپنے اختلافات کی شدت کو بیان کیا ہے۔ صرف ایک نتیجے کا مظہر ہے۔ وہ یہ کہ مرارجی کا شدید ترین مخالف بھی اُس کے خلاف حکومت کے موقف کو تسلیم نہیں کر سکتا اور یہ بات ریکارڈ سے صاف ظاہر ہوئی ہے اس بات کو چھوڑ کر کہ مسودے میں کون سے الفاظ موجود ہیں، ہر کوئی میری اس تقریر میں طنز آمیز انداز بیان کو صاف طور محسوس کرے گا۔

یہ پہلی بار نہیں ہے کہ جب ناشر کی غلطی نے کہے گئے لفظ کے معنی تبدیل کر کے اسے بالکل دوسرے رنگ میں پیش کیا ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس بارے میں میری وضاحت کو قبول کرینگے۔

اب کیا میں آپ کی توجہ چند دیگر باتوں کی طرف مبذول کر سکتا ہوں۔ میرا یہ دعویٰ نہیں ہے میں نے ہمیشہ آپ کی سراہنا کی ہے یا ان تمام باتوں سے اتفاق کیا ہے جو آپ نے کہی ہیں، یا جو آپ کا موقف تھیں۔ بات اس کے بالکل برعکس ہے میں نے آپ کی ذات پالیسی اور سیاست سے ۲۵ جون ۱۹۷۵ء تک کی سخت مخالفت کی ہے کہ جس دن سے آپ مسز گاندھی کے آمرانہ نظام کے خلاف ایک احتجاجی علامت بن کر ابھرے۔

اس دن سے لے کر میں نے اپنے آپ کو نہ صرف کہ آپ اور آپ کے

دوسرے ساتھیوں سے بلکہ اس مقدس کاز سے وابستہ کیا، کہ جس کی نمائیندگی آپ کرتے تھے۔ اس دن سے لے کر آپ سے میری وابستگی اور آپ کی حمایت کا آپ کے وزیراعظم بننے سے کوئی تعلق نہیں، پارلیمنٹ میں میری مختلف تقاریر آپ کو مطمئن کریں گے کہ ان افراد سے جو مسز گاندھی کے ظلم وستم کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ میری وابستگی مکمل اور غیر مشروط تھی اور یہ وابستگی اور حمایت اس وقت بھی اپنے عروج پر تھی کہ جب مسز گاندھی کو عظیم ترین سمجھا جاتا تھا۔ اس کے لئے مجھے ایک بھاری قیمت چکانی پڑی۔ لیکن میرے دل میں اس کے لئے کوئی افسوس نہیں۔ کوئی گلہ نہیں میں آپ کو یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میری اس وضاحت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں آپ سے کوئی فائدہ حاصل کر سکوں۔ بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ میں ریکارڈ کو درست کر لوں اور ایک غلطی فہمی کو دور کر سکوں۔ اس سلسلے میں آپ سے یہ درخواست کروں گا کہ آپ میرے پہلے خط پر کوئی غور نہ کریں اور اسے واپس بھی ہوا سمجھیں۔ ☆☆☆

نئی دہلی، ۹ ستمبر ۱۹۷۷ء

ڈیر شمیم!

آپ نے اپنے آپ کو ایک ایسی بات کا دفاع کرنے کی زحمت سے بچا لیا ہوتا، کہ جسے میں ناقابل دفاع سمجھتا ہوں۔ آپ کی وضاحت نے مجھے ان الزامات کے بارے میں مطمئن نہیں کیا ہے کہ جو آپ نے میرے خلاف لگائے ہیں۔ اس کے علاوہ میرے فرزند کے بارے میں آپ نے وضاحت کا ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے۔ اگر آپ اسی طرح

میرے تئیں اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہیں تو میں اس کے بارے میں صحیح طرح سوچ سکتا ہوں۔ ☆☆☆

سری نگر، ۱۲۷ستمبر ۱۹۷۷ء

ڈیر مرار جی! آپ کا خط ملا اور مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ اس خط نے مجھے بری طرح مایوس کر دیا ہے ایسا لگتا ہے کہ آپ کی خود ستائی کو آپ کے تازہ اقتدار کے غرور نے اور زیادہ سخت بنالیا ہے ورنہ قدرتی طور جہاں تک اس خط وکتابت کا تعلق ہے، یہ اسی نکتے پر ختم ہونی چاہیے تھی۔

لیکن آپ کے خط میں آپ کے فرزند کا ذکر ایک ایسے مسلے کو جنم دیتا ہے جو کافی اہمیت کا حاصل ہے اور میں اس بارے میں آپ کو اپنے نکتہ نظر سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

اس بات پر آپ کا غصہ اور ناراضگی کہ آپ کے فرزند کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے بلاشبہ ایک المناک امر ہے آپ نے کیوں اور کیسے اس بات کی توقع رکھی تھی؟ کیا آپ کا بیٹا اتنا مقدس ہے کہ اس کے یا اس کی حرکات وسکنات کے بارے میں کوئی بھی تنقید آمیز فقرہ واپس لیا جائے یا اس کی تردید کی جائے، تاکہ آپ کی خوشنودی حاصل کی جاسکے۔

ایسا لگتا ہے کہ آپ یہ صلاح دے رہے ہیں کہ مجھے آپ سے اور آپ کے بیٹے سے اس بات پر معافی مانگنی چاہیے تھی کہ جو میں نے ایمرجنسی کے اعلان سے قبل اس کے بارے میں کہی تھی اور اگر آپ کے بیٹے پر تنقید کرنے والوں کے بارے میں آپ کا یہی رویہ رہا تو مجھے اس بات کا خدشہ ہے کہ آپ کو چندر شیکھر، مدھو لیمائے اور جارج فرنانڈیس

...ساتھیوں کی صحبت سے ہاتھ دھونا پڑے گا، کیوں کہ انہوں نے آپ کے بیٹے کے بارے میں پچھلے دس سالوں کے دوران جو انکشافات کئے ہیں، وہی آپ کے فرزند کے بارے میں میری کہی باتوں کی بنیاد ہیں۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ آپ ان حضرات سے اس بارے میں کچھ کہنے کی جرأت نہ کرسکیں گے۔ صاف ظاہر ہے کہ صاحب اقتدار اور اقتدار سے باہر لوگوں سے پیش آنے کے سلسلے میں آپ کے دوہرے معیار، گاندھیائی فلسفے پر آپ کے اعتقاد سے کوسوں دور ہیں۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے لیڈر اپنے فرزندوں کے بارے میں ایک Complex کا شکار ہیں اور یہ احساس یا Complex اس وقت فوری طور ظاہر ہوتا ہے کہ جب وہ کسی طرح سے اقتدار کی کرسی پر براجمان ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں جہاں تک آپ کے فرزندوں کا تعلق ہے، مسز گاندھی اور آپ کا رویہ مشترک ہے۔ آپ دونوں کا اس بات پر ایمان ہے کہ آپ کے فرزند کوئی غلط کام کر ہی نہیں سکتے اور مسز گاندھی کی طرح آپ بھی یہی کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ ''کوئی بھی شخص جو میرے فرزند پر کوئی حملہ کرتا ہے وہ مجھ پر حملہ کرنے کے مترادف ہے''

اور یہ صورت حال کسی بھی طرح تسلیم نہیں کی جاسکتی اور میرے خیال میں یہ ہندوستان کے وزیراعظم کے شایان شان نہیں کہ وہ اپنے بیٹے سے اپنے آپ کو مکمل طور وابستہ کرے اور نہ ہی میں اس بات کو صحیح سمجھتا ہوں کہ ایک عظیم ملک کا وزیر اعظم اپنے بیٹے کا پبلک ریلشنز آفیسر بن جائے۔

اگر مسٹر کانتی کو مجھ سے کوئی شکایت ہے تو بہتر یہ تھا کہ اُسے

مشورہ دیا جاتا کہ وہ براہ راست مجھے اس کے بارے میں لکھتا، بجائے اس کے کہ وہ اپنے باپ کے شاہی عطا کا سہارا لے کر اپنے نقادوں پر حملہ آور ہو..... ☆☆☆☆☆

نئی دہلی، یکم اکتوبر ۱۹۷۷ء

ڈیر شمیم!

آپ کا ۲۷ر ستمبر ۱۹۷۷ء کا خط ملا اور مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ آپ نے میرے خط کا جواب دیتے ہوئے غیر ضروری اور بے ہودہ غصے سے کام لیا ہے جو غیر معقول اور غیر منصفانہ اشاروں پر مشتمل ہے۔

عام طور سے میں ایسے تلخ اور تند خط کا جواب دینے کو غیر ضروری سمجھتا، مگر چوں کہ آپ نے اس میں چند نکات ابھارے ہیں میں نے یہ سوچا کہ میں ان پر ٹھنڈے دل ودماغ سے اپنا خیال پیش کروں۔

سب سے پہلے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ آپ کے دفاع نے مجھے بالکل مطمئن نہیں کیا ہے یہ اس بناء پر کہ اس میں آپ نے ہمارے خلاف ۲۲ اور ۲۳ جولائی ۷۵ء کو لوک سبھا میں تقریر کرتے ہوئے جو کچھ کہا تھا اس کی تردید میں کچھ نہیں کہا گیا ہے خاص طور پر کہ جب میں نظر بندی کے ایام گذار رہا تھا۔

آپ نے پوچھا ہے کہ کیا میرا بیٹا اتنا مقدس ہے کہ کوئی بھی اس کے خلاف ایک تنقیدی جملہ بھی نہیں بول سکتا۔ میرے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں، لیکن مجھے امید ہے آپ اس بات کو تسلیم کریں گے کہ ہر ایک شخص خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا یا بڑا کیوں نہ ہو، کی عزت اور توقیر ایک مقدس شئے ہوا کرتی ہے۔

۱۹۶۸ء میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت میرے فرزند کی

کارکردگی کی بناء پر مجھ پر پارلیمنٹ میں شدید حملے کیئے گئے اور میں نے اس بارے میں مفصل اور حقیقت آمیز بیان دیا تھا کہ جس کے بعد یہ باب بند ہو گیا۔ میں نے پہلے ہی اس بات کا اعلان کیا ہے کہ اگر میرا بیٹا کسی بھی غلطی کا مرتکب ہو گا میں اس کے خلاف کاروائی کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔ تب یہ سوال کہاں سے پیدا ہوتا ہے کہ میرے فرزند کے ساتھ ملک کے دیگر شہریوں کی نسبت مختلف سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ مجھے اس بات کا علم نہیں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اس کا آپ پر کچھ اثر ہو گا یا نہیں، لیکن میں نے آپ کو سمجھانے کی ایک اور کوشش کی تھی۔ لیکن آپ ابھی بھی اس بات پر ڈٹے ہوئے ہیں کہ آپ نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔

میں چاہوں گا کہ اس مسئلے کو یہیں ختم سمجھا جائے۔ اس امید کے ساتھ کہ آپ. کا ضمیر خود کسی دن آپ پر تمام باتیں واضح کرے گا۔ بجائے اس کے اس مسئلے کو اس وقت طول دیا جائے۔ ☆☆☆

سرینگر، ۲ نومبر ۱۹۷۷ء

ڈیر پرائم منسٹر!

مجھے انتہائی خوشی ہوئی کہ آپ نے اس بات کو سمجھ لیا ہے کہ ہر ایک شخص خواہ وہ کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو، کی عزت اور توقیر میں ایک تقدس ہوتا ہے لیکن کیا یہ کسی خود پسندی کی علامت ہے کہ آپ نے اس خط وکتابت کے شروع سے ہی میرے بارے میں ایک ہتک آمیز رویہ اختیار کیا ہے۔ آپ نے نہ صرف میرے کہے ہوئے پر اعتبار نہ کیا بلکہ متواتر طور میری پوزیشن کو ایک خط میں ناقابل دفاع اور دوسرے میں بے ہودہ غصہ کہہ

کر میرے زخموں پر نمک پاشی کی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ آپ نے اپنے دماغ کی تمام کھڑکیاں بند کر لی ہیں اور میری تمام تر کوششیں، کہ میں آپ کے تئیں نیک خواہشات رکھتا ہوں، فائدہ مند ثابت نہیں ہوسکی ہیں۔ اب جب کہ میں آپ کو مطمئن کرنے میں ناکام ہو گیا ہوں، میں اس خط وکتابت کو شایع کروانے کے لئے آپ کی اجازت چاہوں گا تاکہ میں ہندوستانی عوام کے سامنے اپنا نکتہ نظر بیان کرسکوں، جو آپ سے زیادہ میرے اور ایمرجنسی کے تاریک دور کے دوران میرے رول کے بارے میں واقفیت رکھتے ہیں۔ آپ نے خط کا اختتام اس امید پر کیا ہے کہ میرا ضمیر کسی روز مجھے روشن راہ دکھائے گا، میری دعا ہے کہ میں بھی آپ کے لئے ایسی ہی خواہش کا اظہار کرسکوں۔☆☆☆

نئی دہلی ۹ نومبر ۱۹۷۷ء

ڈیر شری شمیم!

میں نے اس امید پر خط وکتابت کا سلسلہ بند کیا تھا کہ ایک دن آپ اپنی غلطی پہچان جائیں گے کہ جو آپ نے ۲۲ اور ۲۳ جولائی کو لوک سبھا میں تقریر کرتے وقت ہمارے بارے میں چند باتیں کہی تھیں کہ جب ہم اپنا دفاع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، لیکن آپ نے پھر لکھا ہے کہ آیا مجھے اس بات پر کوئی اعتراض ہے کہ اگر لوگ اس بات کا فیصلہ کرلیں کہ کون غلطی پر ہے۔ مجھے خط وکتابت کی اشاعت پر اس خط کے سمیت کوئی اعتراض نہیں۔

لوگ ہی اب ان کا فیصلہ کریں!

۱۳/ مئی ۱۹۷۸ء

چیف جسٹس میاں جلال الدین کے نام

عزت مآب!

یہ امر ہم سب کے لیے باعثِ افتخار اور موجب مسرت ہے کہ ریاستی ہائی کورٹ، جب اپنی پچاس سالہ سال گرہ منا رہی ہے تو اس کی زمامِ اقتدار ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہے کہ جس کا تقرر اور انتخاب کسی خاندانی وجاہت، قربِ شاہی یا نظر کرم کا مرہون منت ہونے کی بجائے اس کی اپنی حیثیت، صلاحیت اور آئینی استحقاق کا اعتراف ہے۔ ریاستی ہائی کورٹ کی تاریخ میں اگرچہ اس سے پہلے بھی دو ریاستی باشندوں کو اس منصبِ جلیل پر فائز ہونے کی سعادت حاصل رہی ہے لیکن میری رائے میں آپ پہلے authentic کشمیری ہیں، کہ جنہیں ریاستی عدلیہ کی رہنمائی کا فرض سونپا گیا ہے۔ آپ کے پیش رو جسٹس جانکی ناتھ وزیر اور سپریم کورٹ کے موجودہ جسٹس راجہ جسونت سنگھ دونوں ہی بڑے لائق، فائق، قابل اور قابلِ احترام جج تھے، لیکن ان کی قابلیت اور اہلیت کے علاوہ حکمران ڈوگرہ خاندان سے ان کا قرب بھی ان کی عزت افزائی کا ایک سبب تھا۔ آپ اس اعتبار سے پہلے ریاستی چیف جسٹس ہیں کہ جو خاندانی وجاہت اور ذاتی اثر ورسوخ کی بجائے اپنے آئینی حق کے سہارے ان بلندیوں تک پہنچ گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ہمارے لیڈر صاحبان احساس کمتری کا شکار نہ ہوتے، تو آپ کو آج سے تین سال پہلے اس عہدہ جلیلہ پر سرفراز ہونا چاہیئے تھا۔ بہرکیف،

دیر آید درست آید، اب جبکہ حق وار کو اپنا حق مل گیا ہے ہمیں ماضی کی تلخیوں کو بھول کر مستقبل کی فکر کرنا چاہیے۔

فضیلت مآب! میرے لیے آپ کو یہ یاد دلانا چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق ہوگا، کہ عدلیہ کو ہمارے جمہوری نظام اور سماجی ڈھانچے میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور ملک کے حالیہ واقعات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ اس نظام کو فرد اور جماعتوں کی من مانیوں سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری بھی عدلیہ پر ہی عاید ہوتی ہے۔ یہ بات ہم سب کے لیے باعث فخر اور موجب اطمینان ہے کہ سپریم کورٹ کے مقابلے میں ریاستی ہائی کورٹوں نے یہ فرض زیادہ تن دہی مستعدی اور دیانت داری سے انجام دیا ہے اور ایمرجنسی کے دوران مختلف ہائی کورٹوں کے جرأت مندانہ فیصلوں نے ہائی کورٹوں کے وقار اور اعتبار کو بہت بلند کر دیا ہے۔ آج جبکہ ہم ریاستی ہائی کورٹ کی پچاس سالہ سالگرہ منا رہے ہیں۔ اس حقیقت کا اعادہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ہماری ہائی کورٹ نے اپنے قیام سے اب تک آزادی، غیر جانبداری اور خودمختاری کی جاندار اور شاندار روایت قائم کی ہیں۔ ڈوگرہ شاہی کے دورِ استبداد میں بھی ریاستی ہائی کورٹ عدل وانصاف کے معیار قائم کرنے میں کسی دوسری ہائی کورٹ سے پیچھے نہیں تھی اور یہ بات مہاراجہ ہری سنگھ کے حق میں کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے عدلیہ کی سربراہی کے لیے ہمیشہ ممتاز اور غیر معمولی قابلیت کے افراد کا انتخاب کیا۔ میری خواہش ہے کہ آپ کی سربراہی میں ریاستی عدلیہ نہ صرف ان روایات کو قائم رکھے، بلکہ انہیں آگے بڑھا کر ملک کی دوسری ریاستوں کے لیے

ایک نئی مثال اور ایک نیا معیار پیش کرے۔

جناب والا! مقبولِ عام لیڈروں اور برخود غلط ڈکٹیٹروں میں ایک بات مشترک ہوتی ہے اور وہ یہ کہ دونوں اپنے آپ کو ملک اور قوم کے ہم معنی اور ہم رتبہ سمجھتے ہیں۔ وہ جب عوام ملک یا قوم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد ان کی ذات ہوتی ہے۔ ان کی اس غلط فہمی یا خوش فہمی کو رفع کرنے کی ذمہ داری چونکہ عدلیہ پر عاید ہوتی ہے، اس لیے اکثر مقبول عام حکمران اور ڈکٹیٹر دونوں ہی عدلیہ کو متاثر یا محکوم بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ریاست پر پچھلے پچاس سال سے قاید اعظم جناب شیر کشمیر کی حکمرانی ہے۔ وہ جب حکومت کے سربراہ نہیں ہوتے، تو عوام کے محبوب ہوتے ہیں لیکن اب کی بار وہ حکمران بھی ہیں اور عوام کے محبوب بھی اُن کی یہ غیر معمولی طاقت اور بے پناہ سیاسی قوت اگر ایک طرف ایک بہت بڑا سیاسی اور قومی سرمایہ ہے تو دوسری طرف اس ریاست میں قانون اور آئین کی علمداری کے لیے بہت بڑا خطرہ بھی ہے۔ شیخ صاحب بہت سی ذاتی خوبیوں کے مالک اور اعلیٰ اقدار کے محافظ ہونے کے باوجود کچھ انسانی کمزوریوں کا بھی شکار ہیں اور یہ بہت بڑی ستم ظریفی ہے کہ وہ جمہوریت کے بہت بڑے علمبردار ہونے کے باوجود فطرتاً اور مزاجاً جمہور پسند نہیں ہیں۔ وہ آزادی رائے کے بہت بڑے دعویدار ہونے کے باوجود مخالفانہ نکتہ نظر کو برداشت کرنے کے روادار نہیں ہیں۔ وہ اپنے قصیدے پڑھنے والوں کو قصیدے پڑھنے کی ترغیب دے سکتے ہیں، لیکن اپنے مخالفوں کی تنقید برداشت نہیں کر سکتے۔ ان میں انتقام گیری کا جذبہ ضرورت اور اعتدال

سے زیادہ ہے۔ اس لیے اس بات کا زبردست اندیشہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی دشمنوں اور کچھ سیاسی مخالفوں سے نپٹنے کے لیے قانون کا ناجائز استعمال کرنے کی کوشش کریں اور اس بات کا احتمال ہے کہ وہ اپنے نکتہ چینوں کی زبان بند کرنے کے لیے زور زبردستی کا سہارا لیں۔ اس بات کا امکان ہے کہ "عوامی اعتماد" سے مغلوب اور مغرور ہو کر وہ اپنے ہر مخالف کو ملک اور قوم کا دشمن قرار دے کر اپنے جذبۂ انتقام کو آسودہ کریں۔ ان کو اعتدال اور قابو میں رکھنے کا کام صرف ریاستی عدلیہ ہی انجام دے سکتا ہے اور اس لحاظ سے ریاستی عدلیہ کی ذمہ داریوں میں بالعموم اور عدالت عالیہ کی ذمہ داریوں میں بالخصوص غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ کی قیادت میں ریاستی عدلیہ اور عدالت عالیہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

می لارڈ! اس ریاست میں آپ کا منصب سب سے زیادہ معزز بھی ہے اور مستحکم بھی۔ ملک کے آئین میں آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے منصب کو جو تحفظ حاصل ہے اس کے پیش نظر ایوان اقتدار کا کوئی فرعون آپ کی طرف ترچھی نگاہ سے بھی نہیں دیکھ سکتا۔ عدلیہ کو یہ تحفظ اور تقدس اسی لیے دیا گیا ہے، کہ وہ حکمرانوں اور جاہ پرستوں کی من مانیوں اور فرد کے حقوق کے درمیان عدل اور انصاف کا معیار بن کر جمہوری ڈھانچے کو تحس نحس ہونے سے بچائے اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ایمرجنسی کی شب تاریک میں بھی ریاستی ہائی کورٹوں نے اپنی عزت، شہرت، وقار اور اعتبار کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ آپ کو ریاستی عدلیہ کا سربراہ بنا کر آپ پر کسی نے کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ آپ کے

ساتھ کی گئی زیادتی کی تلافی کی گئی ہے۔ اس لیے کسی شخص کو آپ سے یہ توقع رکھنے کی حماقت نہیں کرنا چاہیے کہ آپ کسی احسان مندی کے احساس سے متاثر ہوکر اپنے فرایض میں کوتاہی کریں گے۔ اس قسم کا احساس بھی آپ کی اور ریاست کے عدلیہ کی توہین کے مترادف ہوگا۔

می لارڈ! یہ ایک خوشگوار اتفاق ہے کہ موجودہ ریاستی ہائی کورٹ کے سبھی جج صاحبان کا تعلق ریاست جموں و کشمیر سے ہے اور یہ سب کے سب آسمان سے اترنے کی بجائے اس زمین کی مخلوق اور خاص طور پر ریاستی عدلیہ کی پیداوار ہیں۔ جس طرح آپ خود عدلیے کی نچلی سطح سے ابھر کر اس کے افق پر طلوع ہوئے ہیں، اسی طرح آپ کے دوسرے ساتھی بھی درجہ بدرجہ تربیت اور ترقی پاکر اپنی معراج کو پہنچے ہیں۔ میں یہ بات کسی علاقائی تعصب، تنگ نظری یا بیمار حب الوطنی کے جذبے سے متاثر ہوکر نہیں کہہ رہا ہوں۔ بلکہ اپنے جذبۂ افتخار اور قومی وقار کی تسکین کے لیے دہرا رہا ہوں۔ کیوں کہ ماضی بعید اور ماضی قریب میں ریاستی باشندوں کو بالعموم ایسے ذمہ دار اور اعلیٰ عہدوں پر فایز کرتے وقت حکمرانوں کو ایک نامعلوم سی جھجک اور بے نام سے وقتوں کا احساس ہوتا تھا۔ ہمارے حکمران دل ہی دل میں ریاستی باشندوں کو عدلیہ کی آزادی، غیر جانبداری اور خودمختاری برقرار رکھنے کے نا اہل سمجھ کر غیر ریاستی ججوں کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ خود آپ کو بھی اہل اقتدار کے اس احساس کمتری کی وجہ سے اپنے جائز مقام اور منصب پر پہنچنے کے لیے اڑھائی سال کی تاخیر کا شکار ہونا پڑا۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ بہت سے تلخ تجربات اور ناکامیوں کے بعد امیر کارواں کا قافلے دانوں کی قابلیتوں اور صلاحیتوں پر اعتماد بحال ہوگیا

ہے۔ یہ ہم سب کے لیے شگون نیک ہے۔

یور آنر! آپ ایک ایسے دور اور کچھ ایسے مخصوص حالات میں ریاستی عدلیہ کے سربراہ مقرر ہوئے ہیں کہ آپ کی کامیابی اور ناکامی پر ریاستی عدلیہ کے وقار اور اس کے اعتبار کا دارومدار ہے۔ میں آپ کو اس ناگوار اور تلخ حقیقت کا احساس دلانا چاہتا ہوں کہ آپ کو عدلیہ کا سربراہ منتخب کرنے کا تکلیف وہ فیصلہ موجودہ حکمرانوں نے اس وقت کیا کہ جب آپ کے پیش رو جناب جسٹس رفیع الدین انصاری نے ان کی توقعات خواہشات اور احکامات کو نظر انداز کر کے صرف عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کی پالیسی کو اپنا شعار بنایا۔ آپ کو شاید علم نہ ہو کہ جسٹس انصاری جو یہاں بڑی امیدیں لے کر آئے تھے یہاں سے بہت مایوس ہو کر لوٹے ہیں اور ان کی مایوسی کا سبب تھا ریاستی انتظامیہ کے قایدین کی ریاستی عدلیہ میں غیر ضروری اور نامناسب مداخلت ۔جسٹس انصاری کی اصول پرستی اور انصاف پسندی سے ناراض ہونے والے یقیناً آپ کی غیر جانبداری ،اصول پسندی اور آزادانہ روش سے خوش نہیں رہ سکتے۔ اس لیے اس بات کا زبردست امکان ہے کہ موجودہ ریاستی حکومت، کبھی براہ راست اور کبھی بالواسطہ عدلیہ کو مرعوب، متاثر یا مجروح کرنے کے لیے وہی ہتھکنڈے آزمائے کہ جو ہر حکمران اپنے دور میں عدل وانصاف کے ایوانوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے کرتا آیا ہے۔ اس بات کا اندیشہ ہے کہ آپ کی شرافت، اعلیٰ اخلاق، سماجی تعلقات اور سیاسی پس منظر سے ناجائز فایدہ اٹھانے کی کوشش میں ریاستی عدلیہ کی شاندار روایات کو مشکوک یا مجروح

کر دیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے اور آپ کے ساتھی جج صاحبان کے ریاستی باشندہ ہونے کے ناطے آپ سے یہ توقع رکھی جائے کہ آپ حکومت اور فرد انتظامیہ اور عوام کے درمیان حکومت اور انتظامیہ کو فرد، اور عوام پر ترجیح دیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی سربراہی اور آپ کے ساتھیوں کی شخصی دیانت اور قانونی اہلیت ان تمام اندیشوں اور وسوسوں کا مناسب اور موثر جواب ہے لیکن اس کے باوجود اگر میں ان اندیشہ ہائے دور دراز کی طرف اشارہ کر رہا ہوں تو اس کا سبب ریاست کے موجودہ مخصوص حالات اور موجودہ حکمرانوں کی ذہنیت اور ان کی فطرت سے ہے۔

قائد عدلیہ! میں اگر آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو قانون، انصاف، عدل اور جمہوریت کا محافظ قرار دوں، تو کوئی مبالغہ نہیں۔ جذباتی سیاست اور بے اصول سیاست دانوں کی بداعتدالیوں پر روک لگا کر انہیں قانون کی حدود اور آئین کے تقدس کا احساس دلانا صرف آپ ہی کے بس کی بات ہے اور ریاستی ہائی کورٹ کی اس پچاس سالہ سالگرہ کی تقریب پر میں آپکو اور آپ کے ساتھیوں کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے یہ یاد دلانا چاہوں گا کہ آپ کے ہاتھوں میں اس ریاست کے شہریوں کی عزت بھی ہے اور اس ریاست میں جمہوری اقدار کے تحفظ کا فرض بھی، میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کو ان فرائض کو بہ احسن انجام دینے کی توفیق بھی دے اور وقتاً فوقتاً حکومت اور حکمرانوں کو ناراض کرنے کا حوصلہ بھی۔

نیاز مند

شمیم احمد شمیم

✿✿✿

۱۸/ جون ۱۹۷۸ء

شیخ جی کے نام پریم پتر

(چراغ بیگ کی اور سے)

شریمان شیخ عبداللہ جی!

تامل ناڈو کے مکھیہ منتری جی رام چندرن کے نام آپ کا دوسرا پریم پتر پڑھ کر مجھے یہ بھاونا ملی ہے کہ اب آپ صرف ہندی بھاشا میں ہی بات کرنا اور سننا پسند کریں گے۔ اس لئے مجھے چھما کیجئے کہ میں آج آپ کو آپ کی من پسند بھاشا میں ہی یہ پتر لکھ رہا ہوں۔ کیول مجھے اس بات کا پوری طرح وشواش ہے کہ آپ کو چونکہ پڑھنے لکھنے سے زیادہ بھاشن دینے کا شوق ہے، اس لیے آپ میرے اس کھلے پتر کو پڑھنے کی بجائے ریاستی سوچنا و بھاگ کی بنائی ہوئی وہ فلمیں دیکھنا پسند کریں گے، کہ جن میں آپ کو سرینگر سے پہلگام تک اڑن کھٹولہ یعنی ہلی کاپٹر میں یاترا کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ پرنتو مجھے آشا ہے کہ میں جو کچھ کہوں گا اس پر آپ ویکتی گت روپ سے وچار کریں گے۔

مہان نیتا! آپ نے تامل ناڈو کے فلم ابھینیتا مکھیہ منتری کو دیش بھگتی اور بھارتی اتہاس کا جو پریچے کرایا ہے آپ کو یہ سن کر بڑی پرسنتا ہوگی کہ اس سے اتری بھارت کی ہندو جنتا کو بڑی پرسنتا ہوگی اور اگر آپ نے ہندی کے بارے میں اپنے واکھیان اسی طرح جاری رکھے، تو مجھے پورا وشواس ہے کہ بھارت کی ہندی نواز ہندو جنتا آپ کو ایک بار پھر اسی طرح وشواوتار ماننے لگے گی کہ جس طرح ۱۹۵۳ء سے

پہلے مانا کرتی تھی۔ آپ کے پہلے واکھیان پر توجے پرکاش بابو نے
صرف دھینہ واد کا ایک تار دیا تھا۔ لیکن اب جو آپ نے ہندی کے
بارے میں اپنے وچار بالکل ہی اس پشٹ کر دیئے ہیں، اس سے یہ لگتا
ہے کہ ودیش یاترا سے لوٹتے ہی پردھان منتری مرارجی ڈیسائی بھی آپ
کو پریم پتر لکھیں گے کیونکہ آپ نے ہندی بھاشا کے پرتیگ ہی نہیں،
بھارت ایکتا، اس کے اتہاس اور شکتی پر بھی بڑا ہی زور دار واکھیان دیا
ہے۔ تامل ناڈو کے فلم ابھنیتا مکھیہ منتری کو اب پتہ چل گیا ہوگا کہ اس
دیش میں اس سے بڑے ابھینیتا موجود ہیں اور ان ایکٹروں میں سب
سے بڑا ایکٹر کشمیر کا شیر ہے کہ جو جنگلوں میں آزاد پھرنے کے بجائے
اڑن کھٹولوں یعنی ہیلی کاپٹروں میں گھومتا ہے اور سیکرٹریٹ کے پنجرے
میں دو دو گھنٹے بھاشن دیتا ہے۔ قسم بھگوان کی کہ آپ نے اپنی ایکٹنگ

سے رام چندرن کا پٹھا بٹھا دیا ہے۔

شیر بھارت! ایسا لگتا ہے کہ راشٹرپتی نیلم سنجیوا ریڈی نے چند
ماہ پہلے آپ کو شیر بھارت کا پرسکار دیکر آپ کا من کچھ ایسا موہ لیا ہے
کہ آپ واقعی شیر بھارت بننے کے چکر میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ ہندی
بھاشا سے آپ کا یہ پریم اور ملک کی بگڑتی ہوئی استتی پر آپ کا یوں بے
چین ہوجانا کہ آپ جے پرکاش کو پتر پر پتر لکھ رہے ہیں کہ وہ جنتا پارٹی
کو تباہ ہونے سے بچائیں اس وچار دھارا کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے
ورنہ رام چندرن کو یہ یاد دلانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ آپ نے
ملک کی سونترا ادراس کے سنگھرش میں بڑا زور دار حصہ لیا ہے اور آپ
ملک کی ایکتا کو قایم رکھنے کے لیے ہر ممکن بلیدان دینے کے لیے تیار

ہیں۔ لیکن شیخ جی! مجھے چھما کیجیے کہ بھارت کی ایکتا اور ہندی بھاشا
بول بالے کی یہ باتیں آپ کی زبان سے کچھ جچتی نہیں۔ پورے بائیس
سال تک آپ کشمیر کی جنتا کو بھارت سے علیٰحدگی اور دوری کا سبق
پڑھاتے رہے ان کے دلوں میں ہندوں غلبے اور بلراج مدھوک کے
راشٹریہ کرن کا خوف پیدا کرتے رہے۔ بھارتی فوجوں کو غیر ملکی سینا کا
نام دیکر یہاں کے یووکوں کو بھڑکاتے رہے۔ ریاست کو آزاد اور خود مختار
بنانے کا سپنا بنتے رہے۔ رائشماری محاذ کے نام پر ریاست کی جنتا اور
ملک کی جنتا میں مت بھید پیدا کرتے رہے۔ دس سال پہلے اسی جے
پرکاش نراین نے جب حضوری باغ میں صرف یہ کہنے کی گستاخی کی تھی
کہ بھارت سے الگ ہونے کی بات چھوڑ دو باقی جو چاہتے ہو مانگ لو،
تو آپ نے اس مہمان نیتا کو بھرے جلسے میں بے عزت کرتے ہوئے
دھمکی دی تھی کہ آزادی دی نہیں جاتی، چھینی جاتی ہے۔ پورے بائیس
سال تک آپ نے بھارتی ناگرک ہونے سے بھی انکار کیا، حتیٰ کہ اپنے
پاسپورٹ میں بھی اپنے آپ کو کشمیری لکھا، دُنیا بھر کے اخبارات میں اپنے
یہ وچار چھپوائے کہ بھارت کا کشمیر پر کوئی حق نہیں۔ بھارتی سینا کو غاصب
اور جابر کہہ کر ساری دنیا میں بدنام کر دیا کشمیری نوجوانوں کو یہ پٹی پڑھائی
کہ وہ الجیریا کے لوگوں کی طرح بھارت کے خلاف گوریلا جنگ لڑیں،
ریاست کے ہر ذی شعور اور صحیح سوچنے والوں کو آئی بی ایجنٹ کا نام دیتے
رہے۔ یہ سب کچھ آپ بائیس سال تک کہتے اور کرتے رہے اور آج بے
چارے رام چندرن کو آپ قومی ایکتا، یک جہتی اور ساٹھ کروڑ ہندوستانیوں
کے لیے ایک بھاشا کا واکھیان دے رہے ہیں۔ بھلا بتائیے، آپ کی زبان

سے یہ سارے شبد سن کر دنیا کے لوگ کیا سوچتے ہوں گے۔

پوچھیہ شیخ جی! یہ تو بائیس ورش پرانی باتیں ہیں ان کو جانے دیجئے۔ آپ کو یاد ہے کہ ابھی ایک سال پہلے ریاستی اسمبلی کے متدان جیتنے کے لیے آپ نے کیا کچھ کیا؟ آپ کو یاد ہے کہ آپ نے محض بھولے بھالے کشمیری مسلمانوں کے جذبات ابھارنے اور جنتا پارٹی کو بدنام کرنے کے لیے دھمکی دی تھی کہ اگر دھارا ۳۷۰ کو کمزور کرنے کی کوشش کی گئی تو کشمیر کا ہندوستان سے الحاق خطرے میں پڑ جائے گا، اس وقت آپ کو بھارت کی ایکتا، اس کے اتہاس اور ہندی بھاشا کے مدھر بول کیوں یاد نہیں آئے۔ رام چندرن کو تو ودھان میں اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ ہندی بھاشا کو غیر ہندی علاقوں پر ٹھونسا نہیں جائے گا اس نے تو صرف اسی آئینی ضمانت کی رکھشا کے لیے آپ سے اشتراک کرنے کی درخواست کی تھی۔ اُسے آپ اپنے آئینی حق اور ضمانت کا تحفظ کرنے کے لیے قومی ایکتا اور بھارتی اتہاس کی دہائی کیوں دے رہے ہیں؟ ریاستی اسمبلی کے متدان میں آپ نے علیحدگی پسندی، ہندوستان کے سمندر میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے، ہندو غلبے سے ریاستی مسلمانوں کو محفوظ رکھنے اور ۱۹۵۳ء کی پوزیشن بحال کرنے کی باتیں کر کے ریاست کے مسلمانوں اور ملک کے کروڑوں عوام کے درمیان مغائرت، تشکیک، بدظنی اور بے اعتمادی کی جو دیواریں کھڑی کر دی ہیں، انہیں ڈھانے میں ہمیں کم از کم پچاس سال کا عرصہ درکار ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود آپ کی یہ جرأت کہ آپ تامل ناڈو کے مکھیہ منتری کو قومی ایکتا، دیش کی سنسکرتی اور ہندی بھاشا کی برتری کا سبق پڑھائیں۔

میں سوچتا ہوں کہ کیا آپ کا ضمیر بھی آپ سے کوئی سوال نہیں کرتا؟ یا ممکن ہو کہ ستر سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد انسان کا ضمیر تھک کر سو جاتا ہو۔

مکھیہ منتری جی! میں جانتا ہوں کہ گنگا گئے تو گنگا رام، جمنا گئے تو جمنا داس کا دلچسپ محاورہ اگر ہندوستان کے کسی سیاسی لیڈر پر صادق آتا ہے تو وہ آپ کی پوتر ذات ہے۔ اسی لیے بانہال کے اس پار تو آپ اسوۂ حسنہ، اخلاق محمدیؐ، اسلام کی عظمت اور مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان بیان کرتے ہیں اور جموں کی سرحدوں میں داخل ہوتے ہی اپنے بھاشنوں میں ہندی کے موٹے موٹے شبد استعمال کر کے رام سیتا اور گیتا کا واکھیان شرع کرتے ہیں۔ مجھے پچھلے سال امرتسر میں سکھوں کے بھاری دیوان میں آپ کی وہ تقریر سننے کا موقع بھی ملا ہے کہ جس میں آپ نے گرنتھ صاحب سے کئی شبد پڑھ کر سکھوں میں بڑا جوش اور ولولہ پیدا کر رہا تھا اور ان کے جوش کو دیکھ کر آپ کو خود بھی اتنا جوش آگیا تھا کہ آپ نے للکار کر پوچھا تھا کہ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان میں امرتسر سے بھی زیادہ کوئی پوتر شہر موجود ہے؟ (اس وقت اجمیر شریف کا نام آپ کے ذہن سے اتر گیا تھا) آپ کا خیال ہے کہ یہی سیکولرازم ہے اور مجھے آپ کی اس وچار دھارا کے بارے میں کچھ نہیں کہنا ہے ہر سیاست دان اپنی سیاست کو آگے بڑھانے کے لیے کوئی نہ کوئی سوانگ رچاتا ہے۔ اس لئے میں اس بات کے لیے آپ کو دوشی قرار نہیں دیتا۔ لیکن جان کی امان پاؤں، تو ایک بات عرض کروں اور وہ یہ کہ بھارت میں بھاشا کی سمسیا اتنی آسان نہیں کہ جتنا آپ سمجھتے ہیں اور جی رام چندرن کے نام آپ کے

کرانتی کاری پتر پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے اس پریشن کو ٹھیک سے سمجھا بھی نہیں اور نہ آپ کو اس بات کا احساس اور اندازہ ہے کہ بھاشا کے اس مسئلے کے ساتھ کتنے ویشیش راج نیتک پریشن وابستہ ہیں۔ آپ نے رام چندرن کے نام اپنے پتر میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہندی بھاشا بھارت کے ہر حصے میں آسانی سے سمجھی جاتی ہے افسوس کہ آپ کے اس بیان سے آپ کی علمیت نہیں بلکہ لاعلمی، آپ کی بصیرت نہیں بلکہ تنگ نظری کا اظہار ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کبھی کیرالا، بنگال، مدراس، کرناٹک، پانڈی چری اور جنوبی ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔ آپ کو شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ ان علاقوں میں عام لوگ ہندی کا یک لفظ بھی نہیں سمجھ سکتے اور آپ کا یہ دعویٰ ہے کہ ہندی ہندوستان کے ہر علاقے میں آسانی سے سمجھی جاتی ہے اور دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ دعویٰ ہندی کے سب سے بڑے علمبردار جے پرکاش نرائن اور راج نرائن بھی نہیں کرتے۔

نیتا جی! میں آپ کو کیوں کر سمجھاؤں کہ دکشن بھارت کے لوگ ہندی کو راشٹر بھاشا ماننے کے لئے کیوں تیار نہیں۔ میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ ہندی کے غلبے کے خلاف تامل ناڈو میں سینکڑوں لوگوں نے اپنی جانیں کیوں دیں اور آج تامل ناڈو، کرناٹک اور آندھرا پردیش کے مکھیہ منتری، ہندی بھاشا کی زورزبردستی کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کی کیوں سوچ رہے ہیں؟ یہ سب کچھ سمجھنے کے لیے بھاشا کی دشیشتا اور اتہاس کی عظمت کا احساس ہونا ضروری ہے اور مجھے اس بات کا شدید احساس ہے کہ اپنی گونا گوں راج نیتک سرگرمیوں کی وجہ سے آپ کو زندگی بھر کبھی کسی بھاشا سے

پریم کرنے اور تہذیب اور تاریخ میں زبان کی اہمیت کو سمجھنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ آپ تاریخ بنانے میں اس درجہ مصروف رہے کہ آپ کو تاریخ پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا اسی لئے آپ نہ جی رام چندرن کے دکھ درد کو سمجھ سکیں گے اور نہ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور سردار جعفری کا کرب محسوس کریں گے۔ آپ نے زندگی بھر اقبال کے ترانے گا گا کر اپنی سیاست اور قیادت کی دکان چمکائی ہے۔ آپ کو کیا معلوم کہ جن شاعروں نے آپ کی بے زبانی کو زبان دے کر آپ کو اتنا بڑا نیتا بنا دیا وہ ہندی کے نہیں، اردو اور کشمیری کے کوی تھے۔ آپ کو تو اس بات کا بھی احساس نہیں کہ آپ کے وشال دیش بھارت میں اس معصوم اُردو کے ساتھ کیا ہو رہا ہے کہ جس نے بھارت کی آزادی کی جنگ میں ایک اتہاسک ردل ادا کیا ہے آپ پر تو ان دونوں ہندی کا بھوت سوار ہے اس لیے آپ کو ہندی، ہندو، ہندوستان کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آئے گا۔

شریمان جی! زندگی کے اس آخری دور میں مہاتما گاندھی اور جے پرکاش نراین بننے کی کوشش نہ کیجئے۔ آپ جو کچھ ہیں وہی رہیئے۔ یہ دن آپ کے آرام اور عشرت کے دن ہیں ممکن ہو تو اپنی قیام گاہ سے سیکرٹریٹ تک اڑن کھٹولے میں سفر کیا کیجئے۔ اس سے سفر کی زحمت کچھ کم ہو جائے گی۔ مجھے معاف کیجئے اگر اس پتر میں کہیں اردو یا انگریزی کا کوئی شبد آگیا ہو، آئندہ آپ کے نام ہندی سکرپٹ میں ہی پتر لکھا کروں گا۔

آپ کا اپنا

چراغ بیگ

❀❀❀

۲۹/جولائی ۱۹۷۸ء

سرکاری مورخ ڈاکٹر پارمو کو چند مشورے

(مورخ کی طرح نہیں پٹواری کی طرح تاریخ لکھیے ورنہ......)

ایک اطلاع کے مطابق ریاستی حکومت نے ریاست کی تحریک آزادی کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے چند افراد پر مشتمل جو کمیٹی قائم کی تھی اسے توڑ دیا گیا ہے اور اب تاریخ مرتب کرنے کا یہ کام، مشہور مورخ آر، کے، پارمو کے سپرد کر دیا گیا ہے کہ وہی تن تنہا اسے انجام دیں گے۔ سنا ہے کہ شیر کشمیر کے اس فیصلے سے جہاں مفتی جلال الدین صاحب، خواجہ صدر الدین مجاہد اور عبدالرشید تاثیر، بہت ناراض بلکہ بیزار ہیں وہاں آر، کے پارمو اپنی اس اِنتہائی عزت افزائی پر بہت خوش ہیں۔ تحریک حریت کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے یہ کمیٹی محترم شیخ صاحب نے دو سال قبل اس وقت نامزد کی تھی کہ جب پورا ملک ایمرجنسی کی گرفت میں تھا۔ اس وقت مسز گاندھی اور ان کے صاحبزادے سنجے گاندھی نے ہر سیاستدان کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا کہ تاریخ بنتی نہیں ہے بلکہ آئس کریم کی طرح بنائی جاتی ہے اور پھر عوام کو کھلائی جاتی ہے۔ ہر لیڈر اور حاکم یہ سمجھتا تھا کہ محکمہ اطلاعات کے شائع کردہ پریس نوٹ آکاشوانی کی خبریں، ٹیلی ویژن کی تصویریں اور

فلمز ڈویژن کی ڈاکومنٹریاں ہی تاریخ کا مواد اور اس کے مآخذ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قبلۂ محترم جناب شیخ صاحب نے بھی اسی غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار ہوکر سرکاری ملازموں اور ریٹائرڈ سرکاری ملازموں پر مشتمل ایک کمیٹی نامزد کر دی تھی تاکہ ان کی مرضی اور منشاء کے مطابق تحریک حریت کی ایک تاریخ مرتب ہو جائے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ تاریخ سرکاری احکامات کی تعمیل میں لکھی تو جاسکتی ہے لیکن ایسی تاریخ پڑھی نہیں جاتی۔ بلکہ محکمۂ اطلاعات کے پریس نوٹوں کی طرح ردی والوں کے ہاتھ بیچ دی جاتی ہے۔ خوش قسمتی سے ہمارے ہاں یہ مرحلہ آیا ہی نہیں اور دو سال تک کمیٹی کے ممبران یہی طے نہیں کر پائے کہ ان کی یومیہ اجرت کیا ہوگی اور انہیں سفر خرچ کے علاوہ اور کون سی سہولیات بہم ہوں گی۔ کمیٹی کے ایک ممبر نے مجھے بتایا کہ اکثر نشستوں میں مفتی جلال الدین اور صدر الدین مجاہد کے درمیان یہ موضوع بحث اور الجھن کا باعث بنا رہا کہ ان دونوں میں سے کس کی شہادت زیادہ معتبر قرار دی جاسکتی ہے، مفتی جلال الدین یہ دعویٰ کرتے تھے کہ میں زندہ تاریخ ہوں تحریک کے ابتدائی دور نہیں بلکہ پہلے دن سے تحریک اور اس کے قائد شیر کشمیر سے وابستہ رہا ہوں، مجاہد صاحب کا کہنا تھا، آپ بھلے ہی تحریک کے ابتدائی دور سے وابستہ رہے ہوں، لیکن آپ بعد میں ملازمت کے چکر میں پھنس گئے لیکن میری زندگی کا ایک ایک لمحہ شیر کشمیر کے سائے میں گذرا ہے۔ اس لئے میں زیادہ معتبر اور مستند درجہ رکھتا ہوں۔ عبدالرشید تاثیر کا موقف یہ تھا کہ تم دونوں زبانی مورخ ہو۔ لیکن میں نے تحریک حریت کی تاریخ نہ صرف قلم بند کی ہے، بلکہ اسے شایع

کر کے اس کا پہلا ایڈیشن بیچ بھی دیا ہے۔ اس بحثا بحثی میں ڈاکٹر
آر۔ کے پارمو کئی دنوں تک یہ کہنے کی کوشش کرتے رہے کہ تاریخ کے
میدان میں انہوں نے بھی کچھ کام کیا ہے۔ لیکن میری اطلاع یہ ہے کہ
کمیٹی توڑے جانے کے دن تک ان کی بات کسی نے نہ سنی۔ اسی لئے
وہ اس بات سے بہت خوش ہیں کہ اب انہیں دوسروں کو اپنی قابلیت،
مہارت اور اپنے تجربے کا قایل کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ لیکن میرا
خیال ہے کہ پارمو صاحب کی یہ خوشی عارضی ہے اور انہیں جلد ہی اس
تلخ حقیقت کا احساس اور اندازہ ہو جائے گا کہ انہیں تحریک کی تاریخ
لکھنے کے لئے نہیں، بلکہ تاریخ کی جمع تفریق کرنے کے لئے ملازم رکھا
گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں انہیں مورخ کی طرح تاریخ نہیں لکھنا ہے
بلکہ پٹواری کی طرح آبی کو خشکی اور خشکی کو آبی بنانے کا کام سونپا گیا ہے
اور یہ کام چونکہ آٹھ دس افراد پر مشتمل کمیٹی انجام نہیں دے سکتی تھی، اس
لیے اس کارخیر کو انجام دینے کے لیے ان کا انتخاب ہوا ہے، تاکہ وہ
ایک آزمودہ کار پٹواری کی طرح انتخاب اور گرداوری کا فرض انجام دے
سکیں ۔اب دیکھنا یہ ہے کہ تجربہ کار مورخ ڈاکٹر پارمو اپنی زندگی کے
غالباً آخری اور سب سے نازک امتحان میں کس حد تک پورا اترتے
ہیں۔ انہیں کچھ قیمتی مشورے دینے سے پہلے میں انہیں ایک لطیفہ سنانا
چاہتا ہوں۔

ایک بادشاہ پر شاعری کا خبط سوار تھا اور اس نے اپنی بے ہنگم،
بے معنی اور غلطیوں سے پر غزلوں کا دیوان مرتب کرنے سے پہلے اپنی
سلطنت کے ایک بہت بڑے شاعر کو طلب کر کے اس سے دریافت کیا

کہ وہ ان کے بارے میں اپنی رائے دے۔ شاعر نے جب دیوان کا بغور مطالعہ کر کے اس کی لاتعداد غلطیوں کی نشان دہی کی تو بادشاہ کو بڑا غصہ آیا اور اس نے حکم دیا کہ اسے جیل میں بند کر دیا جائے۔ بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں شاعر کو جیل بھیج دیا گیا۔ پانچ چھ ماہ کے بعد بادشاہ کو خیال آیا کہ شاعر کو رہا کر کے یہ دیکھیں کہ اب اس کا دماغ کس حالت میں ہے۔ جیل خانے سے اسے سیدھے بادشاہ کے دربار میں پیش کیا گیا۔ جہاں بادشاہ نے اسے اپنی تازہ غزلوں کی بیاض دکھائی۔ شاعر کچھ عرصے تک بڑے غور سے بیاض کی ورق گردانی کرتا رہا۔ پھر ایک لخت کھڑا ہو کر جانے لگا۔ بادشاہ نے حیران ہو کر پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ تو شاعر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ حضور واپس جیل جا رہا ہوں۔

اگر ڈاکٹر پارمو تحریک حریت کی تاریخ لکھ کر جیل نہیں جانا چاہتے تو انہیں ہمارے قیمتی مشوروں پر عمل کر کے اپنی عاقبت کا نہ سہی، اپنی عافیت کا سامان ضرور کرنا چاہیے۔

سب سے پہلے انہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ انہیں تحریک حریت کی تاریخ نہیں شیخ صاحب کی سوانح حیات لکھنا ہے اور تاریخ حیات بھی وہ کہ جو ڈاکٹر پارمو کی بجائے صدر الدین مجاہد کی لکھی ہوئی معلوم ہو۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ تحریک حریت کی تاریخ کے ماخذ تلاش کرنے کے لئے انہیں ریاست کے طول وعرض میں دربدر پھرنے کی بجائے مندرجہ ذیل افسران سے رابطہ قایم کرنا چاہیئے۔

لداخ کے صونم نربؤ رام بن کے ٹھاکر دیوی داس، دانگت کے میاں بشیر، جموں کے پرمانند، اس امر کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ تحریک

حریت کی اس تاریخ میں کہیں مولوی محمد عبداللہ وکیل، غلام احمد عشائی، مولانا محمد سعید مسعودی، غلام محی الدین قرہ، یا شام لال صراف جیسے لوگوں کا ذکر نہ آنے پائے اور اس معاملے میں ذراسی بے احتیاطی پارمو صاحب کی نوکری کے لیے ہی نہیں، ان کی زندگی کے لیے بھی خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔

تاریخ حریت کی تاریخ میں بخشی غلام محمد، غلام محمد صادق، سید میر قاسم اور درگا پرشاددور جیسے لوگوں کا ذکر تو ناگزیر ہے۔ اس لیے ان کا ذکر کرنا ہی پڑے گا، لیکن اس بات کا خیال رکھیئے کہ ان کی تعریف میں ایک فقرہ بھی آپ کے قلم سے نہ نکلے، ان سب کو غدار، دغا باز، محسن کش اور قوم فروش ثابت کرنے کے لئے پورا زور لگایئے اور اس بات کی ہرگز فکر نہ کیجیۓ کہ تاریخ کے اصول اور حقائق کے تقاضے کیا ہیں؟

شیخ صاحب کے خاندان کو نظر انداز کرنے کی حماقت نہ کیجیۓ اور ان کے خاندان کے ہر فرد کو غازی مجاہد اور رضا کار ثابت کرنے کے لیے حقائق میں جو بھی قطع و برید کرنا پڑے اس کی فکر نہ کیجیۓ۔ خاص طور پر خواجہ غلام محمد شاہ کے تاریخی رول کی سراہنا کیجیۓ۔ ورنہ وہ ہڈی پسلی توڑ کر آپ کی تاریخ ہی نہیں، جغرافیہ بھی بدل کر رکھ دیں گے۔ میرا مشورہ ہے کہ مجوزہ تاریخ میں شاہ صاحب کی زندگی اور ان کے کارناموں کے لیے ایک دو نہیں کئی باب مخصوص کیجیۓ اور ان میں اس مردِ مجاہد کی بے پناہ قربانیوں، اس کے ایثار اور اس کے کردار کی بلندی کو اس طرح اجاگر کیجیۓ کہ پڑھنے والوں کو فلسطینی مجاہد یا سر عرفات کی یاد آجائے۔ اس بات کو ذہن میں رکھیۓ کہ شاہ صاحب کی تعریف کے ساتھ ساتھ فاروق

عبداللہ کے کمالات اور اس کی فتوحات کا مفصل ذکر کرنا بھی ضروری ہے ورنہ آپ کی نوکری اور زندگی دونوں کو شدید خطرہ لاحق ہے۔ فاروق صاحب کے معاملے میں مشکل یہ ہے کہ تحریک کے ابتدائی دور میں وہ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ لیکن یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اپنی پیدائش کے صرف ایک ہفتے بعد انہوں نے کشمیر چھوڑ دو، یہ ملک ہمارا ہے اس کا فیصلہ ہم کریں گے اور ''چون وطن میون وطن'' کے نعرے بلند کرنا شروع کر دئے۔ یہ بات ذہن میں رکھیئے کہ شیخ صاحب تحریک حریت کا ماضی اور حال ہیں اور فاروق صاحب اس کا مستقبل، اپنی تحقیق اور جستجو کے چھومنتر سے یہ ثابت کر دیجئے کہ وہی اپنے محترم باپ کے سب سے موزوں جان نشین ثابت ہو سکتے ہیں۔

تحریک حریت کی اس تاریخ میں ۹/اگست ۱۹۵۳ء سے فروری ۱۹۷۵ء کے دوران کی گئی شیخ صاحب کی کسی تقریر، تحریر یا بیان کا حوالہ دینے کی حماقت نہ کیجئے، بلکہ تاریخ کے تسلسل کو کچھ اس طرح پیش کیجئے کہ بائیس سال کا یہ درمیانی عرصہ غائب ہی ہو جائے۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے اس امر کا بھی خیال رکھیے کہ شیر کشمیر کے قید و بند کی صعوبتوں، ان کے مجاہدانہ کردار اور ان کی مردانہ وار جدوجہد کا مفصل احوال بھی بیان ہو۔ ان دونوں تضادات کو آپ کس طرح ہم آہنگ کریں گے اسی پر آپ کی ساری محنت کا دارومدار اور آپ کی لیاقت کا انحصار ہوگا۔ اس بات کو لمحے بھر کے لیے اپنے ذہن سے نہ نکالیے کہ فروری ۷۵ کے بعد سے شیر کشمیر کا موقف رائے شماری نہیں، اٹوٹ انگ ہے۔ حق خودارادیت نہیں، حفظان صحت ہے۔ عزت و آبرو کا مقام نہیں دریائی

جلوسوں کا انتظام اور دعوت ہائے طعام کا اہتمام ہے۔تحریک حریت کے بانی اور باوا آدم کے موقف اور اس کی سوچ میں اس عظیم تبدیلی اور انقلاب کو زیر نظر رکھنا ہوگا۔ ورنہ پارمو صاحب کی تاریخ دانی کو باقرِ خوانی کی طرح چبا کر دریا برد کر دیا جائے گا۔تحریک حریت کی تاریخ میں ۱۹۷۵ء ماڈل کے جو جاں باز شریک ہوئے ہیں، انہیں کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے ان میں پیارے لال ہنڈو، محمد اکبر ذیلدار، صونم نربو، راجو اتری اور پرمانند جیسے غازیوں کا خاص طور پر ذکر کرنا ضروری ہے ۔یہ لوگ اگر چہ تحریک کے دشمن رہے ہیں، لیکن چونکہ بابائے قوم کی نظروں میں پسندیدہ ہیں، اس لئے پارمو صاحب کو ان کے ماضی کا ڈرائی کلین کر کے ان کے چہروں پر نیا رنگ وروغن چڑھانا چاہیے۔

تحریک کے ہراول دستے میں راج ساہنی اور دھرم ویر سنگھ او برائے ایڈمنسٹریٹر میونسپلٹی کی مبینہ خدمات کا احوال ضرور بیان کیجئے۔ اول الذکر حاکمانِ وقت کو مفت آٹا اور موخرالذکر مفت کھانے کا تیل سپلائی کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں اور اسی لیے دونوں پر شیر کشمیر کی نگاہ کرم کا گھنا گھنا سایہ قایم ہے۔

شیر کشمیر کے عہد حکومت کے سب سے نمایاں کارناموں میں شہر کے چوراہوں پر تعمیر ان دل نواز فواروں کی تصویر کشی کرنا نہ بھولیے کہ جن کے لیے میونسپلٹی کی گاڑیوں میں پانی بھر بھر کر لایا جاتا ہے، تاکہ وقت مقررہ پر اسے ہوا میں اچھال کر کشمیری عوام کا دل بہلایا جائے۔ اس حقیقت کی طرف ہرگز ہرگز اشارہ نہ کیجئے کہ کشمیری عوام کو ۲۲ برس کی جدوجہد اور مصیبتوں کے بعد یہی دو چار فوارے مل پائے ہیں اور

عام لوگوں نے اپنے دل کی تسلی کے لیے انہی فواروں کو ۵۳ء کی پوزیشن کا نام دیا ہے۔

اور ہاں تاریخ حریت کشمیر کے اس سرکاری تذکرے میں ریاستی اسمبلی کے ان انتخابات کا ذکر مفصل طور کیجئے، کہ جس میں عام لوگوں سے رائے شماری، بیماری اور پاکستان کے نام پر ووٹ لیے گئے اور وزارت کا حلف اٹھانے کے فوراً بعد گاندھی جی کے خوابوں کا ہندوستان بنانے کا عہد کیا گیا۔

آخر میں وزیر اعظم ہندوستان شری مرارجی ڈیسائی کے اس جلسہ عام میں شیر کشمیر کی اس تقریر دل پذیر کا احوال سنائیے، کہ جس میں انہوں نے بے قابو جذبات کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس شری مرارجی ڈیسائی کو موجودہ دور کے گاندھی کا نام دیا کہ جسے انہوں نے صرف ایک سال قبل جن سنگھی اور مہاتما گاندھی کا قاتل قرار دیا تھا۔ سرکاری تاریخ کے آخر میں یہ کتبہ ضرور درج کیجئے کہ ''تاریخ بڑی بے رحم ہوتی ہے اور یہ بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی نہیں بخشتی اسی لئے بادشاہوں کی موت کے ساتھ ہی دفن کر دی جاتی ہے''

۱۲/ اکتوبر ۱۹۷۸ء

خواجہ غلام محمد شاہ کا کورٹ مارشل

(ایڈووکیٹ کے قلم سے)

۱.... لوگ کہتے ہیں کہ اگر آپ شیخ صاحب کے داماد نہ ہوتے، تو آپ ریاستی کابینہ کے وزیر تو کیا کسی عدالت میں پبلک پراسیکیوٹر بھی نہ ہوتے، ان کا دعویٰ ہے کہ آپ کی ساری سیاست، زندگی اور موجودہ منصب کا منبع آپ کی یہ خوش بختی ہے کہ آپ کو بابائے قوم کی سب سے چہیتی، سلیقہ مند اور وفا شعار بیٹی کا شوہر ہونے کی سعادت حاصل ہے۔ آپ اس کی تائید یا تردید میں کیا کہنا چاہتے ہیں؟

۲.... آپ پر الزام ہے کہ آپ ایک باپ کے دل میں اپنی بیٹی کی محبت سے ناجائز فایدہ اٹھا کر اسے اپنے سیاسی مفادات کو تقویت پہنچانے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ آپ کے نکتہ چینوں کا کہنا ہے کہ آپ نے اپنی بیٹی کے لیے باپ کی اس کمزوری سے فایدہ اٹھا کر نہ صرف اپنے لئے ریاستی کابینہ میں جگہ حاصل کرلی، بلکہ اپنے لئے ایسے

محکمے بھی چن لئے کہ جن سے بے پناہ آمدن ہوتی ہے۔ آپ کے پاس اس الزام کا کیا جواب ہے؟

۳ .... عام لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نے اپنے کردار طرزِ عمل، طریق کار، گفتار اور کارہائے نمایاں سے اپنی رفیقہ حیات کے والدِ محترم کی شہرت، عزت عظمت اور مرتبے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ خود شیخ صاحب کے بہت قریبی حلقوں نے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ آپ پچھلے ۲۵ برسوں سے شیخ صاحب کے لئے ایک مستقل عذاب بنے ہوئے ہیں اور وہ صرف اس لئے یہ عذاب برداشت کئے ہوئے ہیں کہ آپ کی ذات سے ان کے جگر کا ایک ٹکڑا وابستہ ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

۴.... عام لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ۱۹۵۳ء میں شیخ صاحب کی گرفتاری کے بعد آپ کو گرفتار کرنا بخشی غلام محمد کی سب سے بڑی سیاسی غلطی تھی اور اگر آپ کو گرفتار نہ کیا جاتا تو آپ اس وقت ریاست کے وزیر اعلیٰ بننے کے خواب دیکھنے کی بجائے زیادہ سے زیادہ ڈائریکٹر لوکل باڈیز یا لینڈ کنسالیڈیشن ہوتے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ بخشی صاحب نے آپ کو گرفتار اور نظر بند کرنے کی حماقت کر کے آپ کو کم از کم شیر کشمیر کی نگاہوں میں مجاہد بنا دیا۔ ورنہ آپ کو نہ شیر کشمیر سے دلچسپی تھی اور نہ ان کے موقف سے؟ کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں؟

۵ .... کیا یہ صحیح ہے کہ شیخ صاحب کے ساتھ اپنی نظر بندی اور جلاوطنی کے دوران آپ نے ریاستی حکومت کو سینکڑوں درخواستیں دیں کہ آپ کے ماہانہ الاؤنس میں اضافہ کیا جائے؟ کیا یہ صحیح نہیں کہ آپ نے اس طویل مدت کے دوران کئی بار مرکزی حکومت کے رہنماؤں اور مرکزی

محکمۂ سراغرسانی کے افسروں سے رابطہ قایم کر کے شیخ صاحب کو رائشماری اور حق خودارادیت کے موقف سے منحرف کرنے کی کوششیں کیں؟

٦....کیا یہ حقیقت نہیں کہ آپ نے شیخ صاحب کی نظر بندی کے دوران نئی دہلی میں مس مردولا سارا بائی کے ہاں سالہا سال قیام کے باوجود اس پیکر ایثار خاتون کی نہ صرف کئی بار بے عزتی کی، بلکہ اسے ہندوستان کی ایجنٹ کہہ کر ساری دنیا میں بدنام کیا؟ کیا آپ اس بات کی تردید کریں گے کہ اس کے گھر میں کئی سال مفت کی روٹیاں توڑنے کے باوجود آپ نے اس مجسم خلوص اور پیکر مہر و وفا خاتون کو اتنی اذیتیں پہنچائیں کہ وہ شیخ صاحب سے بے پناہ عقیدت کے باوجود آپ کا نام سننے کی بھی روادار نہیں تھی؟

٧....آپ پر الزام ہے کہ آپ نے ١٩٧٤ء میں محاذ رائشماری سے استعفیٰ دے کر کانگریس میں شامل ہونے کی کئی بار ناکام کوشش کی، لیکن سید میر قاسم اور کانگریس کے دوسرے رہنماؤں نے آپ کی یہ کوشش اس لیے ناکام بنادی کہ وہ ایسا کر کے شیخ صاحب کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے؟ کیا آپ اس بات سے انکار کریں گے کہ محاذ سے مستعفی ہونے کے بعد آپ نے شیخ صاحب اور بیگ صاحب دونوں کے خلاف شدید الزامات عاید کیئے اور فروری ٧٥ء میں معاہدہ کشمیر پر دستخط ہونے تک شیخ صاحب سے آپ کی بول چال بھی بند تھی؟

٨....کیا یہ حقیقت نہیں کہ ٢٤/فروری ١٩٧٥ء تک آپ نجی محفلوں ، سماجی تقریبات اور عدالت سرینگر کے احاطے میں شیخ صاحب کو کھلم کھلا گالیاں دیا کرتے تھے اور اندرا شیخ معاہدے کو کشمیری عوام سے غداری

کی دستاویز قرار دے کر مرزا افضل بیگ کو ایسی بے نقط سنایا کرتے تھے کہ تہذیب اور شرافت اخلاق اور انسانیت اپنا منہ چھپائے پھرتے تھے؟

۹.... کیا آپ اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ ٹھیک اس وقت تک جب تک کہ گھریلو دباؤ اور آپ کے اصرار پر شیخ صاحب نے آپ کو اپنی کابینہ میں لینے کا فیصلہ نہیں کیا، آپ برابر شیخ صاحب کو بُرا بھلا کہتے رہے، بلکہ آپ اس وقت تک برابر ناراض رہے کہ جب تک آپ کو وزیر مملکت کی بجائے کابینہ وزیر نہ بنایا گیا۔ اپنی یاداشت پر زور دے کر یہ بتائیے کہ آپ نے کس تاریخ سے شیخ صاحب کو شیر کشمیر اور قاید اعظم کہنا شروع کیا؟

۱۰.... آپ پر الزام ہے کہ آپ نے شیخ صاحب کی وزارت میں شامل ہونے سے اب تک درجنوں ڈرائیوروں، لفٹ مینوں، ڈاکٹروں اور افسروں کو مارا پیٹا ہے یا گالیاں دی ہیں۔ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بتائیے کہ اگر آپ شیخ صاحب کے داماد نہ ہوتے تو خود شیخ صاحب آپ کے ساتھ کیا سلوک کرتے اور جن لوگوں پر آپ نے ہاتھ اٹھایا ہے وہ آپ کی کیا خاطر تواضع کرتے؟

۱۱.... خدا کی قسم کھا کر بتائیے کہ کیا آپ نیشنل کانفرنس بنائے جانے کے مخالف نہ تھے؟ اور کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ آپ ۱۹۷۵ء میں وزیر ہونے کے بعد آخری مرحلے تک کانگریس میں شامل ہونے کے لیے بے چین اور بے قرار تھے؟ قیامت کے دن کا تصور کر کے یہ بتائیے کہ کیا آپ نے محاذ رائے شماری کو ختم کیے جانے کے بعد نیشنل کانفرنس بنانے کی زبردست مخالفت نہیں کی؟

۱۲.... آپ پر یہ الزام ہے کہ آپ نے گذشتہ تین سال کے دوران ساٹھ ستر لاکھ روپے کمائے ہیں؟ چند ماہ قبل فروٹ ایسوسی ایشن کے عہدیداروں نے آپ پر ٹرانسپورٹروں سے اڑھائی لاکھ روپے کی رشوت لینے کا جو الزام عابد کیا تھا آپ نے ابھی تک اسکی تردید نہیں کی ہے کیا آپ کی خاموشی کو نیم رضا سمجھ کر اس الزام کی صحت کو تسلیم کیا جائے؟

۱۳.... لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ کو صرف آٹے کی مِلوں سے ہر ماہ ایک لاکھ روپے کی آمدن ہوتی ہے اور اس کے علاوہ شالی سٹور میں خالی بوریوں کی فروخت سے بھی آپ کی ماہانہ اور سالانہ آمدن میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ میں ان الزامات کی صحت یا عدمِ صحت کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے بڑی خوشی ہوگی کہ اگر آپ ان کی تردید کر کے اپنی عزت اور بابائے قوم کی شہرت کو مزید تباہ ہونے سے بچائیں؟

۱۴.... ۲۵ ر سال کی نظر بندی، جلاوطنی اور بے کاری کے ایام میں مولانا آزاد روڈ پر آپ کے شاندار بنگلے کے متعلق لوگوں میں عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ یہ پاکستان سے آنے والے اس پیسے سے بنا ہوا ہے کہ جو کشمیر میں استصواب رائے عامہ کی تحریک کو مضبوط بنانے کے لیے درآمد ہوتا تھا؟ کیا آپ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہیں گے۔

۱۵.... اپنی ذاتی قیام گاہ میں بچھے ہوئے بیش قیمت قالینوں اور بیش بہا فرنیچر کے لیے آپ نے پیسہ کہاں سے لایا اور لگے ہاتھوں یہ بتایئے کہ آپ نے پچھلے پندرہ بیس برسوں میں کتنا انکم ٹیکس ادا کیا ہے؟

۱۶.... کیا یہ صحیح ہے آپ اپنے ذاتی مکان میں رہنے کے لیے سرکار سے ماہوار ایک ہزار روپیہ کرایہ اور اس کے فرنیچر کے لیے سالانہ ۲۵ ہزار روپے وصول کر رہے ہیں؟ کیا آپ اس الزام کی تردید کر سکیں گے کہ ریاستی وزیروں کو اپنے ذاتی مکانوں میں رہنے کے لیے ماہوار کرایہ فراہم کرنے کا اصول اور طریقہ صرف آپ کو اور بابائے قوم کو فایدہ پہنچانے کے مقصد سے وضع کیا گیا ہے۔

۱۷.... آپ پر الزام ہے کہ آپ نے مرزا افضل بیگ کے خلاف سازش کر کے انہیں اس لئے حکومت اور تنظیم سے خارج کروایا، تاکہ آپ کو شیخ صاحب کے بعد ان کی جانشینی کا شرف حاصل ہو سکے کیا یہ حقیقت نہیں کہ بیگ صاحب سے فراغت پانے کے بعد اب آپ نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے خلاف مہم چلانا شروع کی ہے؟ کیا آپ اپنے حافظے پر زور دے کر یہ کہہ سکیں گے کہ آپ نے اپنے دوست احباب اور ساتھیوں سے فاروق عبداللہ کے متعلق کیا کچھ کہا ہے۔

۱۸.... آپ پر یہ الزام ہے کہ آپ نے اپنے عزایم اور منصوبوں کی تکمیل کے لیے نیشنل کانفرنس کو تباہ و برباد کرنے کے علاوہ شیخ محمد عبداللہ کی درویشانہ اور قلندرانہ شہرت کو مٹی میں ملا دیا ہے اور یہ آپ ہی کی کرامت ہے کہ شیخ صاحب آج صمد تیلیوں اور رشید بانہالیوں کے انتظار میں اپنی راتوں کی نیندیں حرام کئے ہوئے ہیں۔

۱۹.... آپ پر یہ الزام ہے کہ آپ جموں میں ایک نامعلوم اخبار کے گمنام اخبار نویس مقبول حسین کاظمی پر بلاوجہ اور ضرورت سے زیادہ مہربان ہیں، جموں کے ہارٹی کلچر کے اس معطل شدہ اسسٹنٹ کو نہ

صرف ایک عدد مکان دیا گیا ہے۔ بلکہ اس مکان پر تیس ہزار سے زاید روپیہ خرچ کیا گیا ہے کیا آپ مقبول حسین پر اس عنایت، اس توجہ کی وجہ بتائیں گے؟

اور اب آخری الزام: ۲۰ .... کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نماز اور روزہ اور ذکوٰۃ کے تمام بنیادی ارکان اسلام کی ادائیگی کے باوجود ایسی حرکتوں کا ارتکاب کرتے ہیں کہ جن کا اسلام سے تو کیا اخلاق، انسانیت اور شرافت کے کسی بھی ضابطے سے کوئی تعلق نہیں؟ کیا یہ صحیح نہیں کہ آپ جی، ایم ڈار نام کے ایک ننگ صحافت اخبار نویس کو اپنے سیاسی مخالفین کو ماں بہن کی گالی دینے کے لئے ہر ماہ ہزاروں روپیہ دیا کرتے ہیں؟ .... اور ہاں:

کیا یہ صحیح ہے کہ شیخ صاحب خدا کے بعد صرف آپ سے ڈرتے ہیں؟

یکم نومبر ۱۹۷۸ء

شکس لدانِ کشمیر کا خط

(شیر کشمیر اور فخر کشمیر کے نام)

رہنمایانِ کشمیر!

اجازت دیجئے کہ آج آپ دونوں کو ایک ساتھ مخاطب کر کے کچھ تلخ تکلیف دہ ناگوار اور ناپسندیدہ حقائق کا احساس دلانے کی کوشش کی جائے۔

پچھلے ایک ماہ سے آپ دونوں بزرگ ایک دوسرے کے خلاف دشنام طرازی، بہتان تراشی اور طعنہ بازی کی جو مہم چلا رہے ہیں اور جس کی شدت میں کمی ہونے کی بجائے روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اس سے ریاست کے سیاسی حالات یا مستقبل پر کیا اثر پڑے گا، اس کے متعلق اس مرحلے پر قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی الزام تراشیوں اور نمک پاشیوں سے آپ کا وقار اور اعتبار دونوں ہی بری طرح مجروح ہو رہے ہیں۔ سیاست کو ویسے ہی عام لوگ ایک "گندا کھیل" سمجھ کر سیاست دانوں کو بالعموم بری اور مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں، لیکن آپ دونوں بزرگوں کی چخ چخ

نے سیاست اور سیاستدانوں کے رہے سہے اعتبار کو بھی خاک میں ملا دیا ہے اور آج اس شہر کے گلی کوچوں میں ہی نہیں ملک کے کونے کونے میں لوگ سیاست دانوں کی بے ایمانی، ان کی بے اعتباری ان کی موقع پرستی، مفاد پرستی اور بے حیائی پر ماتم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپ صاحبان ۴۵ سال کی رفاقت، دوستی اور غم خواری کے بعد جس بے لگام طریقے پر ایک دوسرے کی پگڑی اُچھالنے میں مصروف ہیں، اسے دیکھ کر عام لوگوں کے ذہن میں آپ کے متعلق کیا تاثرات پیدا ہوتے ہوں گے اور خاص لوگ آپ کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ یہی بتانے کے لئے ہم نے آپ دونوں کو ایک ساتھ مخاطب کرنے کا فیصلہ کیا ہے:

بزرگانِ قوم :سیاست میں دو ساتھیوں، دو دوستوں، دو ہم خیالوں کے درمیان اختلافات کوئی نئی بات نہیں۔ ایسا ہزاروں سال سے ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا، کیونکہ اقتدار کے شراب کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ جب یہ ''چڑھتی'' ہے۔ تو پھر پینے والے کو اپنے پرائے کی تمیز نہیں رہتی اور اسے اپنے سایے سے بھی ڈر لگتا ہے آپ دونوں جب تک ایک ساتھ جدوجہد کرتے رہے، مصائب برداشت کرتے رہے، جیل خانوں کی سختیوں اور زندگی کی محرومیوں سے الجھتے رہے، آپ کی دوستی اور محبت کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا، لیکن جس دن سے آپ دونوں نے اقتدار کی ''خوشبو'' سونگھ لی۔ اسی دن سے آپ پر بدظنی، بے اعتمادی، تشکیک، غلط فہمیوں اور ایک دوسرے کی نسبت بدگمانیوں کا سایہ بھی لہرانے لگا اور جوں جوں اقتدار کا نشہ تیز ہوتا گیا یہ سایہ زیادہ گہرا ہوتا گیا اور پھر ایک دن آپ نے وہی کچھ کیا کہ

جو بدمست شرابی ضرورت سے زیادہ پی جانے کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ کرتے آئے ہیں۔ یعنی آپ نے ایک دوسرے کا سر پھوڑ دینے کا عمل شروع کیا۔ اقتدار کی ہوس اور سیاست کی کش مکش میں یہی ہوتا ہے۔ اس لئے ہمیں اس بات پر حیرت نہیں کہ آج آپ ۴۵ سال کی رفاقت کے بعد ایک دوسرے کو تباہ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ حیرت ہے تو اس بات پر کہ صرف چار ہفتوں کی مختصر سی مدت کے دوران آپ دونوں ایک ایسی سطح اور ایک ایسی منزل تک آ گئے ہیں کہ جہاں سے نیچے جانے کی اب کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی گراوٹ کے اس انعامی قابلے میں دونوں ہی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے سر توڑ کوششیں کر رہے ہیں۔ آپ یہ بات کیوں بھول رہے ہیں کہ جن سامعین اور ناظرین کے سامنے آپ ایک دوسرے پر کالک ملنے کی کوششوں میں مصروف ہیں، وہ پچھلے ۴۵ سال سے آپ کو ایک دوسرے کی مدح سرائی قصیدہ گوئی، ہمنوائی اور دل جوئی کا رول ادا کرتے ہوئے دیکھ چکے ہیں، کیا اس بات کا امکان نہیں کہ وہ آج آپ کو ایک دوسرے کی پگڑی اچھالتے دیکھ کر آپ کی شخصیات اور کردار کے بارے میں وہی رائے قائم کریں کہ جو وہ غلام قادر خان، غلام قادر چھان اور خواجہ محمد شعبان کے متعلق قایم کر چکے ہیں؟ ہم آپ کو یہ بتانے کی جسارت کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کے موجودہ طرز عمل نے انہیں آپ کے بارے میں اس سے بھی زیادہ ناپسندیدہ رائے قایم کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

دیدہ ورانِ ملت! یہ قوم ۴۵ سال سے آپ کو ایک جان و دو

قالب تصور کرتی رہی ہے اور کشمیر کی تاریخ کے ہر موڑ اور سیاست کے ہر مرحلے پر آپ دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ دیکھنے کی عادی ہو چکی ہے۔ ڈوگرہ راج کی سنگینیں ہوں یا بخشی راج کی سنگ باریاں، آپ دونوں ایک ساتھ مجروح ہوئے اور ایک دوسرے کی مرہم پٹی کرتے رہے، ۱۹۵۳ء کا اندھیرا ہو یا ۱۹۵۴ء کی ظلمتیں آپ کی دوستی، آپ کے اخلاص اور آپ کی رفاقت کا سورج کبھی غروب نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ کہ آپ کی قربت، وفاداری ور دوستی کا شہرہ اتنا عام ہوا کہ لوگ اس کی مثالیں دینے لگے اور آپ کی سیاست اور نظریات سے اختلاف رکھنے والے بھی آپ کی دوستی اور خلوص کے قایل ہو گئے۔ خود آپ کو بھی اس تعلق اور اس رشتے پر بڑا ناز تھا۔ اور آپ کو شاید اب یاد نہ ہو کہ آپ نے ایک دوسرے کی شان میں کیسی کیسی مبالغہ آرائیاں کی ہیں۔ ''من تراحاجی بگویم تو مراسید بگو'' کا یہ سلسلہ چند دنوں، مہینوں یا سالوں پر نہیں پورے ۴۵ سال کی وسعتوں پر چھایا ہوا ہے، لیکن پچھلے چار ہفتوں سے آپ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ اس سے صرف دو ہی نتیجے اخذ ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ یا تو پچھلے ۴۵ سال سے ایک دوسرے کے متعلق جھوٹ بول رہے ہیں یا آج پچھلے چار ہفتوں سے جھوٹ بول رہے ہیں، آپ یا تو پچھلے ۴۵ سال سے اداکاری کرتے آئے ہیں یا پچھلے چار ہفتوں سے ریاکاری کا مظاہرہ کرنے میں مصروف ہیں کیونکہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ۴۵ سال تک ایک دوسرے کی ایمانداری، ایثار اور عظمت کے گن گانے کے بعد دونوں ہی رہنماؤں کو یک لخت ایک دوسرے کی بے ایمانی، بددیانتی اور

گھٹیاپن نظر آنے لگے؟ ہندی فلموں کا گھٹیا سے گھٹیا ہیرو بھی ایک دو فلموں میں ہیرو کا رول ادا کرنے کے بعد ویلن یا جوکر کا رول ادا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، پھر آپ دونوں ہماری سیاست کے عظیم کلاکار ہونے کے باوجود موجودہ گھٹیا رول نبھانے پر کیوں مجبور ہو گئے؟

شیر کشمیر! اجازت دیجئے کہ آپ سے براہ راست مخاطب ہوکر یہ استفسار کریں کہ کیا آپ پچھلے ۲۵ برسوں میں ایک ہزار بار مرزا محمد افضل بیگ کو پنا جانشین نامزد نہیں کر چکے ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ آپ نے عوامی جلسوں اور اخباری بیانات میں مرزا افضل بیگ کو اپنا سب سے قابل اعتماد اور قابل فخر ساتھی قرار دیا ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ آپ نے مرزا بیگ کی مدح سرائی کرتے ہوئے کئی بار کشمیری عوام کو ان کی اس خوش بختی پر مبارک دی ہے کہ انہیں بیگ صاحب جیسا قابل وفادار اور باصلاحیت رہنما نصیب ہے؟ کیا یہ صحیح نہیں کہ اپنی سیاسی زندگی کے ہر موڑ پر آپ نے بیگ صاحب کی قربت اور رفاقت سے فایدہ اٹھا کر انہیں اپنے ہر دکھ درد میں اپنا شریک پایا ہے؟ کیا آپ اس بات سے انکار کر سکیں گے کہ آپ نے بیگ صاحب کی خاطر اپنے کئی بہترین دوستوں اور ساتھیوں کو بھی قربان کر دیا ہے اور ایک مرحلے پر آپنے اپنے سب سے چہیتے داماد خواجہ غلام محمد شاہ کو بھی بیگ صاحب کی خاطر اپنی بارگاہ سے خارج کر دیا تھا؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد انہیں نائب وزیر اعلیٰ کا منصب دینا ان کی قابلیت، صلاحیت اور وفاداری کے اعتراف کے علاوہ اس بات کا اشارہ بھی تھا کہ آپ کے بعد وہی آپ کے جانشین ہوں

گے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ قانون ساز کونسل کے حالیہ انتخابات میں ان
کے داماد محمد یعقوب کی غیر متوقع کامیابی تک وہ آپ کے سب سے معتمد
اور اہم اصلاح کار تھے اگر یہ سب باتیں صحیح ہیں تو پھر یہ بتایئے کہ
۲۲ ستمبر کے بعد سے آپ ان کے خلاف جو الزامات عاید کر رہے ہیں
ان کا اعتبار کون کرے گا؟ یہ بتایئے کہ محمد یعقوب بیگ کی غیر متوقع اور
ناپسندیدہ کامیابی سے بیگ صاحب میں وہ ساری برائیاں کیوں کر پیدا
ہو گئیں کہ جن کے تذکروں سے آپ کی تقریریں اور آپ کی نگرانی
میں شایع ہونے والے اخبارات بھرے پڑے ہیں؟ کیا صرف چار
ہفتوں کے اندر اندر مرزا محمد افضل بیگ کے ۴۵ سالہ ایثار اور وفاداری
کی حکایت حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی؟ یہ کہاں کی انسانیت ہے یہ کہاں
کی شرافت اور کیسی دوستی ہے کہ جو بدگمانی اور بدظنی کے ایک ہلکے سے
جھونکے سے ملیامیٹ ہو جائے۔ آپ نے مرزا بیگ کے خلاف اپنی کئی
حالیہ تقریروں اور اخباری بیانات میں یہ بات دہرائی ہے کہ ''میں نے
اسے کیا کچھ نہیں دیا؟۔ اسے اعتماد دیا، نائب وزیراعلیٰ بنایا اور اپنا
جانشین تک نامزد کیا''۔ لیکن آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ بیگ
صاحب نے بھی اس کے عوض کچھ کم نہیں دیا ہے۔ انہوں نے ۴۵ برس
تک ہر غلط اور صحیح بات کے لیے آپ کا ساتھ دیا ہے۔ آپ کے ہر غلط
فیصلے کی تائید اور تاویل کی ہے۔ اپنے ضمیر اور اپنی مرضی کے خلاف،
آپ کے ساتھ سالہا سال تک جیلوں میں نظربند رہے۔ آپ کے داماد
اور خاندان کے دوسرے افراد کے ہاتھوں ہر بے عزتی برداشت کی،
اور آپ کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے دوسروں پر تیر چلائے۔ خود بار

ہا زہر کے گھونٹ پیے.... غرض کیا کچھ نہ کیا۔

فخر کشمیر! پچھلے چار ہفتوں کے دوران آپ شیر کشمیر کے متعلق عوامی جلسوں اور اخباری بیانات میں ایسے ایسے حیرت انگیز انکشافات کر رہے ہیں کہ دنیا حیران اور شیخ صاحب کے عقیدت مند پریشان ہیں۔ ہمیں یوں تو اس بات کی خوشی ہے کہ آپ کے انکشافات اور بیانات سے ہمارے الزامات کی تائید اور تصدیق ہو رہی ہے۔ لیکن ہمیں یہ پوچھنے کی گستاخی کرنے کی اجازت دیجئے کہ شیخ صاحب کے بارے میں ان حیرت انگیز اور سنسنی خیز حقایق کا علم آپ کو کب اور کیوں کر ہوا؟ ٹھیک ۲۸ ستمبر تک شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نہ صرف آپ کے قاید اعظم تھے، بلکہ کشمیری عوام کی تقدیر، ان کے مستقبل اور ان کی عزت اور آبرو کی سب سے تابندہ علامت تھے۔ پھر پچھلے چار ہفتوں کے دوران وہ کونسا تغیر یا انقلاب بپا ہوا جس سے ان کی جمہوری حکومت یک لخت خاندانی راج میں بدل گئی؟ کیا یہ صحیح نہیں کہ آپ ۱۹۳۱ء سے برابر ۲۸ ستمبر ۱۹۷۸ء تک شیخ صاحب کو سب سے عظیم، ایماندار، باغیرت، خوددار اور ایماندار قاید تصور کرتے آئے ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو یہ بتائیے کہ ۲۸ ستمبر کے بعد وہ کونسا حادثہ پیش آیا، کہ جس نے ۴۵ سالہ بہادری، ایثار اور ایمان داری کو بزدلی، بے ہمتی اور بے ایمانی بدل دیا؟ آپ ۲۸ ستمبر کی صبح تک اس حکومت کا ایک اہم جزو تھے کہ جو آج آپ کی نگاہوں میں آمریت، فسطائیت اور خاندانی راج کی سب سے بڑی علامت ہے۔ آپ پر یہ حقیقت ۲۸ ستمبر کی شام ہی کو کیوں کھل گئی۔ اس صبح کو کیوں نہیں؟ آپ کہتے ہیں کہ شیخ صاحب نے ۱۹۶۵ء میں کشمیریوں کو

"شکس لد" قرار دے کر کشمیر آنے میں تامل کیا تھا؟ اس اہم راز کو آپ نے ۱۳سال تک کشمیری عوام پر کیوں ظاہر نہیں کیا اور کیا یہ صحیح ہے کہ اگر ۲۸ ستمبر کو آپ کو کابینہ سے مستعفی ہونے کا حکم نہ ملتا، تو یہ راز آپ کے جسم کے ساتھ ہمیشہ کے لیے دفن ہو جاتا؟ آپ شیر کشمیر پر غنڈہ گردی، چنگیز خانی اور ہٹلریت کا الزام عائد کرتے ہوئے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ۲۸ر ستمبر سے پہلے بہت سے لوگ اسی قسم کے الزامات عاید کرنے کی پاداش میں آپ کے ہاتھوں ذلیل اور رسوا ہو چکے ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ جب تک شیخ صاحب آپ کو اپنا جانشین نامزد کرتے رہے، آپ بڑی خاموشی اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی اس عزت افزائی کا خیر مقدم کرتے رہے، لیکن جب سے انہوں نے آپ کی جانشینی کے کاغذات مسترد کر کے آپ کو اپنی درگاہ سے خارج کر دیا ہے، آپ جانشین نامزد کرنے کے عمل کو آمریت اور جاگیرداری سے تعبیر کر رہے ہیں؟ کیا آپ اس بات سے انکار کر سکیں گے کہ ۲۸ ستمبر تک شیخ صاحب کا ہر سیاسی فیصلہ اور ان کی حکومت کا ہر فعل آپ کی رضامندی، صلاح کاری اور ہدایت کاری کا نتیجہ ہوا کرتا تھا؟ اگر نہیں تو آپ نے ۲۸ ستمبر سے پہلے حکومت سے مستعفی ہو کر اپنی ناراضگی اور بیزاری کا اظہار کیوں نہیں کیا؟ آپ کہتے ہیں کہ ۵۳ء کا واقعہ نہ سازش کا نتیجہ تھا اور نہ وشواس گھات کا، بلکہ نظریاتی اختلافات اور سیاسی تضادات کا؟ ہم "شکس لدان کشمیر" یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ نے سب کچھ جانتے ہوئے پھر ۲۵ برس تک اس مسئلے پر ہمیں گمراہ اور مشتعل کیوں کیا؟ مختصراً ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ اگر ۲۸ ستمبر کو شیخ محمد عبداللہ آپ

کو کابینہ سے استعفیٰ دینے پر مجبور نہ کرتے۔ تو کیا آپ اس کے باوجود ان حقائق سے پردہ اٹھانے کا تاریخی فرض انجام دیتے، کہ جو آپ پچھلے چار ہفتوں سے دے رہے ہیں؟۔

شیر کشمیر اور فخر کشمیر! ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ ہونے، اختلاف کرنے یا ایک دوسرے پر الزامات عاید کرنے کا حق نہیں۔ ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ آپ کو ایک دوسرے کے بارے میں دل چسپ فکرانگیز اور سنسنی خیز انکشافات کرنے کا حق نہیں۔ ہم صرف آپ کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایسا کرتے ہوئے اس بات کو ملحوظ خاطر رکھیئے کہ اب آپ کی قوم، آپ کے بیانات اور آپ کے دعاوی کو صحیفہ آسمانی سمجھ کر قبول نہیں کر سکتی۔ ۴۵ سال تک آپ نے اس قوم کو جو سبق پڑھایا، اسے پنتالیس دنوں میں بھلانا ممکن نہیں اس لیے آپ جو کچھ کر رہے ہیں اس سے آپ کا اعتبار آپ کا وقار، آپ کا سیاسی مرتبہ اور منصب، سبھی کچھ مجروح ہو رہا ہے اور لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان کے لیڈروں کا کوئی کردار نہیں ان کے قول کا کوئی اعتبار نہیں، ان کی ہر بات سے خود غرضی، ان کے ہر فیصلے سے تنگ نظری اور ان کے ہر دعویٰ سے ریاکاری ٹپکتی ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ آپ دونوں عمر کی اس منزل پر پہنچ کر اپنا اعتبار کھو رہے ہیں کہ جب آپ کے پاس اسے بحال کرنے کے لیے زیادہ وقت نہیں، کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ دونوں ایک دوسرے پر گندا اچھالنے کی بجائے زبان و بیان، اسلوب اور لب و لہجے کا ایک ایسا معیار قایم کریں کہ جو نوجوانوں کے لیے قابل تقلید اور بزرگوں کے لیے قابلِ قبول ہو، کیونکہ اس طرح ایک دوسرے

کو موردِ الزام گردانے سے دونوں کی شہرت، عزت اور عظمت کے مشکوک ہونے کا اندیشہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ دونوں کی نگاہوں میں کشمیری عوام شکس لد (ذلیل) ہیں او. آپ دونوں کو ان کی رائے، اِن کے ردِعمل اور ان کے نکتہ نظر سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن شکس لدان کے لیڈر ہونے کی حیثیت سے آپ پر یہ فرض ضرور عاید ہوتا ہے کہ آپ ان کے جذبات کو مجروح اور ان کی خواہشات کو ہمیشہ نظر انداز نہ کریں کبھی کبھی شکس لدوں کی دعائیں بھی قبول ہو جاتی ہیں...

فقط

ہم ہیں آپ کے خیر خواہ
شکس لدانِ کشمیر

۳۱/اکتوبر ۱۹۷۸ء

تھینک یو مسٹر بیگ

بخشی صاحب کا تازہ ترین مکتوب

محترم بیگ صاحب!

اس بات کی اطلاع تو آپ کو مل چکی ہو گی کہ ۲۲/ستمبر سے ہم یہاں "جشنِ کشمیر" منا رہے ہیں اور گزشتہ ایک ماہ کے دوران ، اس سلسلے میں کئی ایسی تقریبات بھی منعقد ہوئیں ، کہ بقول یزداں جنت کی لاکھوں برس کی تاریخ میں ایسے دلچسپ اور تاریخ ساز لمحات دیکھنے میں نہیں آئے ہیں ۔ ۲۲/اکتوبر کو ہم ایک ماہ کے جشن کے بعد اختتامی تقریب منانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ جنت کے ٹیلی پرنٹر پر جموں میں آپ کی تقریروں اور پریس کانفرنسوں کی رپورٹیں موصول ہونے لگیں ۔ رپورٹیں کیا تھیں، شربت روح افزا، کوکا کولا ، لمکا اور آئس کریم کے کنستر تھے کہ جو زمین کی کشش کے دائرے کو توڑ کر جنت کی فضاؤں کو سیراب کر رہے تھے ۔ میں صادق اور ڈی پی ، ایک ایک لفظ پڑھ کر ایک دوسرے کی بلائیں لے رہے تھے اور ہماری مسرت کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ جموں کے جلسہ عام میں آپ کی تقریر اور پریس کانفرنس میں آپ کے بیان کا احوال سن کر صادق صاحب نے پہلی مرتبہ نماز پڑھ کر دارو محشر کا شکرانہ ادا کیا اور ڈی پی نے پہلی بار گیتا

کے کچھ اشلوک پڑھ کر اپنے ماتھے پر تلک لگایا۔

اسی دن یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ جشن کشمیر کی تقریبات غیر معین عرصے کے لیے جاری رکھی جائیں گی اور ایک دن ۱۹۵۳ء کے واقعات پر ایک خصوصی سیمنار منعقد کر کے رب العالمین، کو بہ نفسِ نفیس اس میں شرکت کی دعوت دی جائے، تاکہ آپ کے اعترافِ گناہ اور معتبر شہادت کی روشنی میں ۹/اگست ۱۹۵۳ء کے واقعات کے متعلق دارو محشر کا فیصلہ بھی معلوم ہو جائے۔

ہمدم دیرینہ!

۲۲/ستمبر کے بعد سے ہم لوگ بڑی دلچسپی اور توجہ کے ساتھ شیر کشمیر اور آپ کی بیان بازیوں، الزام تراشیوں اور طعن و تشنیع کا مطالعہ کر رہے ہیں، اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ ہم اس سے بخوبی لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ سیاسی مضمرات سے قطع نظر خالص تفریحی اعتبار سے یہ ڈرامہ اتنا دل چسپ اور سبق آموز ہے کہ مرکزی حکومت کے فلمز ڈویژن کو اس کا فلم بنا کر اس پر باقاعدہ تفریحی ٹیکس عائد کرنا چاہئے۔ جب تک آپ شیخ صاحب پر بے مروتی، بے وفائی اور خاندانی راج کے الزامات عائد کرتے رہے اور وہ آپ پر سازش، بد دیانتی، بدنظمی اور وشواس گھات کے اتہامات لگاتے رہے، ہماری دلچسپی اس ناٹک کے تفریحی پہلو تک ہی محدود رہی۔ لیکن جموں میں اپنی تقریروں اور اپنے اخباری بیانات میں جب آپ نے ٹھیک ۲۵/ برس بعد ۱۹۵۳ء کے واقعات کے متعلق یہ فیصلہ صادر کیا کہ یہ کسی سازش کا نہیں، بلکہ واضح سیاسی اختلافات کا منطقی نتیجہ تھے، تو ہمارے لیے یہ اُس آسمانی حقیقت اور

زمینی صداقت کا اعتراف اور اعلان تھا کہ خدا کے ہاں دیر ضرور ہے، لیکن اندھیر نہیں ۔ ۲۵ / برس تک ہمارے خلاف۔ سازش ، شب خون ، وشواس گھات ، غداری ، قوم فروشی اور مسلم دشمنی کے الزامات عائد کرنے والے اپنی زبان ، اپنے عمل اور اپنے کردار سے اس کی تردید کرنے پر مجبور ہو جائیں ، یہ خدا کی خدائی کا کرشمہ نہیں ہے تو اور کیا ۔ ہمارے نام پر لعنت بھیجنے والے ، ہماری راہوں میں کانٹے بچھانیوالے ، ہمیں ساری دنیا میں بدنام اور رسوا کرنے والے اور ہمارے جنازوں پر پتھر پھینکنے والے آج ایک دوسرے کی پگڑی اچھالنے کی کوشش میں ہماری بے گناہی اور صداقت پرستی کا کھلے بندوں اعتراف کریں ، تو کیا یہ ہمارے لیے باعث فخر اور موجبِ مسرت نہیں ؟ ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ہم آپ کا شکریہ ادا کریں ، کہ آپ نے ۲۵ / برس کی تاخیر کے بعد اپنی زبان سے حرفِ حق ادا کر کے ہمیں کشمیری عوام کی نگاہوں میں سرخرو کر دیا یا شیر کشمیر کو مبارک باد دیں کہ جس نے آپ کو وزارت سے محروم اور تنظیم سے خارج کر کے یہ حق بات کہنے پر مجبور کر دیا ؟ ہماری دانست میں آپ دونوں تاریخ کے ہاتھوں میں دو کھلونے ہیں کہ جنہیں بہر حال وہی رول ادا کرنا ہے کہ جو خالقِ دو جہاں نے ان کے لیے معین کر دیا ہے ،اور اس لیے ہم بار بار اس کے سامنے سربسجود ہو کر اس کا شکرانہ ادا کرتے ہیں ۔

بیگ صاحب !

تاریخ کے طویل سفر میں ۲۵ / سال کا عرصہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوتا ۔ لیکن لمحے بھر کے لیے سوچیے کہ ہماری بدنصیب قوم اور بد بخت ریاست پر ان ۲۵ / برسوں کے دوران کیا کچھ نہیں بیتی ۔ ہماری بات

رہنے دیجئے کہ ہم نے اپنے سیاسی موقف کے تحفظ اور تکمیل کی خاطر اگر مصیبتیں اٹھائیں تو ہمیں ان کا معقول صلہ بھی ملا۔ لیکن اُن نوجوانوں، غریبوں، مفلسوں اور بے زبانوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کہ جو ۲۵/ برس تک آپ کی بات کا یقین کر کے رائے شماری، حق خودداریت اور عارضی الحاق کے چکر میں اپنا صبر و قرار ہی نہیں، ذہنی توازن بھی کھو بیٹھے؟ ۲۵/ برس تک آپ نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو غدار قرار دے کر قوم کو یہ سبق دیا کہ ۶/ اگست کی خونی سازش کشمیر کی آزادی، اندرونی خود مختاری اور عزت و آبرو کو نیلام کرنے کے خوفناک منصوبے کا حصہ تھا۔ سادہ لوح اور بھولے بھالے عوام کو یہ وشواش دلایا کہ اس دن میں نے اپنے محسن اور رہنما کے ساتھ دغا کر کے محض اقتدار کی خاطر اسے تخت سے اٹھا کر جیل میں ڈال دیا۔

اقوام متحدہ کے ایوانوں سے لے کر وادی کشمیر کے گاؤ خانوں تک آپ میرے خلاف ۲۵/ برس تک مسلسل یہی پروپگنڈا کرتے رہے کہ اگست ۵۳/ کا انقلاب محض میری ہوسِ اقتدار اور میرے ساتھیوں کے بے لگام سیاسی عزائم کا نتیجہ تھا۔ ۲۵/ برس تک آپ اس دن کو ''یوم سیاہ'' کے طور پر منا کر ساری دنیا کو یہ باور دلانے کی کوشش کرتے رہے کہ اس دن جمہوریت کا قتل کیا گیا، اور مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ آپ اس جھوٹے پروپگنڈا، کردار کشی اور بے بنیاد سیاسی بہتان کے سب سے بڑے وکیل اور علمبردار تھے۔ لیکن آج ۲۵/ برس بعد جب آپ نے اپنی ذاتی مجبوریوں اور سیاسی محرومیوں سے مجبور ہو کر اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ ۱۹۵۳ء کی لڑائی ایک نظریاتی جنگ اور سیاسی کشمکش تھی، تو کیا آپ نے اس

بات پر غور کیا کہ آپ کے ۲۵/ سال تک اس مسئلے پر ایک غلط موقف اختیار کرنے سے صرف اس ریاست کو ہی نہیں ، برصغیر ہند و پاک کے کروڑوں لوگوں کو کتنے پیچیدہ مسائل اور الجھنوں کا سامنا کرنا پڑا ؟ ۔

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے کشمیر کے ہندوستان سے مستحکم الحاق کا معمار قرار دے کر میری عزت افزائی کی ہے ، لیکن کیا میں یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ اس معمولی سی حقیقت کا اعتراف کرنے میں آپ نے ۲۵/ سال کی تاخیر کیوں کی؟

ہم سب لوگ آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے بالآخر یہ بات تسلیم کرلی کہ اگست ۱۹۵۳ ء میں ہم نے شیخ صاحب یا آپ کی پیٹھ میں چھرا نہیں گھونپا بلکہ ہم اپنے سیاسی موقف پر سختی سے قائم رہے ۔ لیکن ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ یہ حقیقت آپ پر ۲۸/ ستمبر کو وزارت سے مستعفی ہونے کے بعد ہی کیوں واضح ہوگئی؟ ۔ جو بات غلام قادر خان ، قادر چھان ، اور محمد شعبان جیسے بے علم اور بے مایہ لوگوں کی سمجھ میں آج سے ۲۵/ سال پہلے آ گئی تھی ، اسے سمجھنے اور اس کا اعتراف کرنے میں آپ جیسے زیرکوں اور قانون دانوں کو ۲۵/ برس کا عرصہ کیوں لگ گیا؟ ۔ جموں کے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے یہ دعویٰ کیا کہ جب تک آپ زندہ ہیں کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کو کوئی خطرہ نہیں ۔ اپنے حافظہ پر زور دے کر یاد کیجئے کہ کیا ۱۹۵۳ ء سے ۱۹۷۱ء تک میرے ان ہی بیانات اور دعوؤں کی بناء پر مجھے قوم فروشی اور غداری کے طعنے نہیں دئے جاتے تھے ۔

❀❀❀

فقط آپکا ، چراغ بیگ